شام امن سے جنگ تک

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز

فہرست

چند باتیں آپ سے

باب نمبر1: روانگی برائے دمشق

باب نمبر2: زینبیہ۔

باب نمبر3: پاکستانی سکول اورالمرجع یاشہدا چوک

باب نمبر4: دمشق سیٹیڈل اورزکریامحمد کبرت کا گھر

باب نمبر5: دمشق کا چہرا امن اور جنگ میں

باب نمبر6: اے عندلیب آ کہ مل کرکریں آہ وزاری

باب نمبر7: ثمریز بک

باب نمبر8: اعظم پیلس میں حلب کی ڈاکٹر ہدا سے ملنا

باب نمبر9: مدرسہ جلمکیہ اورال ظہریہ لائبریری

باب نمبر10: دمشق کا چاند چہرہ گہنایا ہوا

باب نمبر11: باب صغیر اور مقبرہ صلاح الدین

باب نمبر12: خاک وخون میں لتھڑی کہانیاں

باب نمبر13: حلب

باب نمبر14: حلب کی سماجی اور ثقافتی زندگی

باب نمبر15: 30 فری سیرئین آرمی کے الفاروق کی دکھ بھری داستان

باب نمبر16: مشرقی حلب کے کھنڈرات سے جنم لینے والی کہانیاں

باب نمبر17: آواز دو کہ حلب جل رہا ہے

باب نمبر18: حلب کے کھنڈرات میں پھول اگانے والا

باب نمبر19: حلب سے روانگی۔ مرۃ النعمان میں چند گھنٹے

باب نمبر20: ابوالعلیٰ المعری کی قربت میں

باب نمبر21: حما اور حمص

باب نمبر22: جنگ کی تصویریں

باب نمبر23: حمص کا ابوحارث کیا سُناتا ہے

باب نمبر24: مروہ ال ثوبانی

باب نمبر25: ال نوری بیمارستان اور مکتب انبار

باب نمبر26: ابوصلاح

باب نمبر27: مونا عمیدی

باب نمبر28: سارہ طلال

باب نمبر29: درعا

باب نمبر30: بُصریٰ

باب نمبر31: شام کی خانہ جنگی شاعری کے آئینے میں

باب نمبر32: دمشق نیشنل میوزیم

باب نمبر33: ال نفورا کیفے

باب نمبر34: ام ناجی

باب نمبر35: ال صلاحیہ،جبل قاسیون اور یادگار

باب نمبر36: تکیہ سلیمانیہ

باب نمبر37: المناک کہانیاں

باب نمبر38: میرم ال مرسی

باب نمبر39: نزّ ارقبانی

انتساب

مارک ٹوئن Twain نے دمشق کو ابدیت کا شہر کہا۔ اِس کے جادوئی حُسن کا سحر اُس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ بے اختیار وہ بول اٹھا۔

''دمشق کو کبھی ماہ و سال کے پیمانوں سے مت ماپنا۔ اِس کی صورت گری صرف سلطنتوں کے عروج و زوال کے آئینوں میں ہی ممکن ہے۔''

اِس کے شاعروں، اِس کے ادیبوں، اِس کے فنکاروں اور دنیا کے لوگوں نے اگر شام کو آنکھ تو دمشق کو اس کی پُتلی کہا ہے۔

اے شام میں نے بھی تمہیں ایسے ہی پایا تھا
مگر
آہ شام کے شہرو
آہ دمشق و حلب
تم کیسے ہو؟

چند باتیں آپ سے

کرتی کیا؟ زمانہ 2008ء کا تھا۔ دل عراق جانے کے لئے مچل مچل پڑ رہا تھا۔ گو جنگ تو اب وہاں نہیں تھی مگر وہ کمبخت سامی ٹامی تو چپے چپے پر بیٹھے تھے۔ اور بم تو کبھی کسی قاعدے کلیے میں رہے ہی نہیں۔ کسی بھی وقت کہیں بھی جہاں اور جب اُن کے من چلے آقاؤں کے دل پھلجڑیوں کے انار چھوٹنے، معصوموں کی آہ و بکا جیسی موسیقی سے محظوظ ہونے، سرخ گاڑھے پانی کی ندیاں بہنے، بے وقعت اور کمین لوگوں کے وجود کے ٹکڑوں کو فضاؤں میں رقص کرتے جیسے منظر دیکھنے کو مچلیں۔ تب وہ اِس تماشے کا اہتمام کر ڈالتے ہیں۔

تو اب ساتھ جانے کے لئے کون سی سکھی سہیلی ہاں کرے؟ جس جس سے بات کی اُس نے تھرّا کر کہا۔

''اے کیا باؤلی ہوگئی ہو؟ دیکھتے بھالتے تو مکھی نگلی نہیں جاتی اور نہ ہی موت کو گلے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مہم جوئی تو بھئی تمہیں ہی مبارک۔''

اب زیارتی کاروان کا ساتھ ہی غنیمت لگا جو عراق تو جا رہا تھا مگر شام اور ایران بھی ساتھ شامل تھے۔ گویا ایک ٹکٹ میں دو نہیں تین تین مزے۔ تب شام پرامن تھا۔ خوبصورت تھا۔ اِس کے شہر اپنے حُسن اور رعنائیوں کے ساتھ کہیں نو بر نو تندرست و سلامت اور کہیں کھنڈرات بنے اپنی تاریخی سوغاتوں کو سینے سے لگائے رچّے بچّے بیٹھے تھے۔

پندرہ دنوں میں شام کو جی بھر کر دیکھا اور لطف اُٹھایا۔

واپس آ کر پہلے تو عراق والے دھندے میں اُلجھی کہ عراق کا بکھیڑا ایسا تھا کہ اُس نے

سر تا پا اُلجھائے رکھا۔ روز لکھواتا بھی اور رُلاتا بھی ۔ اِس رونے دھونے سے نپٹی تو امریکی حملے کے دوران ایک معزز عراقی خاندان کی لڑکی کی دردانگیز کہانی نے ستانا شروع کر دیا۔ مہینوں اُس کے دکھ میں مبتلا رہی۔ اُسے ٹھکانے لگا کر ''بلاد الشام'' کی طرف رُخ کیا۔

کام اختتامی مرحلے میں تھا کہ وہ آگ جس کی اُن پر امن دنوں میں ایک دو نے پیشین گوئی کی تھی بھڑک اُٹھی۔

ہائے اب یہ کب جانتی تھی کہ میری آنکھوں اور میرے دردِ جگر کا پھر کڑا امتحان ہوگا۔ جب جب بھی شامی وجود کے حُسن و جمال کو سمیٹنے کی کوشش کروں گی تو یہ پور پور خون میں نہا رہا ہوگا۔ اور وہ جگہیں جنہیں دیکھتے ہوئے آنکھیں سیراب نہیں ہوتی تھیں۔ قدم پلٹتے تھے کہ آخری بار بھی رخ پھیروں گی تو کچھ نیا ضرور ہاتھ پلّے لگے گا۔ اب اُن کے زخمی زخمی ہونے کی خبریں سنوں گی۔

سب کچھ اوندھا ہو گیا۔ جو گاہے بگاہے لکھا گیا تھا اُسے ترتیب دیتے ہوئے اُبال اُٹھتے تھے کہ پتہ نہیں یہ حُسن ، یہ تعمیری نمونے جن کے میں نے گڈے باندھے ہیں اب کہیں ہیں یا بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ گو میرے ای میل رابطوں نے مجھے صورت حال کی وضاحت کرنے اور سمجھنے میں کافی مدد کی۔ تاہم اُن پر قلم اُٹھانا کتنا بھاری ہو گیا۔ ایک تذبذب، ایک الجھاؤ بھی ساتھ کہ قارئین کو تصویر کونسی دکھاؤں؟ وہ جو عظمتوں کی امین تھی یا یہ جواب سامنے آ رہی ہے۔

بہرحال جذبات کی دل گرفتگی نے بہت تنگ کیا۔ اگر شام لہولہان ہے تو خود میری کیفیات بھی ایسی ہی ہیں۔ تاہم شام کا یہ خون آلودہ چہرہ بھی آپ کے سامنے پیش ہے۔

دعاؤں کے ساتھ

سلمٰی اعوان

279/A نیو مسلم ٹاؤن لاہور

salma.awan@hotmail.com

0301-4038180

☆☆☆

باب نمبرا:

روانگی برائے دمشق

- بحرین خلیج فارس کے دہانے سے کسی جادوئی اسرار کی مانند پھوٹا تھا۔
- بیسوی صدی کی بڑی مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں نے شام جیسے خوبصورت ملک کے حصّے بخرے کرتے ہوئے کئی نئے ملک بنا دیئے۔
- زمانوں سے بعث پارٹی ہی پردان بنی یک جماعتی نظام کی صورت لوگوں کی سوچوں کو جمہوریت کی بجائے آمریت کے شکنجوں میں جکڑے نظر آتی ہے۔
- اکیسویں صدی کے شاطر کھلاڑی نئے منصوبوں سے شام کو برباد کرنے کے لئے ایک بار پھر میدان میں اُتر آئے۔

کوئی ایک بار تھوڑی اکثر و بیشتر ایک سوچ سوال کرتی ہے۔ بہت بار یہ خیال سوالیہ صورت میں مُجھ سے باتیں کرتا ہے کہ آخر میرے اندر سکون کیوں نہیں ہے؟ کیا میں کسی مضطرب لمحے کی پیداوار ہوں۔ آخر بے چینی اور اضطراب ہمہ وقت کسی بیبیہ بٹورنے والی محبوبہ کی طرح کیوں مجھے گھیرے رکھتا ہے۔

جب چھوٹی تھی تب بھی اندر جیسے پارہ بھرا رہتا تھا۔ بس تاڑ میں رہتی تھی کہ کب گھر کے لوگ کاموں میں مصروف ہوں اور میں آنکھ بچا کر باہر نکلوں۔ لُور لُور پھرتی۔ اردگرد کے محلوں، ان کے لوگوں، وہاں کے بچوں بارے میری معلومات بڑی ثقہ بند قسم کی ہوتیں۔ چوتھی پانچویں میں پڑھنے

والے لڑکے لڑکیوں میں کون دلیپ کمار ہے؟ کون نرگس بنی ہوئی ہے۔ کون سی کامنی کوشل ہے؟ مجھے سب کا علم ہوتا۔

میری دادی بڑی عاجز رہتی تھیں۔ میرے اِن لچھنوں پر بڑے لتّے لیا کرتی تھیں۔ سُتّی رہ جاویں (یعنی سوتے میں ہی پار ہو جاؤ) جیسی دعا یا بددعا دینا بھی معمول کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بددعا مجھے گھی شکر بن کر لگتی کہ میں ہر صبح چاق و چوبند اُٹھتی۔

جب ذرا بڑی ہوئی تب اس میں اور شدت آ گئی۔ اور جب اسفار کا سلسلہ شروع ہوا ہمیشہ جی چاہتا تھا کہ کہیں نہ کہیں بھاگی پھروں۔ ججّل ہوتی رہوں۔ ایک سفر سے نپٹتی تو دوسرے کے لئے تڑپنے لگتی۔ ہر دم اُچھل پیڑے جونکوں کی طرح چمٹے رہتے۔

روس سے واپس آئی۔ اس پر لکھنے سے نپٹی۔ اب خود سے پوچھتی ہوں۔ کہاں چلنا ہے؟ کہیں بھی سوائے ٹامیوں اور سامیوں کے دیس کے۔ باقی سب جگہیں قبول ہیں۔ پر مصیبت ساتھی کی۔ ہمیشہ ساتھ چلنے والی نے مہم جوئی دکھا دی تھی۔ نازُک سی نئی نویلی گاڑی کا دیو جیسے ٹرک سے پیچا لڑا دیا۔ اُس نے وہ پٹخنیاں دیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ چلو جان تو بچ گئی مگر جس انداز میں رگیدی گئی اس نے منجی پر مہینوں کے لئے ڈال دیا تھا۔

''اب میں کیا کروں؟ کِس کھوں کھاتے میں گروں؟ کہاں جاؤں؟''

ایسے میں اخبار کا ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ شام اور عراق کے لئے زیارتی کارواں ۱۵ جولائی کو روانگی۔ ادائیگی ایک لاکھ پچیس ہزار۔

یہ زیارات کا پیکج تھا۔ شام و عراق کی مقدس جگہیں محترم تو سبھی مسلمانوں کیلئے ہیں۔ یوں شیعہ مسلک کیلئے ذرا خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

بہت سی سوچوں نے گھیرا ڈال دیا۔ ترجیحات کا فرق غور طلب تھا۔

مذہبی معاملات میں بُہت لبرل ہوں۔ خدا کو ربُ المسلمین نہیں رب العالمین جانتی ہوں۔ انسانیت پر ایمان رکھتی ہوں اور تہہ دل سے اِس پر یقین ہے کہ مذاہب کی یہ رنگا رنگی اوپر والے کی

اپنی تسکین طبع کیلئے ہے اور یہ تنوع اُسے حد درجہ محبوب ہے۔

اس لئے آپ اور میں کون ہیں اپنے عقیدے اور مسلک پر غرور کرنے والے؟

ایر پورٹ پر تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔شکراً کہا کہ میاں ساتھ نہیں آئے تھے۔ایسی بدنظمی دیکھتے تو وہیں لعن وطعن کے تبّروں سے تواضع شروع کر دیتے۔

پہلا پڑاؤ بحرین ہوا۔خوبصورت شہر پرشیئن گلف کے دہانے سے کسی جادوئی اسرار کی مانند پھوٹتا ہوا نظر آیا۔ایر پورٹ کیا تھا۔ایک پورا شہر۔دنیا جہان کی نسلوں اور قوموں سے بھرا پڑا۔خلقت کا ایک اژدہام۔

فلپائن کی پھینی پھدکڑ ڈھڈورنگی (چپٹی ناک اور مینڈک جیسے رنگ والی) لڑکیوں کے ٹولوں نے آدھا ہال سنبھالا ہوا تھا۔باقی کا آبنوسی بنگلہ دیشی لڑکیوں اور عورتوں کے قبضے میں تھا۔شلوار قمیض اور قمیض پاجاموں کے علاوہ ساڑھی تو قسم کھانے کو ایک کے بھی تن پر نہ تھی۔

1969 ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنا زمانہ طالب علمی یاد آیا تھا۔ایک ماہ میں ہی اُٹھتے بیٹھتے میرے کلاس فیلوز نے ''تماں کے خوتی ناہیں (تم بچی نہیں ہو) بنگال آئی ہو تمہیں ساڑھی پہننی اور بنگالی بولنی چاہیئے'' جیسے طعنوں سے چھلنی کرنا شروع کر دیا تھا۔لباس اور زبان کیلئے اُن کی بے تکی محبت، کریز اور تعصّب خوفناک حدوں کو چھوتا تھا۔میں نے بھی فی الفور یہ دونوں کام کرنے میں ہی اپنی سلامتی اور عافیت جانی تھی۔

وقت کتنا بدل گیا تھا۔بنگلہ دیشی عورت ملکی معیشت مظبوط کرنے میں کس درجہ سرگرم ہے۔

متحدہ عرب امارات کی چھ امیر ریاستوں اور مشرق وسطٰی کے کھاتے پیتے ملکوں میں یہ غریب عورتیں اور لڑکیاں ایجنٹوں کی وساطت سے محنت مزدوریاں کرنے جارہی تھیں۔تیسری دنیا کے غریب لوگوں کا مقدّر۔یہاں کوئی تین گھنٹے کا پڑاؤ ہوا۔گیٹ نمبر 31 سے دمشق کیلئے ہمیں داخل ہونا پڑا۔

اِس بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جہاں دنیا جہاں کے مسافروں کو اُن کی پروازوں کیلئے پروقار

انداز میں عربی ،انگریزی اور ہندی میں بلایا جارہا تھا۔ میں خود سے کہے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ یوں تو اِن عرب امارات کے ہم سے محبت کے دعوے بڑے بڑے ہیں۔مگر ہماری زبان اُردو کیا اِس قابل نہیں کہ اُسے بھی یہاں پذیرائی ملتی۔

یہیں میں نے اُس مدھو بالا کو دیکھا تھا۔ثروت شجاعت شیخوپورہ کالج کی پروفیسر۔ہنستے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔''کوئی قرابت داری اُس خاندان سے۔''

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔زندہ دل خاتون تھی۔

جہاز میں دہکتے لبوں، چمکتے رخساروں، نین کٹارا سی آنکھوں اور چھ فٹی مٹیار جٹیوں جیسی جتنی عورتیں بھی نظر آئیں کم وبیش سب شامی تھیں۔میرے بائیں ہاتھ ساتھ بیٹھنے والی بھی ایسے ہی قد کاٹھ اور رنگت والی تھی۔ہاں البتہ دائیں ہاتھ بیٹھی خاتون خاصی عمر رسیدہ تھی۔افسوس تو یہ تھا کہ جتنی بوڑھی تھی اُتنی ہی تنک مزاج بھی تھی۔کہیں ہمسائیگی کے ناطے کسی بھول چوک یا کسی کوتاہی پر کوئی رعایتی نمبر دینے پر مائل ہی نہ تھی۔کسی ظالم ساس کہ بہو آٹا گوندھتے ہوئے ہلتی کیوں ہو؟ جیسا سفاکانہ رویہ اپنائے ہوئی تھی۔چاہتی تھیں کہ پتھر بن جاؤں یا کسی بت کی طرح سیٹ پر سج جاؤں۔

خدا کا شکر تھا کہ بائیں ہاتھ بیٹھنے والی ڈشکری حسینہ قد کاٹھ چھ فٹ کو چھوتا اور رنگت سیندور ملے میدے جیسی اور اللہ کا احسان کہ اخلاق کے اعتبار سے بھی صورت جیسی ہی تھی۔کوئی نک چڑھی ہوتی تو تین گھنٹے کیلئے میرا تو سانس لینا مشکل ہوجاتا۔یوں وہ علم کے میدان کی بھی اچھی شہسوار تھی کہ دمشق یونیورسٹی میں جغرافیہ کی استاد تھی۔

بچے جہاں کے بھی ہوں اُنکے کھیل بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔سامنے والی سیٹ پر بیٹھی شامی بچی گڑیا کے ساتھ کھیلتی ،کبھی اُسے کپڑے پہناتی ،کبھی پھول تاروں سے سجاتی نظر آئی تھی۔لڑکا صورت سے بھائی جان پڑتا تھا وہ بھی موبائل پر گیمیں کھیلتا تھا۔

سامنے چلتے ٹی وی پر عربی فلم میں وہی پُرانے رنڈی رونے تھے۔خط پھاڑنے اور مرد کی محبت میں پاگل ہونے کے منظر۔مرد کی بیوفائی،عورت کا چھکوں پھکوں رونا،جیبوں کی تلاشی۔

واش روم کیلئے اٹھی تو چلتے چلتے ٹھٹھکی۔ ایک فلپینو لڑکی روتی تھی۔ دلداری کی تو جیسے ٹھیس لگ جائے آبگینوں کو والا معاملہ ہو گیا تھا۔ دو ننھی منی معصوم صورتیں چھوڑ کر آئی تھی۔ یاد نے زور مارا تو موتیوں کے ہار پرونے لگی۔

اب دلاسا اور تسلّی کے دو بول ہی تھے ناغریبوں کے مقدّر۔

گلف ایرلائن کی فضائی میزبانیں بلاشبہ مقابلہء حسن میں بھیجی جانے والی تھیں۔ مرد بھی اتنے ہی خوبصورت اور وجیہہ تھے مگر ساتھ ہی فارغ البال بھی۔ جی چاہتا تھا ایک کراری چپت کھوپڑیوں پر لگاؤں۔ کیسا مزہ آئے؟

کھانے میں بریانی تھی۔ کمبختوں کے پاس کشمش کا قحط تھا۔ سارا زور پیاز پر تھا۔ گارنش گویا مردے کے منہ پر مکھن ملنے کے حساب میں جاتی تھی۔ سبزیوں کی ڈش بےسوادی اور میٹھا اُس سے بھی زیادہ بےسوادا۔

فضائی میزبانیں جتنی حسین اور طرحدار، خدمت اور کارکردگی میں اتنی ہی نکّمی اور نالائق۔ کھانے کی ٹرے ہمیں سونپ کر انہیں اٹھانا ہی بھول گئی تھیں۔ بوڑھی خاتون کی بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی۔ میں نے پاکستانی خاتون کا اچھا تاثر اُبھارنے، خدمت خلق کی مد میں نمبر بنانے کی چکر بازی میں ان کی ٹرے اٹھائی۔ سلیقے کا فقدان تو جیسے میرے وجود کی پور پور میں ازلی رچا بسا ہے۔ کو جے پن سے پکڑی ٹرے جیسے کسی آوارہ کٹی پتنگ کی طرح لہرا سی گئی۔ قہوے کی پیالی میں سے بچا تھوڑا سا قہوہ خاتون کے اوپر گرا اور تھوڑے سے نے بائیں طرف والی ہمسائی کے سکرٹ کو بھی آلودہ کیا۔

بڑھیا نے چلاّنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم خاتون نے انہیں عربی میں متحمل رہنے کی بات کی۔ میں جو شرمندہ شرمندہ سی معذرت کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ مجھے بھی انگریزی میں کہا۔

''خیر ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔'' میں نے دل میں خود کو لعن طعن کی۔ خیر سے چلی تھیں بڑی سوشل بننے۔

ایک عظیم اور قدیم تہذیبی گہوارہ ملک شام کے دارالخلافہ دمشق کی پہلی جھلک جہاز کی کھڑکی

سے اڑتی ہوئی آنکھوں سے آٹکرائی تھی۔

اس کا پہلا منظر ہی بڑا دلربائی والا تھا۔ جیسے دُنیا سے کٹے پھٹے کسی صحرا میں پہاڑیوں کے پاؤں سے ناف تک کے دامن میں بچیوں نے کھیلتے کھیلتے گڑیوں کے خوبصورت گھروندے یہاں وہاں سجا دیئے ہوں۔ درختوں کی قطاریں اپنی لمبائی چوڑائی اور تناسب کے اعتبار سے بڑی موزوں اور منفرد سی دکھتی تھیں۔ درختوں کے یہ سلسلے کہیں کھیتوں جیسا تاثر اُبھارتے کہ لگتا تھا لائنوں میں شجر کاری کی گئی ہے۔ کہیں ایک بڑے سے صحرا میں ان کا پھیلاؤ جیسے میدان میں سبز کنکریاں جابجا بکھری ہوں۔

چٹیل ریگستانی میدان میں جبل قاسیون اور چام cham پیلس ہوٹل کی اولین جھلک بھی میں نے اُس شامی خاتون کی نشاندہی پر ہی دیکھی تھی۔

میں نے باہر دیکھا تھا شہر کے بیچوں بیچ گزرتی لمبی شاہراہ حافظ الا اسد روڈ جیسے کوئی موٹا تازہ اژدھا پھنکارتے مارتا ہو۔ یا جیسے کسی طباق سے نسوانی چہرے کے سر کی لمبی لشکارے مارتی مانگ۔

تین گھنٹے کے اِس سفر میں میں نے اُس حُسن کی مورتی سے شام کے متعلق کافی اسباق پڑھ لئے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک جغرافیائی لحاظ سے شام ایک بڑا ملک تھا۔ لبنان، اردن، عراق اور فلسطین سب اس کے حصّے سلطنت عثمانیہ کی علمداری میں تھے۔ انگریزوں اور اتحادیوں کی شازشوں نے اس کے حصّے بخروں کیلئے بڑی گھناؤنی چالیں چلیں۔ اِس سرزمین کو مختلف ٹکڑوں میں اپنے حواریوں میں بانٹ دیا۔

یہ کمبخت انگریز اور اُن کے چچیرے، ممیرے بھائی بند منحوس، اول درجے کے شازشی، لعنتوں کے مارے بڑے ہی تخریبی ہیں۔ حال ہو یا ماضی ملکوں ملکوں پھڈے ڈالے رکھتے ہیں۔

ذرا کسی نے سر نکالنے کی کوشش کی، کہیں کسی کی کمزوری نظر آئی۔ بس اس کا تیاپانچہ کرنے پر کمر کس لی۔ عراق کے ساتھ کیا ہوا؟ لیبیا کا خانہ خراب کیا۔ ایران پر بھی دانت بڑے تیز تھے پر وہ بھی لوہے کے چنے نکلے۔ بڑی کڑوی سوچیں تھیں میری۔

ڈاکٹر زُخرف کے لہجے میں دُکھ کی چبھن تھی کہ اس کا خوبصورت خدوخال والا ملک جو کہیں سوریہ اور کہیں بلاد الشام کہلاتا تھا۔ صدیوں پرانی تہذیبوں کا والی وارث، قدیم ترین مذاہب کا گڑھ اور عظیم ترین اثاثوں کا حامل کیسے اس بندر بانٹ کے نتیجے میں بے ڈھبا سا ہو گیا تھا۔

دراصل یہ ملک زمانوں سے ہی اپنے قریبی اور ذرا پرے کے ہمسائیوں کے لئے بڑی کشش کا باعث رہا۔ مغرب میں قیصر روم کی اس پر ہمیشہ رال ٹپکی۔ آئے دن چڑھائی کئے رکھتا۔ کچھ ایسا ہی حال کسریٰ ایران کا تھا۔ وہ بھی اسے سکون سے رہنے نہیں دیتے تھے۔

تاریخ، جغرافیہ چونکہ اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ تعارف ہونے پر پہلا سبق تو فوراً ہی شروع ہو گیا تھا۔ گو کچھ سبق تو میں بھی گھر سے پڑھ کر چلی تھی۔

تاہم جب اُس نے تاریخ کا پٹارہ کھولا۔ برطانیہ اور اس کے حامی موالیوں کے لتّے لینے شروع کئے۔ میں نے توجہ اُسکے رخساروں سے اُٹھا کر اُس کے لبوں پر لگا دی۔

''کیسے بندر بانٹ کی انہوں نے ہمارے علاقے کی۔ اتنی خوبصورت شکل والے ملک کو ٹیڑھا میڑھا تکونا اور مثلث نما کر دیا۔''

ڈاکٹر زُخرف کو تو اُس کے ٹیڑھے میڑھے اور تکونے ہونے کا دکھ ہی برداشت نہ تھا۔

ہائے آج پاس ہوتی تو پوچھتی زُخرف بتاؤ نا اب۔ کیسے کھنڈر بنا دیا ہے انہی لوگوں نے ایک بار پھر اِسے۔ وہی پرانے شاطر، کھلاڑی۔ وہی امریکہ اور روس کی تناؤ اور ضدیں۔ وہی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں۔ وہی مشرق وسطیٰ کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے۔ عراق، لیبیا اور اب شام کا قیمہ بن گیا ہے۔

میری سماعتوں میں زُخرف کی آواز گونجی ہے۔

''تاریخ میں مجھے شریف مکہ سے جتنی نفرت ہے اتنی شاید ہی کسی اور کردار سے ہو۔''

اپنی ہی ذات کے ٹکڑے جب ہمسائے بنے تو جنوب میں فلسطین اور اُردن، لبنان مغرب میں، 175 کلومیٹر لمبی پٹی بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

اور وہ ہماری نوحہ خوانی کی تاریخ کا ایک بڑا کردار ''فرات'' ترکی کے ارارات پہاڑوں کی جھیل سے نکل کر اسے سیراب کرتا مشرق میں واقع عراق میں داخل ہوتا ہے۔شمال میں ترکی۔ لبنان بارڈر کے ساتھ اس کی سب سے اونچی چوٹی 2814 میٹر بلند ''ہرمن'' ہے۔

شام کی سرزمین صحرا، میدانوں ، پہاڑوں، جنگلوں اور چراگاہوں سے بھرپور ہے۔ چودہ صوبوں میں منقسم جس کے شہر تدمیر Palmyra، حلب Aleppo اور بصریٰ Bosrah اپنے ماضی کے شاندار ورثوں کے ساتھ دنیا کی تاریخ میں بڑے نمایاں ہیں۔ حلب یعنی الیپوتین ہزار قبل مسیح کا شہر قنطرہ Al.Quntira ، درا، طرطوس، حمص اور لاطاکیہ سب تاریخی حوالوں سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

دمشق کی بات چھوڑیئے۔ دمشق سٹیڈل Damascus Citadel گویا شہر کا موتی ہے۔اس کا لینڈ مارک ہے۔شام کے جنوب مغرب میں واقع ایک بڑا میٹرو پولیٹن شہر جس کے شہری کوئی سوالاکھ کے قریب ہیں۔

کٹھ پتلی بادشاہت سے گزرتا کمیونسٹ سوشلسٹ چکروں میں الجھتا حافظ الاسد کے بعد اس کے ڈاکٹر بیٹے بشارالاسد کی صدارت میں ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

بشار کے بارے میرے ایک سوال پر ڈاکٹر زُخرف نے کہا تھا۔

''بہت سمجھدار اور لوگوں میں ہردل عزیز ہے۔مُلک کو تیز رفتاری سے ترقی کی جانب لے جا رہا ہے۔ ہمہ وقت لوگوں سے رابطے میں رہتا ہے۔''

تب یعنی 2008ء میں شام بڑا پر سکون ملک تھا۔ سیکولر ملک جہا ں مسلمان ، عیسائی، آرتھوڈوکس، آرمینائی، دروز سبھی عقیدوں کے لوگ مل جل کر رہتے تھے۔کہیں یہ اس وقت میرے گمان کے کسی حصے میں بھی نہ تھا کہ بہت ساری دیگر وجوہات کے ساتھ صدام کی زبانی کلامی حمایت کرنے پر اس کے پر کاٹنے اور اسے تباہ کرنے کے منصوبوں پر کام شروع ہوگیا ہے۔اور اُس کی وہ سمجھداری جس کے گن ڈاکٹر زخرف گا رہی تھی اُس کی تباہ کن حماقتوں میں بدلنے والی ہے اور وہ اقتدار کے لئے اپنے ہی

لوگوں کوخون میں نہلانے والا ہے۔

جہاز لینڈ کرر ہا تھا۔ میں نے اپنی حسین ہم سفر کا شکریہ ادا کیا کہ جس نے شام سے میرا ابتدائی تعارف کروادیا۔

ایر پورٹ اتنا شاندار نہ تھا جتنا میں توقع کررہی تھی۔

ایک تو گہما گہمی بھی کچھ خاص نہ تھی۔ دوسرے امیگریشن والے نرے لونڈے لپاڑے۔ سُست تو جو تھے سو تھے مگر کام میں طریقے سلیقے کا بھی فقدان تھا۔

میرا اٹیچی کیس ہی نہیں مل رہا تھا۔ میں بوکھلائی پھرتی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ کہیں پچھلے جہاز میں نہ آرہا ہو۔ پر میرے دل کو قرار نہ تھا۔ خدا کا شکر ہی تھا کہ کوئی آدھ گھنٹے بعد مل گیا۔ خیر سے گروپ کے ایک بندے نے اپنا سمجھ کر اسے اپنے سامان میں گھسیڑ لیا تھا۔

باہر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شام بہت خوبصورت تھی۔ سونے رنگی دھوپ میں رعنائی تھی اور تھم تھم کر چلنے والی ہواؤں میں بانکپن تھا۔ گردوپیش کے منظروں میں صحرائی حسن کی لالیاں تھیں۔ ایر پورٹ شہر سے باہر تھا۔ کوئی تیس بتیس کلومیٹر کا درمیانی فاصلہ تھا۔

پڑاؤ زینبیہ میں ہوا۔ دمشق سے دس کلومیٹر جنوب کی سمت پر زینبیہ کا علاقہ حضرت زینب کے نام نامی سے مشہور ہے۔ درمیانے درجے کے ہوٹلوں، بازاروں اور رہائشی مکانوں کی وجہ سے متوسط زائرین کی کثرت ہے جو یہاں ٹہرتے اور دنوں رہتے ہیں۔

کمروں کا حساب کتاب اور کس نے کس کے ساتھ نتھی ہونا ہے اس کا فیصلہ ابھی مشکل تھا کہ پتہ چلا تھا کہ جب تک وہ فلائٹ جو پیچھے رہ گئی ہے نہیں پہنچ جاتی اس وقت تک تعین ذرا مشکل ہے۔ یہ اور بات تھی کہ بڑے کمروں میں رشتہ دار عورتوں نے ممکنہ تعداد کے پیش نظر خود ہی اپنے گروپ ترتیب دے لئے تھے۔

میں اکیلی گواچی گاں کی طرح مختلف کمروں کا جائزہ لیتی ایک ایسے کمرے میں گھس گئی جہاں اے سی چلتا تھا۔ تین عورتیں بستروں پر چڑھی بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ قدرے معقول لگتی

تھیں۔ کمرے جس کی کھڑکیاں باہر سڑک پر کھلتی تھیں، میں نے اسی سے باہر دیکھا تھا۔ سڑک کے پار پھیلے قبرستان نے فوراً توجہ کھینچ لی تھی۔

پہلے تو میں نے جھٹکا کھایا۔ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ سچی بات ہے قبرستان تو ہمیشہ دل دہلانے والے منظروں کے عکاس ہوتے ہیں۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے ہنگامی فیصلہ ہوگیا کہ جو مرضی ہو اِس کمرے میں تو قطعی نہیں ٹھہرنا، بلکہ اِس ساری قطار کے ہر اُس کمرے میں جہاں سے اٹھتے بیٹھتے یہ منظر نظر آئے مجھے نہیں قبول۔

ریاست بہاولپور کے نواب کی نور بیگم یاد آ گئیں کہ جس کے لئے نواب نے نہایت عالیشان محل بنوایا تھا۔ جس کی تعمیری خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سیمنٹ اور سریا کی جگہ چاول، دال ماش، چونے، پٹ سن اور چکنی مٹی کو پیس کر اُسے استعمال میں لایا گیا۔ ایک دن کی بیاہی دلہن کا ڈولا رات گئے محل میں اُترا۔ صبح دم کھڑکی کے پردے ہٹا کر دریچے سے باہر جھانکا تو اُسے سامنے قبرستان نظر آیا۔ نور بیگم نے پاؤں پٹخے۔ غصّے سے کھولتے اور تنتناتے پالکی میں سوار نواب کے لئے پیغام دیا کہ اُسے قبرستان میں نہیں رہنا۔ اور یہ جا وہ جا۔

تاہم چند لمحوں کی نظر بازی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بڑا طریقے سلیقے والا لگ رہا تھا۔ بیگ سے دوربین نکالی۔ آنکھوں پر چڑھائی۔ ارے واہ قبروں کا سنگ مرمر، درمیانی ترتیب، پھول، درخت سبھوں میں اگر بہت دل آویزی نہیں تھی تو بھی ہمارے ہاں جیسی پھنبڑ پھوسی والی صورت بھی ہرگز نہ تھی۔ متاثر کرنے والی حالت ضرور تھی۔ یوں ہمارے ہاں کے بھی بعض قبرستان بڑے خوبصورت سے ہیں۔ سندھ کا مکلی، حسن ابدال کا کہ مغل بادشاہوں، اُن کے امراء اور درباریوں کی کشمیر کے لئے گزرگاہ اسی راستے سے تھی۔ موت برحق، شہزادے، شہزادیوں نے بھی اللہ کو پیارا تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے بھرے خزانوں میں سے کچھ تھوڑا بہت اِن جوانا مرگ لوگوں پر لگنا بھی ضروری۔ تو بہت سی شاندار قبریں ہیں وہاں۔

کمرے میں اے سے کی ٹھنڈک نے لطیف سی خنکی بکھیری ہوئی تھی۔

''ہائے ایسے میں اچھی سی چائے کا ایک کپ مل جائے تو خدا کا کتنا شکر ادا کروں۔''

مگر اس خواہش کا اس ماحول میں پورا ہونا مشکل نہیں ناممکن سا تھا کہ کون اٹھ کر کنوئیں میں بوکا ڈالے گی۔اوّل تو جان پہچان ہی نہیں۔اگر بے شرم بن کر اپنی بزرگی کا واسطہ دے کر ایک کپ کے لئیے درخواست کربھی دوں تو بھئی جیسی چائے کی طلب ہے وہ تو اِس ماحول میں ممکن نہیں کہ بڑی جھٹکی سی فضا ہے۔یہ جو میرے سامنے بیٹھی تین عورتیں آپس میں گپ شپ کررہی ہیں۔میٹرک،ایف اے پاس ضرور ہیں۔مگر چائے بنانے اور پینے کے نفیس ذوق سے عاری دکھتی ہیں۔

مغرب کے قریب یکدم ماحول کی قدرے خاموش فضاؤں میں بڑا زوردار قسم کا ارتعاش پیدا ہوا۔کچھ لوگوں کی ہمارے کمرے میں تانکا جھانکی بھی شروع ہوئی جس نے بتایا کہ خیر سے باقی ماندہ لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔

اِن تانکا جھانکی کرنے والوں میں دو چہرے ایسے تھے جنہوں نے فوراً توجہ کھینچی تھی۔ایک چالیس(40)پینتالیس (45) کے ہیر پھیر میں اچھے نقش ونگار اور قدرے فربہی مائل بدن کی عورت جو لب و لہجے سے پڑھی لکھی لگی تھی۔دوسری نو جوان،خوبصورت تیز طرار اور چلبلی سی لڑکی تھی۔ہوا کے کسی معطر جھونکے کی طرح دونوں نے ایک دروازے سے انٹری دی۔السلام وعلیکم کی ذرا زوردار گونج سے کمرے میں شور پیدا کیا اور پھر دوسرے دروازے سے نکل کر میرے لئے یہ پیغام بھی چھوڑتی گئیں کہ اِس بھالیکے میں نہ رہنا کہ قافلے میں سب ماٹھے اور رھما شما جیسے لوگ ہی ہیں۔کچھ اچھا اور بڑھیا مال بھی ہے۔

مجھے کس کے ساتھ رہنا ہے؟ اِس کا بھی فیصلہ ہوگیا تھا۔خدا کا شکر تھا کہ مجھے بھی اچھا لگا۔تھوڑی دیر قبل انٹری دینے والی اُدھیڑ عمر نسرین اُردو میں ایم اے ایم فل۔کلام اقبال کی عاشق بڑی ہی شریف الطبع، روشن خیال، میری روم میٹ بنی۔چھوٹا سا کمرہ بھی ہم دونوں کو مل گیا۔دو تین برتن بھانڈے بھی عنایت ہوگئے۔رکابی،تھالی، مگ،گلاس،چائے کے لئے ایک پین بھی مل گیا تھا۔

اب سوچا چل کر دودھ پتی لائیں۔نسرین تھکی ہوئی تھی۔اُسے آرام کا کہتے ہوئے میں نے کمر

کس لی۔شکر کہ لفٹ تھی۔لفٹ میں کھڑا لڑکا صورت سے بڑا اپنا اپنا سا لگا۔تیرا کو میرا کو والی گلابی اردو بولا تو معلوم ہوا کہ اڑیسہ کے کسی گاؤں سے ہے۔نام وجیاوادہ۔مذہباً ہندو اور عادتاً اپنی خوش خلقی، میٹھے بولوں اور بھولی سی سلونی صورت سے فوراً دل میں اُتر جانے والا۔عرصہ تین سال سے یہیں زینبیہ میں تھا۔

گھر اور گھر والے تو یاد نہیں آتے جیسے میرے بونگے سے سوال پر آنکھیں بھر سی گئیں۔میرے ممتا بھرے کلیجے پر جیسے کسی نے گھونسہ مارا۔فوراً سینے سے لگایا۔ماتھا چوما۔

''ہائے ری میّا،غریبی کے دُکھ۔''

اسی سے پتہ چلا تھا کہ شیعہ مسلک سے متعلق لوگوں کا زیادہ رحجان اسی علاقے میں قیام کرنا ہوتا ہے۔ایرانی لوگوں کے بہت بڑے بڑے ہوٹل بھی یہاں ہیں۔پاکستانیوں کی اکثریت بھی یہیں رہنے اور ٹھہرنے کو پسند کرتی ہے کہ سستا ہے۔

دکانوں،اشیاء اور ان کی قیمتوں بابت میرے کچھ جاننے پر کہ وہ تھوڑی سی راہنمائی کر دے جیسی خواہش کی تکمیل کے لئے پیارا وجیاوادہ ساتھ چلنے پر فوراً تیار ہو گیا۔میں نے خود ہی منع کیا کہ یقیناً کہیں کام سے جا رہا ہوگا۔میری ہمدردی میں بیچارے کو مالکوں کی لعن طعن اور پھٹکار ہی نہ کھنے پڑ جائے۔

سڑک پر آئی اور ملحقہ بازاروں کا چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ تو بذات خود ایک شہر ہے۔دکانیں برقی روشنیوں سے جگمگاتی اور سڑکیں جہازی سائز گاڑیوں کے دوڑنے بھاگنے کے شور سے گونجتی تھیں۔گاڑیوں کے شیشوں سے جھانکتے چہروں کی دل آویزی کہیں قدموں کو روک لیتی تھی۔کشادہ گلیوں میں زیر تعمیر عمارتوں کے سلسلے تھے۔

کچھ ایسی ہی صورت سڑکوں پر چلتی سیاہ لبادوں میں لپٹی گل رنگ چہروں کی تھی۔

چال ڈھال چہرے مہروں اور انداز واطوار سے یہ زیادہ ایرانی نظر آتے تھے۔

دس ڈالر کھلے تھے وہی اس وقت تبدیل کروائے۔کرنسی نوٹوں پر سیرین پاؤنڈ کا نام۔تاہم

خرید وفروخت میں لیرا بولنا استعمال ہوتا تھا۔ 10 ڈالر کے 450 لیرا ملے۔ گھر پر فون کی کوشش کی۔ رابطہ نہ ہوا۔ سوچا صبح سہی۔

چیزیں زیادہ مہنگی نہ تھی۔ مکھن، جام، ڈبل روٹی، بسکٹ سب ہی خرید لیں۔ دودھ کی بوتل پینتیس لیرا کی تھی۔

جب میں گھومتے پھرتے دکانوں کا جائزہ لیتی تھی تو دفعتاً قالینوں کی ایک دکان نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ اُس میں دھرے اور سجے سامان کے حسن وترتیب میں ایک نفاست اور ذوق نظر آتا تھا۔ میں چار پوڈے چڑھ کر دکان میں داخل ہوئی تو خوشی ہوئی کہ کونے میں بیٹھا ہوا شخص خاصا معزز اور انگریزی میں بھی ٹھیک ہی تھا۔ ساتھ بیٹھے چار اُسی کے رنگ ڈھنگ کے لوگ یقیناً یار دوست ہوں گے، خوش گپیوں میں مگن تھے۔ میں نے قریب جا کر تعارف کروایا۔ پاکستان کا جان کر سب کا اظہار بس عامیانہ سا تھا۔ نہ گرم جوشی تھی اور نہ ہی سرد مہری محسوس ہوتی تھی۔

اب باتیں ہونے لگیں۔ میرے لئے شام کا یک جماعتی نظام جو تقریباً ساڑھے چار دہائیوں سے مسلسل جاری تھا خاصا حیران کن تھا۔ بعث پارٹی ہی سارے میں زمانوں سے پردھان بنی نظر آتی تھی۔ عراق ہو، لیبیا یا شام اسی پارٹی نے جھنڈے گاڑے تھے۔ اختلاف رائے رکھنے کا کیا لوگوں میں شعور نہیں تھا یا بدلتے رجحانات کے زیر اثر یا دُنیا میں ہر سطح پر جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں اُن سے کسی نہ کسی انداز میں اثر پذیری شامی لوگوں کے مقدر میں نہ تھی۔ فکری سوچوں پر جمود اور بانجھ پن کی سی کیفیت تھی۔ کیا بات ہے؟ اور میں نے یہی نوکیلے سوال کر ڈالے تھے۔ چند لمحوں کے لئے سب خاموش تھے۔ پتہ نہیں مرکزی کرسی پر بیٹھے شخص کے سوا سوال کسی نے سمجھے بھی تھے؟ مگر نہیں یہ میری خام خیالی تھی۔ اُن سب کی انگریزی اچھی تھی اور جواب کی بجائے طنز سے بھرا سوال میری طرف آیا تھا۔

''آپ کیا شامیوں کو کوڑھ مغز سمجھتی ہیں؟'' ایک لمحہ رکنے کے بعد مرکزی کرسی والا بولا تھا۔ دراصل ہمارا دشمن اسرائیل ہے۔ ہم ہر صورت اپنی ہر سوچ اور وفاداری حکومت سے وابستہ

رکھتے ،اُسے اپنا بھرپور تعاون دیتے ہوئے اپنا علاقہ اپنی گولان کی پہاڑیاں اس سے واپس لینا چاہتے ہیں۔اسی لیے یہاں سیاست اور سیاسی پارٹیاں اتنی فعال نہیں۔

بلا کے یقین اور اعتماد سے بات کرنے والے کو معلوم نہیں تھا کہ جو عورت سوال پوچھ رہی ہے اُس نے دمشق کی گلی گلی کوچہ کوچہ پھرنا ہے۔سوال کرنے ہیں اور کہیں نہ کہیں اندر کی بات سامنے آ ہی جاتی ہے۔ہاں البتہ یہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ اس کا جنرل نالج بہت کمزور اور ملکی سیاست سے آگہی کا شعور بس بڑا واجبی سا تھا۔یوں خاصا کاروباری دِکھتا تھا کہ جب میں نے اُس سے قالین بافی پر بات کی۔اُس نے اس موضوع پر ایک پورا انسائیکلو پیڈیا کھول دیا۔جس میں بہرحال میری دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔اب مجھے قالینوں کی دکان تھوڑی کھولنی تھی۔

☆☆☆

باب نمبر ۲:

زینبیہ

- پہلا دن، پہلا کام، پہلا نشہ مزار اقدس بی بی زینب پر حاضری۔
- حزب اللہ کے جناب حسن نصر اللہ کی تصویر پر نظر پڑتے ہی دل سے عقیدت و محبت کے سوتے اُبلنا ضروری تھے۔
- سراقب قصبے پر کیمیائی ہتھیاروں کا حملہ گویا انسانیت کے قتل کے مترادف تھا۔

صبح کا ناشتہ نسرین نے بنایا۔ وہ اپنے موٹاپے کے باوجود اچھی خاصی چُست اور متحرک خاتون تھی۔ میری عمر کی ہوگی یا مجھ سے دو تین سال چھوٹی۔ میں نے لنگر والے کچن میں جا کر دیکھا۔ پراٹھے بن رہے تھے۔ گھی کی جس انداز میں چپڑ چپڑائی ہو رہی تھی وہ ہمارے لئے قطعی سودمند نہ تھی۔ طبیعت کو لالچ پر مائل کرنے کی بجائے اُسے قناعت کا درس دیتی واپس آئی تو نسرین نے ناشتہ چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیا تھا۔ شکر کیا تھا۔ چائے مزے کی تھی۔ پنیر اور جام لگے سلائسوں نے لطف دیا۔

نہانا دھونا صبح سویرے ہو گیا تھا کہ نماز پڑھنی تھی اور روضۂ مبارک پر حاضری کا پروگرام تھا۔ گروپ کی کوئی خاص پابندی نہ تھی۔ جس کا جی جیسے چاہتا اپنی مرضی کا مالک تھا۔ میرا حاضری کے بعد شہر کے لئے نکلنے کا ارادہ تھا۔ البتہ اس وقت میں نے گروپ کے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔ ہوٹل سے نکلتے ہی طلائی گنبدوں کی چمک نے آنکھوں کو خیرہ کیا۔

روضہ مبارک میں داخل ہونے سے قبل ایک خاصے بارونق بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ سویرے سویرے ہی خرید و فروخت کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔

اور جب دھیرے دھیرے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سفر جاری تھا ایک آواز کانوں میں گونجی تھی۔

''خدا کی راہوں میں شہادت پانے والے لوگ کبھی فنا نہیں ہوتے۔''

حضرت زینب۔ عفت وعصمت کی تصویر۔ صبر ورضا کا پیکر۔ خاتون جنت کی لختِ جگر، علی المرتضیٰ کی آنکھوں کا نور۔ زینب نام آقائے دو جہاں کا عطا کردہ تھا۔ بچپن بڑا محرومیوں والا تھا کہ پہلے نانا بعد میں ماں جیسی ہستی نے جدائی کا غم دے دیا۔ شادی عبداللہ بن جعفر سے ہوئی جو عم زاد تھا۔ کربلا میں مردانہ وار کردار ادا کیا۔ بھائیوں کے ساتھ بیٹوں کی شہادت کو صبر واستقامت سے برداشت کیا۔

جب یزید کے دربار میں لائی گئیں تو غم کا کوہ گراں دل پر اٹھائے عزم وحوصلے کی تصویر نظر آئی تھیں۔ خطاب ایسا کہ آہنی حوصلہ رکھنے والا بھی کانپ اُٹھے۔ مگر سوال ہے کہ ہم کیسے مسلمان ہیں کہ اُن کی زندگیوں سے کوئی سبق نہیں لیتے؟ وہ جگہیں جن کی ایک ایک اینٹ بھی باعث صد احترام۔ انہی پر فرقہ واریت کے جھگڑے، انہی پر گولہ بارود کی بارش۔

مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی تنظیمی دفاتر نظر آتے ہیں۔ دیواریں مذہبی اور سیاسی شخصیات کی تصویروں سے سجی تھیں۔ جناب حسن نصراللہ میرے سامنے تھے۔ بے اختیار قدم رک گئے تھے۔ آخر کیوں نہ رُکتے؟ لبنان کی حزب اللہ تحریک کے بانی، اِس تنظیم کے روح ورواں ایک باعمل اور صاحب کردار مسلمان جنہیں تعظیم دینا، جنہیں سراہنا، جن کے لئے عقیدت بھرے دو لفظ بولنے بے حد ضروری تھے۔

میرے دل سے تو عقیدتوں اور محبتوں کے سوتے اُبل پڑے تھے۔ 16 جولائی 2006ء کا دن اپنی وحشت ناک خبر کے ساتھ یاد آیا تھا۔ میں نے ٹی وی پر اِس خبر کو اپنے دل پر کسی زوردار گھونسے کی مانند محسوس کیا تھا۔ اُس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ یہ مکّار بڑی طاقتیں اور لاغر، نحیف، خودغرضیوں کے حصار میں گھری مسلم اُمّہ بھی قرونِ اولیٰ کے مجاہدانہ کردار کی ایک جھلک لبنان کی اس حزب اللہ کی صورت میں عنقریب دیکھنے والی ہے۔

16 جولائی کو اسرائیل نے حزب اللہ کے ہاتھوں اپنے دو فوجیوں کے اغوا ہونے کی آڑ لیتے ہوئے لبنان پر حملہ کر دیا تھا۔ طاقتور دنیا کی بھی کیسی ڈھٹائی تھی کہ اسرائیل کی جیلوں میں تقریباً نو ہزار فلسطینی اور لبنانی قید تھے۔ ان کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ یہ حملہ اسرائیل نے امریکہ کی ہلاّ شیری سے حزب اللہ اور ایران کو سبق سکھانے کے لئے کیا تھا۔

اسرائیل کا اعلان تھا۔ لبنان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ حزب اللہ اور اس کی قیادت کو کچل دیا جائے گا۔ دونوں ملکوں میں جنگ کوئی 34 دن جاری رہی۔ لبنانی عوام، اُن کے لسانی اور مذہبی گروپ، مسلم غیر مسلم سب حزب اللہ کی پشت پر کھڑے ہو گئے تھے۔

جدید ترین ہتھیاروں سے لیس دنیا کی بہترین فوج کے مقابلے پر صرف ڈھائی ہزار مجاہدین تھے جنہوں نے زیر زمین سرنگوں اور ٹھکانوں سے اسرائیل کے اندر جا کر اُسے بتایا کہ حزب اللہ لوہے کے چنے ہیں۔ اسرائیل کے دانت بری طرح ٹوٹ جائیں گے۔

بھاری جانی و مالی نقصان نے اسرائیلی عوام کو حکومت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ جنگ بندی پر مجبور ہو گیا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم ایہود المرت نے اپنی کنیسٹ Knesset سے خطاب کرتے ہوئے قوم سے اِس جنگ میں شکست پر معافی مانگی تھی۔ اعتراف کیا تھا کہ انہیں اپنے اِس فعل پر افسوس ہے۔

اُن کا وہ کردار بھی قابل تقلید ہے جب وہ اسرائیل کی وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں شہید ہونے والوں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ اِن شہیدوں میں اُن کا بیٹا بھی ہے۔ مارگیو میں قطار در قطار سفید کفنوں میں لپٹے شہیدوں میں ہر ایک کے پاس پل بھر کے لئے رکتے، اُسے دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اپنے لختِ جگر کے لئے بھی ان کے پاس بس ایک لمحہ ہی تھا۔ گھڑی بھر کا ٹھہرنا اور ایک نگاہ۔ ایک سچے اور سُچے مسلمان کا کردار۔

جنگ بندی کے بعد کا بھی بڑا مثالی کردار تھا۔ گھر گھر جا کر متاثرہ لوگوں میں امدادی رقوم کی تقسیم۔ مکانوں کی مرمت اور تعمیر نو۔ خاندانوں کو گزارہ الاؤنس۔ مغرب کا میڈیا بھی تعریف کرنے پر

مجبور ہوا۔

اور اُس چمکتی صبح میں حسن نصر اللہ کی تصویر کے سامنے کھڑی نم آنکھوں سے اُنہیں خراج پیش کرتے ہوئے کہتی تھی۔

''ہمیں آپ پر فخر ہے۔ آپ کی قیادت پر ناز ہے۔''

جی بھر کر خراج تحسین پیش کرنے کے بعد آگے بڑھی تھی۔

ایک دنیا امنڈی پڑی تھی۔ کشادہ صحن سے آگے داخلی دروازے کا پچی کاری کے کام سے مزین بے حد دیدہ زیب کام جس میں نیلا رنگ نمایاں اور بہت کھلتا ہوا نظروں سے کھُبا جاتا تھا۔ بلند و بالا مینار کی بھی اپنی شان تھی۔ اتنا خوبصورت کام کہ جسے سراہے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ روضہ مبارک بھی دلآویزی کی اپنی مثال ہے۔

شنید ہے کہ اس کا بیشتر کام حکومت ایران کا مرہون منت ہے۔ اندر نقرئی اور طلائی کاموں کی جھلکیاں تھیں۔ کھڑکیوں پر آرائشی کام نے انہیں بے حد جاذب نظر بنا دیا تھا۔ قیمتی شینڈ لیئرز حُسن کو اور بڑھاوا دے رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ انتظامات تھے۔ ضریح زمین سے کافی بلند ہے۔ جالی سے لٹکتے منتوں کے تالے اور رنگین دھجیاں انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ یہاں وہاں جالیوں سے لگی صورتیں آنسوؤں سے لبریز آنکھیں، فضاؤں میں گونجتے نوحے سبھی مضطرب کرتے تھے۔

آج لکھتے ہوئے وہ سارے منظر جو بہر حال 2008ء میں امن اور عافیت کے حصار میں لپٹے ہوئے تھے۔ چار پانچ سال بعد اس وقت خون خون ہیں کہ ابھی چند لمحے پہلے ٹی وی پر وہ لاشیں، وہ زخمی، وہ آگ اور خون کی ہولی دیکھی ہے۔

اس پر کرلاتی، بین کرتی کمرے میں آ کر بیٹھی ہوں۔ میری سماعتوں میں نیوز ریڈر کی آوا پھر گونجی ہے۔

حضرت زینب کے مزار کے باہر بم دھماکے۔ ساٹھ 60 افراد شہید۔ متعدد زخمی۔ روضے والی

گلی کلّی طور پر تباہ۔آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے میں خود سے بڑبڑائی تھی۔

''میرے معبود! تیرے محبوب کی امت پر کیسا وقت آن پڑا ہے؟ مسلمان ہونا رسوائے زمانہ ہوگیا ہے۔کلمہ گو کلمہ گو کے ہاتھوں قتل ہورہا ہے۔اسلام کے نام لیوا ملکوں کے سر براہ اقتدار کو بچانے کے لئے اغیار کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

دیر تک اِس حزن ویاس میں ڈوبی رہنے کے بعد باہر نکلی ہوں۔2008 کی اُس روشن سی صبح دوبارہ وہاں حاضر ہوتی ہوں۔نفل پڑھتی ہوں۔پھر ڈھیر ساری دعائیں مانگنے کے بعد کھڑی ہوئی اب گردوپیش کا جائزہ شروع ہوا۔کیا جھلملاہٹوں کا حُسن تھا۔اندرونی دیواریں آسٹریا کے شیشوں اور اٹلی کے ماربل سے چمکتی تھیں۔بڑے ہال میں چوبی تعویز کی کندہ کاری بے مثال تھی۔

باہر نکلی تو صحن میں سوز خوانی کی محفل نے رنگ بکھیرا ہوا تھا۔سرگودھوی لہجے میں محسن نقوی کا مشہور زمانہ مرثیہ کلام۔واہ واہ کہوں کہ آہ آہ کہوں۔کیا بات تھی۔آوازوں کا سوز وگداز میں ڈوبا بلند آہنگ پریوں جیسی صورت والی ایرانی خواتین کے ایک جمگھٹے نے اِن عورتوں کے گرد گویا حصار سا باندھا ہوا تھا سمجھ نہ آنے کے باوجود وہ جوش وجذبے کی پوری لگن سے اس محفل میں شریک تھیں۔

کیا شاعر تھا محسن نقوی بھی۔محبت کا سفیر۔

اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے مسجدوں کا پتہ چلا۔روضہ مبارک کے دائیں بائیں دو مسجدیں۔ایک شیعہ اور دوسری سُنی۔

''اے اللہ ہمیں تو یہ عقیدوں اور مسلکوں کے فتنے اور چکر لے بیٹھے۔کوئی پوچھے کہ بھلا ایک ہی جگہ میں اپنے اپنے طریق سے نماز پڑھنے میں کیا قباحت ہے یا کوئی ممانعت ہے؟ کیوں اتنے پراگوں میں اِس جنڈری کو ڈال رکھا ہے؟

تو دونوں مسجدوں میں دو دو نفل پڑھ آتی ہوں۔دیدار بھی ہوجائیگا۔یہیں دو پاکستانی لڑکوں سے ملنا ہوا۔دونوں طالب علم تھے۔ایک امام خمینی یونیورسٹی اور دوسرا زینبیہ یونیورسٹی میں فقہ جعفریہ کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔دونوں یونیورسٹیاں یہیں زینبیہ میں ہی ہیں۔

شہر کے سیر سپاٹے کیلئے ٹیکسی میں بیٹھنے سے قبل میں گھر فون کرنے کا سوچتے ہوئے قریبی ہوٹل کی ایک دوکان میں داخل ہوئی۔

سامنے بشار الا اسد کی قد آدم تصویر کے ساتھ ایران کے ڈاکٹر احمد نژادی کھڑے تھے۔ میں جب دونوں سربراہوں کو شانہ بشانہ کھڑے بغور دیکھنے میں محو تھی۔ دکان کا نوجوان لڑکا مسکرایا تھا۔

کس ادا سے میری طرف دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے سے آنکھوں کے اشاروں سے گویا مجھے سگنل دیا تھا کہ ان کے صدر کا ایران کے صدر سے بھلا کیا مقابلہ؟

دیکھو تو ذرا اُس کی چمکتی آنکھیں بشار الا اسد پر جم گئیں۔ کتنا خوبصورت، کتنا اونچا لمبا۔ احمد نژادی کی ذرا چھوٹی قامت کو اُس نے جس انداز میں تمثیلی صورت دی۔ مجھے تو ہنسی روکنی مشکل ہوگئی۔

واقعی بشار وجیہہ تو تھا نا۔ اس میں مبالغے والی کوئی بات ہی نہ تھی۔

تاہم یہ سوچ بھی در آئی تھی کہ اِس نوعمر لڑکے کو احمد نژادی کی شخصی خوبیوں کا ادراک نہیں۔ درویش صفت نژادی جو اپنے لوگوں کے لئے گٹر میں بھی اُتر جاتا ہے۔

بہرحال کیا زندہ دل لڑکا تھا۔

مگر اب بیچ میں اِس آٹھ سالہ ظالم وقت کا کیا کروں؟ میرے ذہنی وقت کی ٹنل میں ٹھہرا ہوا وہ لمحہ جب اُس کی خوبصورت تصویر اُس کی دراز قامتی کی عکاس میری آنکھوں سے نکل کر دکان میں بکھری تھی۔

سچی بات ہے آج 2014ء میں لکھتے ہوئے نفرت اور غصے کی آگ میں اپنی وہ ساری رعنائی بھسم کر بیٹھی ہے کہ ابھی دو دن پہلے میں نے جو تصویریں دیکھی ہیں۔ انہوں نے مجھے کیا کچھ نہیں یاد دلایا۔ میرے تصور کی آنکھ نے اُن گول مٹول سرخ وسفید بچوں کو دیکھا۔ حسین چہروں والی طرحدار دوشیزائیں مجھے یاد آئی تھیں۔ وجیہہ مرد میرے خیالوں میں دوڑے چلے آئے تھے۔

شام کے سراقب قصبے کے رہنے والے شہریوں نے کیمیائی ہتھیاروں سے حملے کا جس طرح سامنا کیا ہے وہ انسانیت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ معصوم بچے اور عورتیں یوں لگتا تھا جیسے شادی کی کسی

پرمسرت سی تقریب کے بعد تھک کر سوئے ہوں۔ بے ترتیب سے، ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے، زندگی کی دوڑیوں سے کٹے ہوئے۔

اللہ تمیں ہزار آبادی والے قصبے پر مائع کلورین کے کنستر گرائے گئے۔ یہ ہیومن رائٹس کی قراردایں، یہ باراک اوباما کے بیان۔ روس اورامریکہ کے مابین سمجھوتے۔ جہاں مفادات کاٹکراؤ نہ ہو وہاں ایسے ہی سمجھوتے ہیں۔ کہاں کی انسانیت؟ کہاں کے اصول اور ضابطے؟ بس بشار کوتھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیے۔ یادرکھو کیمیائی ہتھیار وہ سرخ لکیر ہے جس کا استعمال عالمی برادری برداشت نہیں کرے گی۔

اوباما کہتا ہے۔

واہ کیا کہنے اِس عالمی برادری کے۔

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

چلو چھوڑتی ہوں اپنے یہ رنڈی رونے۔ واپس لوٹتی ہوں 2008 کی اُس صبح کو اور خود کو موجود پاتی ہوں اُس دکان میں۔

ایک منٹ کی کال ایک ڈالر۔ چلو شکر جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت مطلوب ہے جیسا پیغام دیا اور سنا۔

☆☆☆

باب نمبر۳:

پاکستانی سکول اورالمرجع یاشہدا چوک

- دمشق میں پاکستانی سکول بھی اقربا پروری کا ایک ذریعہ بنا ہوا تھا۔
- المرجع یا شہدا چوک کلاسیکل حُسن کا دلکش نمونہ ہے۔
- نچلی سطح سے لے کر چوٹی تک رشوت کا بازار گرم ہے۔
- عام سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لئے ایک لاکھ سیرین پاؤنڈ چاہئیں۔

ٹیکسی کے لئے تھوڑا سا بھاؤ تاؤ کرنا پڑا۔ تاہم لوٹنے کا رجحان نظر نہیں آیا۔ تقاضا اُس نے تین سو لیرا کا کیا۔

میں نے کچھ کمی کا کہا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

''شہر کا شمالی حصّہ ابراہیم حنانو سٹریٹ سے شروع ہوتا ہوا سفارت خانوں کے ساتھ شہر کے مرکزی حصے یوسف اعظم سکوائر تک پھیلا ہوا ہے۔ مرکزی حصہ تو یوں بھی گنجان ، وسیع وعریض اور کاروباری مراکز کا گڑھ ہوتا ہے۔ پاکستانی سفارت خانہ کس سٹریٹ میں ہے اور مجھے اُسے ڈھونڈنے میں کتنا خوار ہونا پڑے گا میں نے نہیں جانتا۔ اِس لئے میں نے پہلے ہی کرایہ مناسب بتایا ہے۔

''چلو۔''

بیٹھنے کے ساتھ ہی میں نے تھوڑا سا خود کو کوسا کہ شام میں پندرہ دن کا قیام ہے۔ اطمینان اور سکون سے چلنے کی ضرورت ہے۔ مگر میرے کاموں میں پتہ نہیں ہڑ بونگ اور افراتفری کی سی صورت

کیوں چھائی رہتی ہے؟ پاکستانی ایمبیسی جانے کا فیصلہ اچانک تھا۔ صُبح اٹھنے کے بعد آج کہاں کہاں جانا ہے؟ اور کیا کچھ دیکھنا ہے جیسی کسی سوچ کے ساتھ سفارت خانے کا کوئی خیال تک نہیں تھا۔

دراصل پاکستان میں ان دنوں اخبارات شام میں پاکستانی سکول اور سفیر صاحب کی اپنے اہل خانہ کی تقرریوں اور مالی معاملات میں بے ضابطگیوں کی رپورٹیں دھڑا دھڑ چھاپ رہے تھے۔ اردو ڈائجسٹ کے الطاف حسن قریشی سے اتفاقاً کسی ملاقات میں میری شام جانے پر بات ہوئی۔ انہوں نے اس ایشو پر بات کرتے ہوئے معاملے کی چھان پھٹک کرنے اور اردو ڈائجسٹ کے لئے مضمون لکھنے کی بات کردی کہ چلو قارئین تک صحیح صورت تو سامنے آئے۔

روضہ مبارک سے باہر نکلنے کے ساتھ ہی دماغ میں یہ خیال آ گُھسا اور میں نے فوراً اسی مہم جوئی سے ابتدا کرنے کا سوچا۔

چلو خیر چھوڑو کہہ کر میں سکون سے گرد و پیش کے جائزے میں مصروف ہوگئی۔ ڈرائیور نوجوان سا لڑکا تھا۔ میری درخواست پر راستوں کے بارے بتاتے جاؤ۔ وہ بولنے لگا۔

شاہراہ بیلا۔ صورت سے متوسط طبقے کا نمائندہ علاقہ تھا۔ تین منزلہ فلیٹ جو خستگی اور کہنگی کا شکار تھے۔ کمروں کی بالکونیوں میں کپڑے سوکھتے اور کہیں کہیں کوئی چہرہ ٹیرس پر کھڑا دکھائی دیتا تھا۔

لڑکے کا نام خسان تھا۔ جس نے پوچھا تھا کہ عربی گیت سمجھ لیتی ہیں۔ ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے کہاں؟ ہمیں تو آپ لوگوں کی بات چیت پر بھی قرآن کا گمان گزرتا ہے۔''

اس نے ٹیپ کا بٹن دبایا۔ گلوکار کا نام بتایا۔ صباح فخری۔ ساتھ ہی یہ بھی پوچھ لیا کہ ''شام کے مشہور شاعر نزار قبانی کا نام کبھی سنا ہے؟''

''نزار قبانی۔''

جیسے برق سی کوند جانے والی بات ہوئی تھی۔ کہیں ہنگامہ ہائے زندگی کے بکھیڑوں میں اُلجھے دل و دماغ کے ایک گوشے میں یہ عظیم شاعر موجود تو تھا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں۔ ستم ہائے روزگار بہت کچھ بھلا دیتے ہیں۔ تاہم پہلی ملاقات، پہلی شناسائی فوراً ہی یاد آ گئی تھی۔

اب جب میں شام کی سیاحت کے لئے آئی ہوں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ واہ کیا حسن اتفاق ہے یہ بھی۔ گیت سے میں نے لطف اُٹھایا تھا۔

میری خاتون میں دوسرے چاہنے والوں کے ساتھ
اپنا مقابلہ نہیں کرتا مگر
اگر دوسرا تمہیں بادل دیتا ہے
تو میں تمہیں بارش دوں گا
اگر وہ تمہیں لالٹین دیتا ہے
میں تمہیں چاند دوں گا
وہ تمہیں اگر شاخیں دیتا ہے
تو میں تمہیں درخت دوں گا
اگر وہ تمہیں بحری جہاز دیتا ہے
تو میں تمہیں سفروں پر لے جاؤں گا

گیت کی مجھے سمجھ تو کچھ نہیں آئی۔لڑکا کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اور انگریزی بھی بس دال دلیے جیسی ہی تھی۔اُس نے کیا بتانا تھا؟ تاہم ایک عجیب سی خوشی میرے انگ انگ میں دوڑ رہی تھی۔جیسے کسی اجنبی جگہ پر کوئی اپنا بہت اپنا مل جائے۔بعد کے دنوں نے مطلب سمجھایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ شاعر تو شامیوں کے قلب وجگر میں سمایا، ہر ٹیکسی میں گھسا بیٹھا ہے۔

لڑکے کی نشاندہی پر میں نے زیتون کے باغ دیکھے۔کیسے پیڑ تھے؟ ٹھگنے سے۔دھول مٹی سے اٹے ہوئے۔کفرسوسے Kafr Sousah کا علاقہ بھی لڑکے کی نشاندہی پر دیکھا۔

دھوپ میں تیزی بھی تھی اور گرمی بھی۔تاہم قابل برداشت تھی۔شہر پہاڑیوں پر پھیلا ہوا بڑا ہی خوبصورت نظر آیا تھا۔اور اس تاثر کو بھی نمایاں کرتا تھا کہ جیسے دنیا سے، جہاں سے الگ تھلگ ہو۔کٹا ہوا ہو۔صحرائی زندگی کی ایسی خوبصورت جھلکیاں نظر آئی تھیں کہ بے اختیار اُن سبھوں کو دعا دی تھی جنہوں

نے مشورہ دیا تھا کہ شام کو دیکھنے جاؤ۔ اِن میں سرفہرست میرا بیٹا غضنفر تھا جو شام کے گن گاتے نہ تھکتا تھا۔اور کچھ ایسا ہی حال شیریں مسعود کا تھا۔جس کا کہنا تھا کہ یہ ملک سیاحوں کی جنت ہے۔ یہ ملک تہذیبوں اور تاریخ کا دل ہے۔ یہ ملک جہاں ہماری محبوب شخصیت تجارتی قافلوں کے ساتھ آتی تھی اور اس کے شہروں میں قیام کرتی تھی۔

گاڑی خوبصورت شاہراہوں پر بھاگی جاتی تھی ۔ پورٹ سید Said سٹریٹ، الحجاز سٹریٹ، ال باساAl-Bahsa سٹریٹ۔ کیا چوراہے تھے۔ کیا شاندار کاروباری عمارتوں کے سلسلے تھے۔ ہوٹل، ریسٹورنٹ، گاڑی موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے کیسے دلآویز منظروں سے میری آنکھوں کو سیراب کر رہی تھی۔ کھجوروں کے بلندوبالا درخت، چھوٹی قامت کے بوٹے نما پیڑ، پارک، گاڑیوں کی قطاریں، شاپنگ پلازوں کے برآمدوں اور فٹ پاتھوں پر چلتے پھرتے حسین چہرے، کہیں ماڈرن اور کہیں روایتی مقامی لباس میں گھومتے پھرتے نظر آتے اور نظروں کو لُبھاتے تھے۔سوق سوروجہ سلام سکول اور مختلف مساجد لڑکے کی نشاندہی پر ہی دیکھے۔ زینوبیہ پارک سے ملحق ابورحمانیہ سٹریٹ کا سارا علاقہ سفارت خانوں سے بھرا ہوا تھا۔لڑکا چکر پر چکر کاٹ رہا تھا۔

''کسی سے پوچھو بچے۔''

لڑکے نے گاڑی روکی۔ کسی سے بات کی۔ کچھ سمجھا اور چلا۔

مزہ کے علاقے میں داخل ہوا۔

سفارت خانے کی سڑک کوئی خوبصورت تھی۔صنوبر کے درختوں سے گھری دومنزلہ کلاسیکل عمارتوں سے چمکتی ہوئی۔ سڑک تھوڑی سی ڈھلانی بھی تھی۔ گو زیادہ کشادہ نہ تھی۔ تاہم ایک فسوں خیز سا حُسن ضرور اس کی صورت پر بکھرا ہوا تھا۔

ہاں منزل پر پہنچنے سے پہلے اسلام آباد کے آصف نامی نوجوان سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ جب ایمبیسیکی تلاش میں ہماری سڑکوں کی خواری ہو رہی تھی۔ مجھے ایک نوجوان نظر آیا۔ چال ڈھال اور وضع قطع سے اپنا وطنی لگا تھا۔ٹیکسی رکوا کر میں اُتری اور اُس سے متعارف ہوئی۔ وہ پاکستانی ہی نہ تھا بلکہ

اُس سکول میں بھی پڑھا تا تھا جس کے بارے میں جاننے کے لئے میں ایمبیسی کی تلاش میں خجل ہو رہی تھی۔ خیر محل وقوع سے تو آ گاہی ہو گئی کہ عمارت اگلی لین میں ہے۔

ہاں مسئلے بارے اس نے بتایا کہ خبریں تو سو فی صد درست ہیں۔ قابل ذکر لوگ سفیر صاحب اور کچھ کم کونسلر صاحب کہ جن کے رشتہ دار اور سکے سودہرے (عزیز) دمشق میں آ دھمکے ہیں۔ پرانے اور تجربہ کار لوگوں کو ہٹا ہٹا کر انہیں بھرتی کیا گیا ہے۔ اور بھی بہتیرے چکر اور گھپلے ہیں۔

اسکول دمشق کے مضافات کے بڑے خوبصورت علاقے یفور Yafour میں ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا۔

''کوئی اٹھارہ بیس کلومیٹر فاصلہ ہوگا۔ اسکول بہت بڑا۔ بہترین عمارت اور بھاری سٹاف پر مشتمل جہاں کوئی ہزار کے قریب طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ تاہم اُس نے اپنا نام مخفی رکھنے کا بھی کہا۔ میں نے ڈرائیور کو بتایا اور اس نے مجھے اگلی لین میں اُتار دیا۔ ایمبیسی کی عمارت کی شان وشوکت زیادہ نہ تھی۔ کسی کا گھر جان پڑتا تھا۔

ریسپشن پر جو عورت نما لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اُس کا حُسن اور موٹاپا دونوں اوج کمال پر تھے۔ اُس نے میری آمد کا مدّعا جان کر مجھے آگے دھکیل دیا۔ کمرہ تو یہ چھوٹا سا تھا مگر اتنا ٹھنڈا تھا کہ کرسی پر بیٹھنے اور متوقع نظروں سے مجھے گھورتے اُس طوطے کی سی ناک اور سانپ کی سی چمک والے مرد سے کوئی بات کرنے کی بجائے میں جن قدموں سے اندر آئی تھی اُس سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے باہر نکل گئی تھی۔

شام بتیس (32) تینتیس (33) ڈگری ٹمپریچر پر تھا۔ ٹیکسی میں اے سی نہیں تھا۔ میں صحرائی بلبھے کھاتی آئی تھی۔ یکدم اس فریج میں گھسنا اور پھر یہاں سے نکل کر دوبارہ اسی تنور میں گرنا تو نری بیماری کو دعوت دینا تھی۔ کوئی گھر ہوتا تو بندہ یہ ایکٹو یٹی کر بھی لیتا۔ پردیس میں بھلا کون ایسا فیاض میزبان بننا پسند کرتا ہے۔ ایک بار اور یہی تماشا اُسے دکھا کر تیسری بار اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی۔ اُس کی حیرت زدہ مکار سی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے کتنے رنگ تھے۔ میں اُن میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

''تم مجھے دمشق میں تو نہیں سائبیریا کے کسی کمرے میں بیٹھے لگتے ہو۔ باہر گرمی سے آنے

والوں کو بیمار کرنا تمہارا مقصد ہے؟''

وہ شاید میرے تماشے سے پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ فوراً آنے کی غرض وغایت اور مدّعا جاننے کے درپے ہوا۔ ظاہر ہے میں کسی ذاتی غرض یا پریشانی کے کارن تو یہاں آئی نہیں تھی۔ ایک معتبر پرچے کے لئے قومی سطح پر اٹھنے والے ایک ایشو پر گہرائی (تحقیق) کرنی مقصود تھی جس کا اخبارات میں بڑا چرچا تھا۔

میں نے انتہائی شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے نپے تلے اور عام سے لہجے میں بتایا کہ عراق پر لکھنا تھا۔ عراق چونکہ ابھی تک حالت جنگ اور امریکی تسلط میں ہے اس لئے زیارتی قافلے کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔ بیچ کی ساری باتیں چونکہ بڑی ذاتی تھیں کہ بچے نہیں مان رہے تھے، شوہر کو اعتراض تھا، گول کر گئی۔

''تو یوں کہیے نا کہ زیارات پر آئی ہیں۔ تو جائیے زیارتیں کریں۔ یہاں آپ کا کیا کام؟''

لہجے میں اتنی حقارت اور طنز بھرا ہوا تھا کہ مجھ سے تو برداشت ہی نہ ہوسکا۔

''تمہارے کھوپڑے میں یہ بات نہیں آئی کہ میں لکھنے والی ہوں۔ تم لوگوں نے جواَن نیر مچایا ہوا ہے۔ اس کی ملک میں بڑی دھومیں ہیں خیر سے۔ میں چونکہ ادھر آ رہی تھی اس لئے مجھے یہ فریضہ سونپا گیا کہ کچھ کچا چٹھا تو جانوں تمہارا۔''

''اپنا کارڈ دکھائیں۔'' لہجے میں وہی تناؤ اور اکڑ تھی۔

میں صدا کی بونگی کارڈ بنوانے، رکھنے اور اُسے پیش کرنے کے جھنجھٹ سے لاپرواہ اب خود کو کوستی، لعن طعن کرتی اپنے آپ سے کہتی تھی کہ کچھ نہ کچھ پاس ہونا چاہیے تھا۔ سوچا اب معذرت خواہانہ رویہ ہرگز درست نہیں۔ سر جھکا کر بیگ میں یونہی پھولا پھرولی کی کوشش، اِدھر اُدھر ہاتھ پلّا مارنے کی حرکات چغلی تو کھاتی تھیں۔ وہ بھی کونسا کاکا چوچا تھا۔ کمزوری بھانپ گیا۔ میری بے نیازانہ سی معذرت پر بھڑک ہی تو اٹھا تھا۔

''یونہی منہ اٹھائے چلی آئی ہیں۔ جانتے ہیں ہم سب۔ اٹھیے اور جائیے اپنا راستہ ناپیں۔''

اس درجہ تذلیل پر میرے بھی تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔تنتناتے ہوئے چلّائی۔

''تم ہوتے کون ہو کارڈ مانگنے والے؟ ٹھیک واویلا ہو رہا ہے ملک میں۔اپنے اپنے حصوں کے کمیشنوں کی بندر بانٹ میں دلالوں والا کردار ادا کر رہے ہو۔تمہارا کام مجھے آگے پہنچانا ہے نہ کہ اس درجہ توہین آمیز انداز میں ایسے فضول اور گھٹیا سوال۔تمہارے یہی انداز تمہاری کرتوتوں کی چغلیاں کھا رہے ہیں۔بندہ سادھ ہو تو اُسے ڈر کس بات کا؟'' یہ سب لتاڑ میں نے انگریزی میں دی کہ میرے خیال میں لتاڑ کا یہ موثر ترین ہتھیار ہے۔ایک انگریزی اوپر سے میرا سنگھ (گلا) لاؤڈ سپیکر جیسا۔آواز نے اندر والوں کو بھی چوکنا کر دیا تھا۔

''بھیجو اندر۔کون ہے یہ بدبخت؟''

ایک چھوڑ دو دو بندے باادب باملاحظہ جیسی صورت لئے میرے سر پر آسوار ہوئے۔

مناسب سی کشادگی والے آنگن سے ہوتی ہوئی ایک راہداری میں اُتری۔چھوٹے سے ایک کمرے سے گزر کر اگلے کمرے میں داخلہ ہوا۔سامنے کرسی پر ایک صحت مند پچاس پچپن کے پیٹے میں گورا چٹا مرد، نام اب بھول گئی ہوں شاید رئیسانی تھا یا کچھ ایسا ہی بیٹھا ہوا مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھتا تھا۔یہ یقیناً سفیر صاحب تھے۔اُس کے عین بالمقابل کرسی پر ایک گہرے سانولے رنگ کا سڑیل سا نوجوان بیٹھا تھا۔دونوں میں ہزایکسی لینسی والے جراثیم پوری توانائی سے پلے ہوئے تھے۔

میں نے بیٹھنے کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے اپنے آنے کا مدّعا بتایا۔سفیر صاحب تو شاید کچھ گومگو کی سی کیفیت میں تھے مگر وہ سڑیل بینگنی رنگت والا کونسلر نخوت سے بولا۔

''کارڈ دکھایئے۔''

''بنیادی طور پر تو میں ادیب ہوں۔اخبارات اور رسائل میں لکھنا میرا فری لانسنگ میں جاتا ہے۔کارڈ کے لئے میں تردّد میں کبھی نہیں پڑی۔''

''پہچان کا، اپنی شناخت کا کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

اب سچی بات ہے دل میں خود کو کوس رہی ہوں کہ ساری عمر ایسے ہی بے ڈھنگے کاموں میں

گزار دی۔ بات تو اُن کی ٹھیک ۔مگر اب جھکنا یا پسپائی کا سا انداز دکھانا یا لب و لہجے سے شکست خوردگی کے سے اظہار کو نمایاں کرنا تو قطعی درست نہ تھا۔ اتنی پھوتیں مارتی اب موت کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاؤں یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

''میں نے آنے کے ساتھ واضح کیا ہے کہ میری ترجیحات صرف عراق سے تھیں۔شام یا اس واقعے سے متعلق کچھ جاننا یا لکھنا میرے پروگرام کا حصہ نہیں تھا۔ یہ ڈیوٹی تو مجھے سونپی گئی کہ جا رہی ہو تو ذرا یہ کام بھی کر لینا۔''

سفیر صاحب بولے۔

''مگر کوئی ثبوت تو آپ کے پاس ہونا چاہیے۔''

اب مجھے غصہ آیا۔ میں کھڑی ہو گئی۔

''ایک سفارت کار کی تجربہ کار آنکھ اور دماغ میں اس پائے کی ذہانت، ہوشیاری اور ادراک کا شعور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطب کے چہرے مہرے، اس کی گفتگو کے اندر اتر کر اس کے باطن کا جائزہ لے سکے کہ مخاطب کتنے پانی میں ہے؟ کتنا جھوٹا اور کتنا سچا نظر آتا ہے؟ رنگا رنگ لوگوں کو ڈیل کرتے ہوئے اگر یہ صلاحیت بھی نہیں آئی تو معذرت کے ساتھ یہاں بیٹھے جھک مار رہے ہیں۔آج کی مصروف زندگی میں کس کے پاس اتنا وقت اور پیسہ ہے کہ وہ اسے یوں ضائع کرتا پھرے۔

جناب والا یعفور یہاں سے صرف بیس کلومیٹر ہے۔ مجھے تو وہاں بھی جانا ہے۔آپ کے پاس آنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا تھا کہ آپ کی بھی سن لوں کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ حالات کیا ہیں؟ تصویر تو پوری سچائی سے سامنے آہی جائے گی جب با قاعدہ کھوج ہو گا۔آخر ہر بڑے چھوٹے اخبار میں یہ ایشو روز زیر بحث ہے تو تھوڑی بہت حقیقت تو ہو گی اس میں۔''

خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے اپنی راہ ناپنی چاہی۔ جب اسی نخوت زدہ نوجوان نے کھڑے ہو کر روکنا چاہا۔مگر میں نے رُکنا پسند نہ کیا۔

''لعنت بھیجو۔ ذلیل لوگ۔ چور نالے چتر۔''

باہر نکل کر سڑک پر آئی۔ بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ والی بات ہوئی تھی۔
اب میں بڑبڑ کرتے خود کو گویا سناتے ہوئے چلی جا رہی ہوں۔

''مضمون لکھنا اور لوگوں کو حالات سے مطلع کرنا ہے۔ واہ میاں واہ۔ چوروں کی دلّالی میں منہ کالا یقیناً اسی کو کہتے ہیں یہاں نیچے سے اوپر تک چور چھوڑ ڈاکو اور لٹیرے بیٹھے ہیں۔ روز مار دھاڑ کے سے انداز میں ٹی وی اور اخباروں میں چلاّ چلّی ہوتی ہے۔ کتنا اثر ہوتا ہے؟ کتنی اصلاح ہوئی؟ ککھ تے سواہ۔ جو کام کرنا ہے کرو اور اپنا راستہ ناپو۔''

سڑک پر بڑی ویرانی سی تھی۔ کوئی بندہ نظر نہیں آیا تھا کہ جس سے پرانے شہر کا پوچھتی۔ درختوں کی چھدری چھاؤں میں چلنا شروع کیا۔ تو کچھ آگے جا کر چوک آیا۔ سوچا کہ پہلے ٹورزم والوں کے دفتر جاؤں۔ کوئی کتابچہ، کوئی پمفلٹ، کوئی نقشہ کچھ تو ہاتھ آئے۔

جس سے پوچھا وہ بظاہر بڑا سمجھ دار سا لگتا تھا۔ اُس نے ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔ اُسے کچھ سمجھایا۔ مجھ سے پینتیس (35) لیرا دینے کا کہتے ہوئے بتایا کہ یہ آپ کو مطلوبہ جگہ لے جائے گا۔

یہ موسیٰ بن نصیر روڈ تھی۔ یہیں قریب ہی دمشق یونیورسٹی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے بتانے پر مجھے فوراً ڈاکٹر زخرف یاد آئی تھیں۔ اُن کی دعوت کا بھی خیال آیا تھا۔ چلو دیکھوں گی۔ خود سے کہتے ہوئے میں باہر دیکھنے لگی تھی۔

سڑکیں خوبصورت، بلند و بالا عمارتیں، فٹ پاتھوں اور عمارتوں کے اندر باہر آتے جاتے حسین اور صحت مند لوگ۔ دلکش بکھری ہوئی دھوپ اور شام سے متعلق کہانیاں۔

یہ بھی کیا ملک تھا؟ روم کے سیزروں اور کسریٰ ایران کی حریص نگاہوں کا مرکز نظر۔ دنیا کے قدیم ترین مذاہب اور تہذیبوں کا امین۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سامان تجارت کے ساتھ اسی شہر میں تو آتے تھے۔ مدینہ منورہ کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بننے والا مسلمانوں کا دوسرا دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل کرنے والا۔ اسلامی اور عرب تہذیب و تمدن کا گہوارہ۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکی اور اس کے اندر جانے کا کہا۔ جب

اس کے اندر داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ تو امپورٹ ایکسپورٹ کا مرکز ہے۔ سڑک پار کچھ فاصلے پر مطلوبہ جگہ کی نشان دہی ہوئی ۔ پیدل مارو مار کرتی وہاں پہنچی ۔ لفٹ سے پانچویں منزل تک گئی ۔ اماں نہ پونیاں ۔ کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ یہ دفتر ہے کہاں؟

وہی دفتروں والا ماحول ۔ بڑی ماڈرن لڑکیاں ۔ کھلے گلے کی ٹی شرٹوں اور تنگ جینز میں کسی کسائی، کٹے بالوں اور میک اپ سے لتھڑے چہروں سے کہیں برآمدوں میں بھاگی پھرتی تھیں، کہیں کمروں میں بیٹھی کمپیوٹروں سے اُلجھی نظر آئی تھیں ۔

عبایا پہنے تو میں اکیلی مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شہری بیچاری مسکین بلّی سی یہاں وہاں لڑھکتی دھکے کھاتی پھر رہی تھی ۔ حلیہ تو میں بھی بدل لیتی ۔ پینٹ شرٹ چلو نہ پہنتی پر یہ عبایا کیلینج تو نہ ساتھ لپٹاتی ۔ مگر جن کے ساتھ آئی تھی وہ بڑے روایتی لوگ تھے ۔ صبح سویرے بن سنور کر گلے میں ڈوپٹہ ڈال میرا نکلنا انہیں کھل سکتا تھا ۔ یوں بھی زینبیہ کا ماحول بڑا ڈھکا ڈھکایا تھا ۔

''چلو پرانے دمشق چلتی ہوں ۔''

''پیدل وہاں تک جایا جا سکتا ہے ۔'' کا سُن کر مجھے بغور دیکھا گیا ۔ بڑا ابذلہ سنج قسم کا مرد جان پڑتا تھا ۔ ہونٹ نہیں آنکھیں بولی تھیں ۔ طولے جتنا سر نفی میں ہلا تھا ۔

''ایسا کشٹ مت کاٹیئے ۔ بہتر ہے ٹیکسی میں چلی جایئے ۔''

مجھے اُس کے انداز دید پر غصہ آیا تھا ۔ کتنا فضول اور بونگا ہے ۔

ایک کافی شاپ سے میں نے قہوہ لیا ۔ گھونٹ گھونٹ اُسے پیتے ہوئے میرا فیصلہ تھا کہ اب اِدھر اُدھر کی جُگل خواری ختم ۔ کہیں نہیں بھٹکنا ۔ پرانے دمشق چلنا ہے ۔ وہاں کچھ نہ کچھ مل جائے گا ۔ آخر تو کتابوں کی کوئی دکان ہوگی ہی وہاں ۔

مگر جس کے ہتھے چڑھی اس کی انگریزی گو بہتے پانی جیسی ضرور تھی مگر ذہنیت اور تربیت خالصتاً کاروباری اور تاجرانہ سی تھی ۔ میں کتابوں کی دکان کا پوچھ بیٹھی ۔ اُس نے فوراً کہا ۔

''شہدا اسکوائر سے نقشے کتابچے، کتابیں اور جو کچھ بھی آپ چاہتی ہیں سب کچھ مل جائے گا ۔''

یوں اس نے پرانے دمشق کے طے کردہ کرائے میں مجھے نسبتاً قریب کی جگہ پر اُتارتے ہوئے اپنا پیٹرول ضرور بچایا مگر وقت نہیں۔

''لیجئے۔''

پارکنگ ایریا میں ٹیکسی روک کر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اپنے سامنے بکھرے خوبصورت منظروں کی حامل جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہدا چوک۔مقامی طور پر اِسے ال مرجاہ Al-Merjah sq بھی کہتے ہیں۔تھوڑا سا پس منظر،تھوڑی سی تاریخ،تھوڑا سا اِس علاقے بارے سُننا چاہیں گی'' اُس نے پوچھا تھا۔

''ارے کیوں نہیں۔یہ تو احسان ہوگا۔مگر پہلے ایک بات تو بتاؤ یہاں سیاسی پارٹیاں کیوں نہیں؟''

لڑکا ہنسا۔طائرانہ سی نظر گردوپیش پر ڈالی۔پھر آہستگی سے بولا۔

''ڈنڈہ۔سادہ کپڑوں میں ملبوس خفیہ پولیس کے بندے آپ کی گردن ہمہ وقت دبوچنے کو تیار۔اگر آپ نے حکومت کے خلاف کوئی بات کی۔کہیں کسی جگہ اکٹھے ہوئے تو پھر آپ کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ میرا خیال نہیں کہ آپ میری بات کی تہہ تک نہ پہنچی ہوں۔

عام لوگوں کی سوچ کیا ہے؟ غریب کو جینے کے لالے۔امیر بہت امیر۔انقلاب کی ضرورت ہے۔میں گریجوایٹ ہوں۔سرکاری نوکری کے لئے ایک لاکھ سیرین پاؤنڈ چاہئیں۔رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''ہائے میرے اللہ۔میرے بچے یہ تو مجھے گھر سے گھر تک کی داستان سنا رہے ہو۔''

لڑکے نے اپنا کارڈ دیا۔مختصراً علاقے کے بارے بتایا اور چلا گیا۔

شہدا چوک کی یہ جگہ اور اس کے اردگرد کا سرسبز علاقہ تو کبھی گھوڑوں کی چراگاہیں اور تربیت گاہیں تھیں۔1916ء کی بات ہے کہ عرب قوم پرست جو عثمانی سلطنت اور اُس کے غلبے کے خلاف بغاوت پر اُترے ہوئے تھے وہ پکڑے گئے۔عثمانی فوج کے کمانڈر جمال پاشا نے یہیں انہیں پھانسی پر لٹکا

دیا۔

میں نے باہر کی رونقوں کو دیکھا تھا۔ سرسبز کھیتوں اور چراگاہوں کا وقت، زمانے اور آبادی کے بہاؤ کے سامنے کہاں تک بند باندھ سکتا تھا۔ اِن ہریالیوں نے تو کٹنا مرنا ہی تھا۔ میدانوں کی وسعت اور کشادگی نے سیمنٹ سریوں کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی ڈالنے تھے۔ پر یہ عرب قومیت کے شوشے تو نرے مغربی ملکوں کے عثمانی سلطنت کو توڑنے کی سازشیں تھیں۔ کیا کیا خواب نہیں دکھائے گئے اِن عربوں کو۔ شریف مکہ کا کردار کیسا لعنتی تھا۔ علامہ تو کہہ کر فارغ ہو گئے تھے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تب سے اب تک خون تو دھڑا دھڑ اِس مسلم اُمّہ کا بہہ رہا ہے۔ رات اتنی گہری اور تاریک ہو گئی ہے کہ سحر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے۔

چوک کے مرکز میں کانسی کے Pole کو جس کی چوٹی پر استنبول کے یزدی محل کا ماڈل سجا ہوا ہے میں نے لڑکے کی نشان دہی پر دیکھا تھا۔

شدید بھوک کا احساس تھا۔ ڈھابہ نما ریسٹورنٹ سے دو فرائیڈ بالز خریدے۔ سلاد اور کولاٹن پیک لیا۔ مسجد تلاش کی۔ مسجدوں میں عورتوں کے لئے مخصوص حصوں کا علم مجھے مصر کی سیاحت کے دوران ہوا تھا۔ یہ عبادت کے ساتھ ساتھ عورتوں کے ریٹائرنگ روم بھی ہیں۔ سو قریبی مسجد میں گئی اور خوش ہوئی۔ خوشگوار سے ماحول میں سہ پہر کا تھوڑا سا وقت گزارنا کہ وہ ڈھل کر خوشگوار شام میں تبدیل ہو جائے بہت بڑی نعمت اور عیاشی تھی۔ نماز پڑھی۔ فرائڈ بالز کھائے۔ یہ ہمارے ہاں کے قیمہ بھرے سموسوں جیسے ہی تھے۔ بس صورت ذرا بڑی تھی۔ تھوڑے سے آرام نے تازگی اور سکون دیا۔

وہ شام جو المرجع سکوائر Al-Marjeh Sq میں وقت گزارنے کے لئے مجھے نصیب ہوئی کیسی خوبصورت تھی؟ پرانے دمشق کا پروگرام کل پر ملتوی کرتے ہوئے آج کی شام یہاں گزارنے کے فیصلے نے مجھے اطمینان اور یکسوئی سے چیزوں کو ماحول کی طرف متوجہ کیا۔ بلند و بالا عمارتوں کے حصار میں

گھرا یہ سکوائر جہاں نہر کا پانی پلوں کے نیچے سے گزرتا تھا۔اس نہر پر بنی ریلنگ سے جھک کر پانیوں کو دیکھتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

جی اِس سارے منظر پر نثار ہونے کو چاہتا ہے۔کجھور کے درختوں کا بانکپن اور گھاس کے قطعوں کے پیچ وخم کا حُسن ، پھولوں سے بھری گرین بیلٹ،چنبیلی کے بوٹوں سے پھوٹتی مہکتی خوشبو جو کہیں مجھے مانوسیت سے جوڑے جاتی ہے،دائیں بائیں پھیلےعظیم الشان عمارات کے سلسلے کیسے دلربا سے نظر آتے ہیں۔سامنے والی عظیم الشان عمارت کا بڑا سا داخلی گلیارہ اپنے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔

میں نے اس کی دعوت کو قبول کر لی ہے۔تاہم اُس سے یہ بھی کہا ہے۔

''ارے بھئی گھبراتے کیوں ہو؟ بھلا تمہیں دیکھنے،تم سے ملنے کیوں نہیں آؤں گی؟ضرور آؤں گی۔بس ذرا دم لو۔ابھی یہاں کی پیاس تو بُجھنے دو۔دیکھو نا میں اسطرف آئی ہوں اور گم سم کھڑی ہوگئی ہوں۔ اس وقت دھوپ ماند پڑرہی ہے۔ماحول کلاسیکل رعنائی کے سحر میں پور پور لُتھڑا پڑا ہے۔میں مسرت سے لبریز، چاہت سے بھری پری اور شوق وتجسّس سے چمکتی آنکھوں کو دائیں بائیں گھماتے پھراتے کیسی سرشاری سی محسوس کرتی ہوں۔

تم چونکہ اِن نظاروں، اِن منظروں کے مالک اور امین ہو۔تمہارے لئے تو یہ گھر کی مرغی دال برابر جیسی بات ہے۔ پر میرے لئے فضا پر تنے ملگجے چمکتے آسمان پر کبوتروں کی ڈاروں اور کہیں نیچے اُترتے اور کہیں اوپر کی جانب اڑتے دیکھنا بھی کِس قدر رومانوی اور طلسمی منظر ہے۔سینکڑوں کبوتر زمین پر بکھرے دانے چگتے اور اٹھکھیلیاں کرتے دل کو لبھاتے ہیں۔''

مجھے چائے کی طلب ہے۔قہوہ خانے کے دروازے پر کھڑی ہوں۔خوشبوئیں اڑاتے قہوے نے بے حال کر دیا ہے۔ یہ خوشبو مجھے ہمیشہ سے پاگل کرتی ہے۔دودھ کے بغیر قہوہ۔چینی ڈال کر میٹھا کر لیا ہے۔

اب یہاں بیٹھی اِس خوبصورت کلاسیکل شہر کے منظروں میں گم لطف اٹھا رہی ہوں۔چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کی چسکیاں لے رہی ہوں۔اور نہیں جانتی ہوں کہ سالوں بعد جب اس پر لکھنے بیٹھوں گی

تو لکھتے لکھتے ٹپ ٹپ آنسو دامن پر گریں گے اور دل کو کوئی جیسے مٹھی میں بھینچے گا اور کہے گا۔شامیوں تم نے جبر اور ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔تم نے آزادی کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کے لئے تلوار اٹھائی۔مگر تم ہار گئے۔شاید تم نے ظالم دنیا کی اُس سفا کی کا سوچا ہی نہ تھا۔جو تمہارے ساتھ برتی گئی۔شاید تم بھول گئے تھے کہ آزادی کو ڈھیروں ڈھیر خون اور جانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ ننگی ہوتی ہے۔جب تم اسے حاصل کرتے ہو تو یہ شاندار لباس پہنتی ہے۔افسوس تم اسے آزادی کی زریں پوشاک نہ پہنا سکے۔دیکھو تو تمہاری ایک جیالی شاعرہ میرم ال مرسی نے کیسے اس کی ترجمانی کی ہے۔یہ اس کی ''آزادی جو برہنہ آتی ہے'' خوبصورت،شہرہ آفاق نظم ہے۔ذرا دیکھئے تو۔

برہنہ آنے والی کا نام ہے
آزادی
شام کے پہاڑوں کی چوٹیوں
اس کے ساحلوں
اس کے مہاجر کیمپوں میں
کہیں
اس کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ جاتے ہیں
کہیں آبلوں سے بھر جاتے ہیں
یخ ٹھنڈ سے
گہرے تشدد سے
لیکن وہ مارچ کرتی چلتی جاتی ہے۔چلی جاتی ہے
وہ اندر آتی ہے
اس کے بچے بازوؤں سے چمٹے ہوئے ہیں
کہیں گرتے ہیں جب وہ آگے بڑھتی ہے

وہ مارے جاتے ہیں

وہ چلّاتی ہے۔ بین ڈالتی ہے

لیکن پھر بھی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے

اس کے پاؤں زخمی ہیں

لیکن وہ بڑھتی چلی جاتی ہے

اس کا گلا پھٹ جاتا ہے

لیکن وہ گاتے ہوئے چلتی جاتی ہے

اس کے درخت کٹ جاتے ہیں

اس کے دریاؤں میں سیلاب ہے

خون کا

اس کی بہار کو قتل کر دیا جاتا ہے

اور اب گرمی

نوحہ خوان ہے

لیکن وہ تو مارچ کرتی چلی جاتی ہے

اس کا یہ مارچ کب تک جاری رہے گا۔تمہارے عزائم اور ولولے۔کب تک اسے خون دیتے رہیں گے۔خدا تمہاری ہمتوں کو سلامت اور توانا رکھے۔میرے پاس دعاؤں کے اس تحفے کے سوا اور ہے ہی کیا۔

☆☆☆

باب نمبر۴:

دمشق سیٹیڈل اور زکریا محمد کبرت کا گھر

- پرانے دمشق کی خان سرائیں، مسجدیں، مقبرے، اشبیلیہ فوّارے، گرجا گھر سب ایک تحیر کی دنیا کھولتے ہیں۔ اس کی فسوں خیزیاں آپ کو اپنے سحر میں جکڑ کر رکھ لیتی ہیں۔
- حمیدیہ بازار کی مختلف گلیاں، مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، مذاہب اور زبانوں کی نمائندہ نظر آتی ہیں۔
- احتجاجیوں کے ایک پرامن گروپ پر فائرنگ اور جیل بندی نے دراصل ''درا'' جیسے واقعے کو جنم دے کر اِس جنگ کا راستہ ہموار کیا تھا۔

دمشق جسے رومن شہنشاہ جولین Julian نے مشرق کی آنکھ کہا۔ تین ہزار قبل مسیح کا یہ شہر جو دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ کبھی یونانیوں، کبھی رومیوں، کبھی بازنطینیوں کا مرکز نگاہ۔ دریائے برادہ Barada کا عرب دنیا کو ایک خوبصورت تحفہ، سلطنت امیہ کی راجدھانی، مسلمان خلفاء کی عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں سے بھرے پرے مخلوط معاشرے میں رواداری اور بلند ظرفی کی خوشبو دیتا ایک شہر بے مثال۔

اس کے بدن پر کتنی تہذیبوں کے نقش کھدے ہوئے ہیں۔ ان دیواروں میں بنے دروازے، مینار، مدرسے، اس کے تنگ گلی کوچے، ان میں قدامت کا حُسن سنبھالے عالیشان مکان ہیں۔ ایک جانب تعمیراتی حُسن، دوسری جانب ان کے مکینوں کی دریا دلی اور وقار کی کہانیاں اِن درودیواروں پر

بکھری ہوئی ہیں۔ یہاں کی خان سرائیں، مسجدیں، مقبرے، اشبیلیہ فوارے، گرجا گھر سب ایک تحیّر کی دنیا کھولتے ہیں۔ اس کی فسوں خیزیاں آپ کو اپنے سحر میں جکڑ کر رکھ لیتی ہیں اور آپ اپنی بصارتوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے جب ٹیکسی روک کر مجھے سٹریٹ التوارا Al-Thawra جو ایک طرح ماڈرن انتظامی کواٹرز کو پرانے دمشق سے الگ کرتی ہے پر عین مدحت پاشا سکوائر کے سامنے اُتارا اور کہا۔

''دیوار کے ساتھ ساتھ آپ کو اندر جانا ہے۔ یہ دمشق سٹیڈل Citadial کا علاقہ ہے۔''

میں نے رک کر اپنے دائیں بائیں اور سامنے دیکھا۔ بلند و بالا اور قابل توجہ موٹائی لئے قلعہ نما دیوار میری نگاہ کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی تھی۔ دمشق قلعہ کی یہ دیواریں اپنے اندر عظمتوں کی صدیوں پرانی داستانیں لیئے ہوئے ہیں۔

میری سوچیں تھیں کہ اڑانیں بھر رہی تھیں اور میں تھی کہ اُن کے ساتھ ساتھ محو پرواز تھی کہ مجھے محسوس ہوا ٹیکسی ڈرائیور لڑکا مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ متوجہ ہوئی۔ اس نے گائیڈ کا پوچھا تھا۔ میں مسکرائی۔

''نہیں میرے بچے پرانے دمشق کی یہ تصویر مجھے اکیلے اور اپنی مرضی سے دیکھنی ہے۔ ہاں اگر تمہارا کوئی رابطہ نمبر ہے تو وہ دے دو۔''

لڑکے نے اپنا کارڈ مجھے دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ ماہر ڈرائیور ہونے کے ساتھ اچھا گائیڈ بھی ہے۔ دمشق کے مضافات یا حلب اور حمص کا پروگرام ہو تو اس کی خدمات حاضر ہیں۔

اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کارڈ پرس میں سنبھالا اور کہا۔

''یہ تو تمہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑے سے وقت میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ ہاں دونوں جگہیں دیکھنے کا پروگرام تو ہے۔ فون کروں گی انشاء اللہ۔''

دراصل نسرین کو رات جب میں نے اپنی آوارہ گردی کی داستان سنائی اُس نے بے اختیار ہی

کہا تھا۔

''جو جگہیں یہ قافلے والے دکھا دیں وہ تو چلو ان کے ساتھ ہوئیں۔مگر بقیہ میں سے کچھ اہم کے لئیے تم مجھے بھی اپنے ساتھ نتّھی کر لینا۔''

خوشی بھی ہوئی اور مطمئن بھی کہ چلو ایک اکیلا اور دو گیارہ۔کوئی ساتھ دے۔ بھلا اس سے اچھی بات کیا؟

لڑکے کو خدا حافظ کہہ کر میں قریب ہی اُس بے حد جیالے، دلیر، جی دار صلاح الدین ایوبی کے مجسمے کے پاس آ گئی۔ میری کیا ساری دنیا کے مسلمانوں کی بے حد پسندیدہ اور محبوب شخصیت صلاح الدین ایوبی اپنی ساری زندگی کی طرح اِس گھوڑے کی بھی ننگی پیٹھ پر بیٹھا باگ ہاتھ میں تھامے جیسے اُسے اڑائے لئے جا رہا ہو۔ظاہر ہے اُسے دیکھ کر مجھے رکنا ہی تھا۔اُسے یاد کرنا تھا۔اُس سے باتیں کرنا تھیں۔

تکریت (عراق) میں پیدا ہونے والا صلیبی جنگوں کا یہ ہیرو تاریخ میں فاتح ہی نہیں اپنے کردار کی ان گنت خوبیوں سے بھی باعث افتخار ہے۔اس کے مجسمے کو دیکھتی، اس کے ساتھیوں کو تکتی، ان کے خدوخال پرغور کرتی اور اُسے خراج تحسین پیش کرتی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔

میرے دائیں ہاتھ زرد رنگ کی بلند و بالا تاریخی دیوار اور اس میں بنے سات دروازے ایک تاریخ رکھتے ہیں۔

چوکور پتھروں کی گلیوں میں سے گزرتے، اس کے متعدد رُخ کہ ایک جانب سورج کی کرنوں میں نہاتی اپنے زردی رنگ میں ڈوبی اپنی دیواروں میں جا بجا تیر اندازی کے لئے بنائے ہوئے سوراخوں، اپنی کہنگی میں عظمت کا ایک رچاؤ اور گھمبیر تا لئے یہ فصیل کیسی کیسی کہانیوں کی امین تھی۔

دراصل میرے بچپن کی کتاب کھل گئی تھی۔دمشق کے متعلق کہانیاں جن کی فسوں خیزی مجھے دنوں اپنے اندر جذب رکھتی تھیں۔اب مجھے ایک کے بعد ایک یاد آ رہی تھیں۔کیسے وقت اور زمانے تھے۔سیدھے سادھے۔شہروں کو فصیلوں کے حصار میں قید کر لیتے تھے۔اپنے لوگوں کو محفوظ کر دیتے تھے۔

بسم اللہ تو رومنوں نے ہی کی تھی۔تب یہ کسی حد تک مستطیل تھی۔ بڑے بڑے پر پتلے پتھروں سے بنی ہوئی۔انہوں نے دمشق کو قلعہ بند کر دیا تھا۔آنا جانا تو دروازوں سے ہوتا تھا اور دروازے بھی پورے سات۔

یہ سات کا ہندسہ بھی بڑی اساطیری سی روایات کا حامل ہے۔ایک بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں یا سات بیٹے تھے۔قدیم روایات اور مذہبی عقائد نے بھی سات کا ہندسہ خوش بختی کی علامت ٹھہرا دیا۔آسمان بھی سات، زمین بھی سات، کائنات کی تخلیق بھی سات دنوں میں۔یہودیوں کا سبتSabbat بھی ہفتے کے ساتویں دن کہ خدا چھ دن مار کام کر کر کے تھک جاتا ہے۔ساتوں دن اس کے آرام کا دن۔دماغ میں سات سوراخ۔

مرکزی سڑک ،گلیاں اور میدان بازنطینی حکمرانوں نے اِسے خوبصورت شہر بنانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔عمر فاروقؓ کے زمانے میں یہ فتح ہوا۔وہی تاریخ اسلام کے جیالے خالد بن ولید اور اور ابوعبیدہ ابن جراح اسی دیوار کے دو دروازوں باب شرقی اور باب الجابیہ Al Jabiah سے شہر میں داخل ہوئے۔

عباسی خلفاء کی سیاست اپنی جگہ مگر امیوں سے دشمنی اور پرخاش نے اِس شام جیسے ملک اور خصوصی طور پر دمشق کو نہ صرف نظرانداز کیا بلکہ اسے بہت متاثر بھی کیا۔یہ دیوار بھی متاثر ہوئی۔ہاں البتہ نورالدین اور صلاح الدین کے زمانے اِس کے لئیے بہتر رہے۔انہوں نے اسے دفاعی اہمیت دی۔

قلعے کو بیضوی قلعہ نما صورت دینے کا اعزاز سلطان نورالدین کے حصے میں بھی آتا ہے۔پہلے اس کے گرد پانی کی خندق تھی۔صلیبی جنگوں میں یہ سلاطین کی فوجی چھاؤنی بنتی۔قلعہ نما طرز پر بنائی گئی یہ زمین کے ساتھ ساتھ چلتی اُس تصور کی نفی کرتی ہے کہ قلعے ہمیشہ اونچی جگہوں یا پہاڑوں پر تعمیر ہوتے ہیں۔دروازوں کے نام باب الفراج Faraj ، باب صغیر، باب کیسان، باب السلام، باب تمہ Bob Touma ، باب شرقی، باب الجابیہ، باب غربی ہیں۔سلجوقیوں نے بھی 1078 میں اِس میں نئے دروازے، مینار گھر اور حمام بنائے۔ہاں البتہ عثمانیوں کے لئیے اس کی چنداں اہمیت نہ تھی۔

چھوٹے چھوٹے موڑ کٹتے اور نئے منظر دروازے کھولتے جاتے ہیں۔ اور میں ہابڑوں کی طرح انہیں آنکھوں کے راستے پینے میں مصروف۔ میں نے سوچا مجھے محتاط ہو کر چلنا چاہیے۔ اِس نظر بازی میں کہیں ٹھڈا کھا کر زمین بوس نہ ہو جاؤں۔ بیچارے بچے کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

اِن کہانیوں کی تفصیلات میں گُم ابھی میں دائیں بائیں اس کے قدیم حُسن کو دیکھتی تھوڑا سا ہی آگے بڑھی تھی کہ دلّی دروازے جیسے دیوہیکل گلیارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کتابیں بکھیرے کھڑے لڑکے کے پاس رک کر کتابوں کو دیکھنے لگی کہ ناگہاں بھاگ دوڑ، سیٹیوں کی آوازیں، شور وغل نے حیرت زدہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سامنے قدیم مگر شکستہ عمارتوں کی چھتوں پر لکن میٹی یا چور سپاہی کا کھیل جاری تھا۔ فائرنگ کا بڑا کھلا ڈلا تبادلہ ہو رہا تھا۔ لوگ دائیں بائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ پہلے میں نے وہیں بیٹھے رہنے سے چمٹنا چاہا۔ مگر وہاں پولیس کے کچھ لوگ آ گئے تھے۔ ماحول میں عجیب سی دہشت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ جہاں بیٹھی ہوں وہ جگہ تو سیدھی نشانے پر ہے۔

''چلو اگر دیس میں بچت ہو گئی تو اب یہاں مرنے کے لئے آ گئی ہوں۔''

اُٹھ کر بھاگی۔ مگر فوراً ہی پلٹ آئی کہ لوگ گلیارے کے اندر پناہ گزین ہو رہے تھے۔ میں بھی ڈری سہمی سی ان کے ساتھ وہیں گُھس گئی۔ اور یہیں اُس بے حد پیارے سے لڑکے سے ملاقات ہوئی جس کا نام احمد فاضل تھا۔ جو انگریزی بہت اچھی بول سکتا تھا۔ بینک میں ملازمت کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔ اِس واقعے بارے بتایا کہ چوری ڈکیتی کا کوئی کیس ہوگا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔

انسان فی الواقع خسارے میں ہے۔ اس وقت کیسے اُس چھوٹے سے واقعے نے ماحول کو ہراساں اور خوف زدہ کر دیا تھا۔

آج لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔ تب یہ کہیں معلوم تھا کہ یہاں چند ہی سالوں بعد قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔ یہ خوبصورت تہذیب وتمدن کا گہوارہ پرامن سا ملک اور اس کے خوبصورت مختلف نسلوں

سے تعلق رکھنے والے باسی اپنوں کی حماقتوں اور بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، اُن کے پروردہ غنڈوں ،کہیں القاعدہ، کہیں داعش اور کہیں اپنی ہی فوجوں کے ہاتھوں پور پور زخمی ہونے والے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی جیسے فلم کے کسی سین کی طرح سب کچھ غائب ہوگیا۔لوگ باگ اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔تاہم میرا احمد فاضل سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

میری اندر خانے کی کچھ باتیں جاننے کی خواہش پر احمد فاضل مجھے ایسی جگہ لے آیا جہاں درختوں کی چھاؤں تھی۔ پتھریلی زمین پر ہم پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔ اپنے ذہن کی کھلبلی مچانے والے سوالوں کی گٹھڑی میں نے کھول لی تھی۔ پڑھے لکھے لڑکے سے تفصیلی باتیں کرنے سے جانی تھی۔

رشوت اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم جیسی قبیح برائیاں بشار کے کردار پر اگر بدنما دھبوں کی طرح نمایاں ہیں۔تو وہیں ترقیاتی کاموں کی فہرست بھی ہے۔اقتصادی ترقی اس کی کاوشوں اور دلچسپی کی مرہون ہے۔انفراسٹرکچر کی طرف خصوصی توجہ، دمشق شہر کے لئے گرڈ سٹیشن اور پانی جیسے مسائل بہرحال بہت بہتر ہوئے ہیں۔

حکومت پر تنقید نہیں ہوسکتی۔اقربا پروری بہت زیادہ ہے۔رشتہ دار اور عزیز اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔

احتجاج منع ہے۔ چند سال پہلے ایک واقعہ ہوا۔لوگ آزادی اظہار چاہتے تھے۔مزید سہولتوں کے متمنی تھے۔ پچاس لوگوں پر مشتمل ایک جلوس نکلا۔دمشق میں ہونے والے اولین مظاہروں میں سے غالباً شاید پہلا۔مظاہرین اوران کی ایجنڈے بابت لوگوں میں آگاہی تو تھی مگر شاید ساتھ دینے کی جرات نہ تھی۔ یہ لوگ الجلاسٹریٹ سے چلے تھے۔مدھم سروں میں اپنے جذبات کو گیتوں میں ڈھالتے۔

بولوں میں کیا تھا یہی کہ دیکھو اپنے لوگوں کے سروں پر ہاتھ رکھو۔انہیں سکھ سے زندگی گزارنے کی نوید دو۔یہ ڈھکا چھپا بشار کے لئے پیغام تھا۔

اگر ان لوگوں کے ساتھ گفت وشنید ہوتی۔ان کی بات سنی جاتی تو یقیناً اس کے بہت مثبت اثرات سامنے آتے۔مگر ایسی کوئی کاوش کی ہی نہ گئی۔ان کا راستہ روکا گیا جب وہ لیبیا ایمبیسی کے قریب

تھے۔ ماردھاڑ تشدّد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انجام کار احتجاجی جیل پہنچ گئے۔

2008 کی اُس دوپہر احمد فاضل سے یہ سب سنتے ہوئے میں نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ واقعہ آنے والے وقتوں میں درعا جیسے واقعے کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ یہ سول وار کی ابتدا کا باعث بنے گا۔

ملکی سیاست پر باتوں کا سلسلہ پھیلتے پھیلتے نزار قبانی تک چلا گیا۔ میری اُس سے محبت اور لگن دیکھ کر اس نے پیش کش کی وہ مجھے اپنے دوست جس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہے ملانے لے جا سکتا ہے اگر میرے پاس وقت ہوتو۔ اس کا گھر یہیں پرانے دمشق میں ہی ہے۔

جی چاہتا تھا لڑکے کی بلائیں لوں۔ لوبھئی یہ تو موجیں ہوگئیں۔

''میرے بچے میں تو تمہاری حددرجہ شکرگزار ہوں گی۔''

اُس نے اسی وقت فون ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فوراً رابطہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر دونوں میں بات ہوتی رہی۔ پھر موبائل بند کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

''زکریا محمد کبرت Kibrit اس وقت یونیورسٹی میں ہے۔ تھوڑی دیر تک گھر پہنچے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ وقت ان کے اہل خانہ کے ساتھ گزار سکتی ہیں۔

''ہائے کیسا بھاگوان دن ہے۔ کیسی خوبصورت پیشکش سے ابتدا ہوئی ہے۔ خدا بہت مہربان ہے اور یہ عنایت اس کا خاص الخاص تحفہ ہے کہ کسی مقامی گھر جانا اور وہاں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دیکھنا بھی تو لکھنے لکھانے کے لئے اہم ہے۔''

قدموں میں تیزی، دل میں خوشی ومسرت کا جل ترنگ اور نگاہوں میں دائیں بائیں اور ماحول کو دیکھنے اور جذب کرنے کی آتش شوق کا آلاؤ۔ چمکتی دھوپ بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

اپنی خوش نصیبی پر بے طرح رشک آیا تھا۔ کیا میں نے اپنے بچپن کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے کبھی یہ سوچا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ میں اِن گلی کوچوں میں گھوموں پھروں گی۔ ہائے ربّا تیری کتنی

شکر گزاری ہے۔

تاہم جب میں راستے کے پُرسحر منظروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی تھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے دل کا حال بند پنجرے میں قید کسی نئے نویلے پرندے کے پھڑ پھڑانے جیسا ہی تھا کہ رومن کالموں اور امیّہ مسجد کے پاس سے گزرتے بس ایک طائرانہ سی نظران پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا کیسا روح فرسا سا تھا۔ دل پاگل تو وہیں بیٹھنے اور ڈیرے ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ پیاسی آنکھیں بھی اِن کمال کے منظروں سے سیر ہونے کے لئے بیتاب تھیں۔ میں نے دونوں کی دلداری کی۔

''بس آج کا دن میری جان۔ کل یہیں تو اڈہ جمے گا۔ جتنا جی چاہے گا رجنا۔''

سوق حمید یہ چھتا ہوا تھا۔ یہ پرانا تاریخی بازار جو 1925ء میں اپنے ساتھی مدحت پاشا بازار کے ساتھ فرانسیسیوں کی گولہ باری کا نشانہ بنا تھا۔ یہ کشادگی لئے ہوئے تھا۔ خوبصورت قیمتی ساز وسامان سے بھری پُری لشکارے مارتی دکانوں سے بھی سجا ہوا تھا۔ مگر استنبول کے کیپلی کارسی اور قاہرہ کے خانہ خلیلی بازار کی طرح آرٹ کا شاہکار ہرگز نہیں تھا۔ لیکن اِس بازار کے دامن سے پھوٹتی ہر گلی اپنے گھروں کی عمارات کے حُسن سے سحر زدہ کرتی تھی۔

تاہم آئس کریم کی ایک کشادہ اور خوبصورت سی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے احمد فاضل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میرے بچے آؤ میرے ساتھ آئس کریم کھاؤ۔''

وہ تھوڑا سا ہچکچایا۔ مگر میری بے تکلفی نے اُسے نارمل کر دیا۔ بل کے لئے میں نے احمد فاضل کی ہر کوشش ناکام بنادی۔

اب زکریا کے گھر کی طرف چلے۔ احمد فاضل دو بار غلط گلیوں میں گھس گیا۔ اس کے سرعت سے پلٹنے اور میرے سُستی سے قدم اٹھانے میں میری نظر بازی ہی کے چکر تھے۔

پھر یوں ہوا کہ وہ ایسی گلی میں داخل ہوا جس کی دکانوں کے چہرے مہرے چوبی کندہ کاری کے شاہکاروں سے سجے ہوئے تھے۔ اندر آرٹ کے نمونے نظروں کو ساکت کرتے تھے۔ دکاندار ایسی

بولیاں بولتے تھے کہ جن کے بارے پتہ چلا تھا کہ یہ لاطینی میں ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ فارسی بول رہا ہے۔ چلو فارسی تو لب و لہجے سے اپنے ہونے کا بتاتی تھی۔ بلا سے سمجھ آئے یا نہ است، ہست، بود، رفتن آمدن سے تو مانوس سی آشنائی تھی نا۔ کچھ کچھ سمجھ آ گئی تھی۔ وہ قبطی میں بات کر رہا ہے۔ بتانے پر پتہ چلا تھا۔

یائے ماں یاد آئی تھی۔ اُس کی مترنم آواز میں قاری غلام رسول کی یوسف زلیخا کے کچھ بول یاد آئے تھے۔

''اوقبطی بولی بولن تے سمجھ نہ آوے کائی۔''

یہاں پچی کاری کے شاہکار، کہیں سنہری، کہیں نیلے، کہیں قرمزی رنگوں والے آرمینائی اور قبطی کاریگروں کے ماہرانہ ہاتھوں کے نمونے قدموں کو ہلنے نہیں دیتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں یہاں پھر آؤں گی اور بہت سا وقت گزاروں گی۔ طارق بن زیاد سٹریٹ پر کہیں آگے جا کر گھر تھا۔

گھر کچھ اُس محاورے کا عکاس تھا کہ صورت کے نہیں سیرت کے ہم غلام ہیں۔ مرکزی دروازے کا گیٹ چوبی تھا۔ ڈیزائن سے گھٹتا ہوا۔ دومنزلہ گھر کی بالکونیاں چوبی تھیں۔ عام سی جسامت والے ستون بھی غالباً چوبی ہی تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح بالکونیوں کے چھجے بڑے خوبصورت اور ڈیزائن دار تھے۔ بیل کی آواز پر دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑا۔ یقیناً گھر میں اطلاع تھی کہ ایک نوعمر لڑکے نے احمد فاضل کو نشست گاہ کا راستہ دکھایا تھا۔

نشست گاہ یا گھر کا ڈرائنگ روم عربی کلچر میں دیوان مستطیل سی صورت کا تھا۔ گھر کے اندر ڈیوڑھی اور باہر کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کی پیشانیوں پر محرابی صورت بنی پٹی آرٹ کی مینا کاری سے سجی کمرے کو انفرادیت دیتی تھی۔ چھت اونچی اور دو دیواروں میں بلندی کی سطح پر لمبوتری سی چار کھڑکیاں روشن دانوں کی طرز پر شیشوں سے روشنی آنے کا باعث تھیں۔ صوفے کا ایک سیٹ جدید وضع اور دوسرا قدیمی صورت لئے ہوئے تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں اور دونوں کے پٹ گتھی چوبی کندہ کاری سے مزین تھے۔ میں نے چند لمحے خاموش بیٹھنے اور کمرے کا

جائزہ لینے کے بعد احمد فاضل کی طرف دیکھا اور پوچھا اگر میں اندر جاؤں تو گھر والے برا تو نہ منائیں گے۔

بچے نے خوش دلی سے کہا۔

''ارے جائیے۔ جائیے۔''

میں گھر میں کھلنے والے دروازے سے آنگن میں داخل ہوتے ہی جیسے خوشگوار حیرتوں سے دوچار ہوئی۔ آنگن گو زیادہ کشادہ نہ تھا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ وہ دیوار تھی جس نے گھر کو تقسیم کیا ہوا تھا۔ زکریا کے چچا کا گھر جوجدّی جائیداد کی تقسیم کے نتیجے میں سکڑ گیا تھا۔

سامنے محرابی برآمدے کے ستونوں سے چمٹی انگوروں کی بیلیں دومنزلہ کمروں کی بالکونیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اطراف میں بھی کیاریاں تھیں جن میں اُگے چھوٹے چھوٹے بوٹوں میں خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ سہ طرفی برآمدوں میں سے ایک میں درمیانی چوبی چوکی جیسے موڑھے پر بیٹھی ایک سرخ وسفید پوپلے سے منہ والی خاتون چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت لئے مجھے دیکھتی تھی۔ میں ان کی طرف بڑھی۔

بوڑھے گدا ز ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھاما۔ اھلاً وسہلاً کہا۔ میرے رخساروں پر بوسے دیئے۔ قریب پڑی کرسی جسے میں نے خود ہی اپنے لئے کھینچ لیا تھا۔ پر بیٹھتے ہوئے بغور اُنہیں دیکھا۔ ماتھے کے آخری سرے تک بس ذرا سا آنکھوں سے اوپر سیاہ رنگ کی کسی ہوئی پٹی پیچھے تک چلی گئی تھی۔ فراخ پیشانی اس میں چھپی بیٹھی تھی۔ دونوں کان سفید اور سیاہ کھچڑی بالوں کی آگے تک جھولتی موٹی بل دارلٹوں سے چھپے ہوئے تھے۔ پھولوں والی چھوٹی سی اوڑھنی نے سر ڈھانپا ہوا تھا۔ سیاہ زمین پر چھوٹے چھوٹے سرخ پھولوں والا گھیردار سا پہناوا جس کی صورت واضح نہیں ہورہی تھی پہنے بیٹھی تھیں۔

بڑی اشتہاانگیز سی کسی کھانے کی خوشبوصحن سے ہوتی ہوئی میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔

پھر دوعورتیں ایک لڑکی اور دوسری عورت نما عقبی اور سامنے والے کمروں سے آئیں۔ دونوں جیسے حُسن میں پور پور بھیگی ہوئی تھیں۔ لڑکی کے ہونٹ رسیلے الوچوں جیسے تھے۔ نازک بدن۔ پرنٹڈ بلاؤز

پر لمبا سکرٹ ، دودھیا رنگت اور شربتی سی آنکھیں ۔عورت ذرا فربہی گوری چٹی ٹخنوں کو چھوتے میکسی نما فراک پر حجاب لئے ۔گالوں پر بوسے تھے ۔مسکراہٹیں تھیں ۔مگر تینوں گونگیاں تھیں ۔انگریزی سے کوری ۔

پھر زکریا کبرت آ گیا ۔ چلوشکر ۔خوبصورت نوجوان تھا ۔اونچا لمبا کلین شیو ،مگر چھوٹی چھوٹی سنہری سی مونچھوں کا پھیلاؤ چہرے پر بھلا لگتا تھا ۔خوبصورت لڑکی فدیلہ تھی ۔زکریا کی بیوی اور دوسری اس کی بھاوج بنان اور خاتون والدہ کاریدہ تھیں ۔

قہوہ وہیں آ گیا ۔ٹرے میں رکھی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ۔ساتھ کھجوریں اور بقلاوہ تھا ۔ بڑا کسیلا قہوہ ۔شکر ہے ساتھ کھجوریں تھیں ۔دانتوں تلے کھجور دبا کر چھوٹے چھوٹے چند گھونٹ ہی بھرنے میں پیالی خالی ہو کر اپنی تہہ میں بنے خوبصورت پھولوں کے ساتھ سامنے آ گئی تھی ۔

زکریا سے بدلتے وقتوں کی بہت سی باتوں کا پتہ چلا ۔ اِس پرانے دمشق میں تو بہت بڑے بڑے گھر تھے ۔لوگوں نے کہیں انہیں ریسٹورنٹوں میں اور کہیں ہوٹلوں میں تبدیل کر کے اپنی رہائش گاہیں مضافاتی علاقوں میں لے گئے ہیں ۔

آج لکھتے ہوئی دل دلگیر سا ہے ۔گو زکریا لوگ خیریت سے ہیں ۔مگر اِس کی تحریر میں گھلے یاس نے مجھے تڑپا دیا تھا ۔آپ نے دمشق کا جو حُسن دیکھا تھا وہ گہنا گیا ہے ۔

کمرے میں دستر خوان بچھ گیا ہے ۔ یہ نشست گاہ ہے ۔ کہہ لیجیئے گھر کا اندرونی دیوان خانہ ہے ۔حرم کا نام لے لیں ۔احمد فاضل بھی آ گیا ہے ۔ ہاتھ دھو کر ہم دستر خوان پر بیٹھ گئے ہیں ۔شکر ہے سفید اُبلا ہوا چاول بڑی قاب میں ہے ۔ یہ دال ہے اور یہ بھنا ہوا گوشت ۔سلاد مکس سا تھا ۔ کالے اور سفید زیتون بھی نظر آتے تھے ۔ٹماٹر اور کھیرے بھی تھے ۔ پودینے کے پتوں کی بھی بہاریں تھیں ۔زکریا نے کہا تھا کہ آج تو وقت نہیں تھا ۔ وگرنہ مقلوبہ کی ڈش بناتے اور اس سے آپ کی تواضع کرتے ۔

بچے بھی سکول سے آ گئے ہیں ۔ دو بیٹے زکریا کے بڑے بھائی کے ہیں ۔سات سالہ ہمیش اور پانچ سالہ آدونس دونوں ال تکیہ ال سلیمانیہ کے قریب ایک فرنچ سکول میں پڑھتے تھے ۔دونوں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات چیت کر سکتے تھے ۔

بچوں کا باپ کوئی چھ ماہ ہوتے ہیں اپنا پریس کا بزنس بیروت منتقل کر بیٹھا ہے۔ نئی جگہ پر نئے سیٹ اپ میں مشکلات کا سامنا ہے۔ بیوی بچے ابھی یہیں ہیں۔ زکریا کی شادی ابھی چند ماہ پہلے ہوئی ہے۔ باپ بھی بڑے بیٹے کے ساتھ بیروت میں ہی تھا۔ ابھی تین چار دن پہلے آیا تھا۔ سرخ وسفید، اونچا لمبا صحت مند مرد جسکی جوانی اس کی شخصیت کو وجیہہ بناتی تھی۔ کاروبار کی نقل مکانی دوسرے ملک میں کرنے کی وجہ پوچھی تو مزے سے بولے۔

''رشوت اِس ملک کی ہڈیوں گوڈوں میں اُتر گئی ہے۔ شام سوشلسٹ ملک ہے۔ بس نعرہ اور ڈھنڈورا ہی کافی ہے۔ اِن سب بڑوں نے جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں انہوں نے اِس ملک کی اقتصادیات کا خون نچوڑ لینا ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان چھوٹا موٹا فرق نہیں انتہا کا ہے۔ موقع ملے تو یعفور ضرور جائیں۔ امراء، وزراء کی محل باڑیاں آنکھیں پھاڑ دیں گی۔ خیر سے ترکی کے ساتھ فری تجارت نے مقامی صنعتوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔''

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

''ہائے یہی سب کچھ میرے ملک میں بھی ہو رہا ہے۔ ایک جیسے المیے۔ کہیں روشنی نہیں۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

یہ سنی گھرانہ تھا۔ گفتگو سے اندازہ ہوا تھا۔ تاہم یہ بھی جانا تھا کہ دمشق مذہبی معاملات میں بڑا لبرل ہے۔

بیٹھنے کی ترتیب ونشست میں حسب مراتب کوئی مخصوص اہتمام کیا گیا یا اس کا کوئی خیال رکھا گیا مجھے اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ تاہم ماں کے لئے جو نشست مخصوص تھی اُس کا خیال رکھا گیا۔ میں سوچتی تھی کہ کیا وہ زمین پر بیٹھ سکیں گی۔ مگر ان کے بیٹھنے میں مہارت تھی اور کسی طرح کی تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میرے خیال میں یہ کرامت یقیناً زیتون کے تیل کی برکات کے سبب ہی ہو سکتی تھی۔

ہم دونوں یعنی میں اور احمد فاضل والدہ کی جانب بیٹھے۔ بچے باپ کے داہنے ہاتھ تھے۔ اچار گھر کا تھا اور بڑا مزے کا تھا۔ ہمارے اچاروں سے مختلف۔ میرے لئے یہ سب ایک خدائی نعمت سے

کم نہ تھا۔ جو مجھے نصیب ہوئی تھی۔ کنف بازار کا تھا۔ بے حد ذائقہ والا۔ یوں گھر پر بھی تیار ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد قہوہ کی باری سانس لینے جیسی مجبوری وضروری تھی۔

کبرت کی بیوی گو دمشق یونیورسٹی کی گریجوایٹ تھی۔ مگر لازمی زبان کے طور اس نے جرمن پڑھی تھی۔ اُسی میں اُس کا تھوڑا بہت دال دلیا تھا۔ گھر دیکھنے کی خواہش دونوں میاں بیوی نے سب سے پہلے مجھے اپنا کمرہ دکھانے سے کی۔ نئے نویلے جوڑے کا آراستہ پیراستہ کمرہ۔ کمرے کی دو دیواریں چوبی پینل سے بنی ہوئی تھیں۔ بیڈ بھی ساخت کے اعتبار سے بڑا منفرد سا جس پر بچھی چادر کا ڈیزائن اور رنگ اتنے منفرد سے تھے کہ زکریا نے بتایا کہ یہ اس کے ماموں سسر کا خصوصی تحفہ ہے جو انہوں نے بھیجا تھا۔

اُن کے تین کاروباری ملازم قنطیرہ کے سرحدی گاؤں حدّر کے رہنے والے ہیں۔ ایسی کڑھائی وہاں کی عورتوں کی خصوصیت ہے۔ بازار میں یہ بڑے مہنگے داموں میں ملتا ہے۔

کمرے کا ایک گوشہ دلہن کی اپنی تصویروں سے سجا تھا۔ مختلف علاقائی لباس۔ ایک میں اس کے سر کی پشت پر لٹکتی چاندی کے زیورات سے سجی پٹی اور فراک نما قمیض ہمارے ہاں کی کیلاشی عورتوں جیسی ہی تھی۔ اِس تصویر کو دیکھتے ہی میری آنکھیں گویا اپنایت اور مانوسیت کی چمک سے جیسے جھلملانے سی لگی تھیں۔

فدیلہ نے کسی قدر حیرت سے میرے تاثرات کو دیکھا تو میں نے وضاحت کی۔ ایک اور تصویر میں سر پر دھرے گھٹڑ نما پگڑی پر سجی موتیوں کی لڑیاں درمیان میں اُس البیلی شہزادی کا چمکتا چہرہ اور بلوچی سٹائل کا پہناوا۔ مختلف کلچروں کی کتنی چیزوں میں کتنی مماثلت ہوتی ہے۔

میں نے زکریا سے پوچھا تھا۔ آپ کے ہاں سیاسی پارٹیاں کیوں نہیں۔ یک جماعتی نظام ذہنی سوچ کی پستی کا غماز ہے۔ کیا وجہ ہے اس کی؟

ڈکٹیٹرشپ۔ تیس سال باپ کی اور اب بیٹے کی۔ مگر کب تک؟

میں نے محسوس کیا تھا زکریا سیاست پر گفتگو سے گریزاں تھا۔ محتاط تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور ساتھ ہی پل بھر میں موضوع بدل دیا تھا۔

''آپ نژ ارقبانی بارے کچھ جاننا چاہتی ہے۔میری ڈاکٹریٹ کا مقالہ اس پر تھا۔مگرآج آپ کو کچھ نہیں بتایا جائے گا۔دوسری اور تیسری بار آنا شرط ہے۔''

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔مہمان نوازی کا خوبصورت اور موہ لینے والا انداز۔

سچی بات ہے کب معلوم تھا مجھے کہ اچھے دنوں کی ان یادوں پر لکھے گئے کچّے پکّے مسودے کو آخری ٹچ دینے کے لئے باکس فائل میں سے جب نکالوں گی تو پلوں کے نیچے سے ڈھیروں ڈھیر پانی ہی نہیں بہا ہوگا بلکہ ان پانیوں کی میٹالی رنگتوں میں لالیوں کی صورت شامیوں کا خون جگر بھی بہہ نکلا ہوگا۔

کبرت کے گھر کے برآمدے میں بیٹھی اس کی والدہ مرتن اپنے خدوخال اپنے انداز واطوار سے میری یادداشتوں میں ابھری ہیں۔بعینہٰ اسی طرح میرے تصور کی آنکھ نے امل کیسر کو دیکھا ہے۔جو امرکین ماں اور شامی باپ کی بیٹی جس کی آوائل بلوغت کا کچھ وقت دمشق میں اپنی دادی کے فارم ہاؤس پر گزرا تھا۔اس وقت میں امل کیسر کی دادی کو دیکھتی ہوں جس پر لکھی ہوئی امل کیسر کی نظم نے مجھے اُن تمام شامی بوڑھی عورتوں کی یاددلائی ہے۔جنہیں شام اپنی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔

میری دادی شام کو ہر شامی سے زیادہ جانتی ہے
اس کے گھٹنوں میں آرتھرائٹس ہے
اُسے اپنے کھیتوں کی مٹی کے نام اور خوبیوں سے مکمل آگاہی ہے
وہ ظالموں اور آمروں کو بھی جانتی ہے
وہ کہتی ہے
غلاظت اس کے (بشار) انتظار میں ہے
وہ اپنی قبر بارے بھی جلد جان جائے گا
اور پھر
وہ اپنی چھاتی پر پورے ملک کا بوجھ محسوس کرے گا

☆☆☆

باب نمبر۵:

دمشق کا چہرہ امن اور جنگ میں اُمیّہ مسجد

- اُمیّہ مسجد دمشق کا لینڈ مارک ہے۔
- شام دراصل ایک کلنٹ اور فیوڈل سوسائٹی جیسی صفات رکھنے والا ملک ہے۔
- حداد ٹمپل کے صدیوں قدیمی شکستہ سے کالموں کے عین درمیان سے اُمیّہ مسجد کا تانکا جھانکی کرتا خوبصورت مینار کسی انوکھے منظر کا عکاس تھا۔
- تعلیم یافتہ نوجوان نسل اور شامی نژاد یورپی اب مجموعی رجحانات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔
- مسجد کے صحن میں گرنے والے بم نے میڈیکل کے طلبہ کی کثیر تعداد کو زخمی اور شہید کر دیا۔
- یہ جائے عبادت تھی یونانیوں، رومیوں اور آرمینیاؤں کی۔

شام پرانے دمشق کے گلی کوچوں، کوٹھوں کے بینروں، میناروں کے گنبدوں، پیڑوں کی چوٹیوں، مٹیالے آسمان، اس پر اڑتے پرندوں اور یہاں وہاں پھرتے لوگوں کے چہروں پرسَت رنگی رعنائیوں سے اُتری ہوئی تھی۔

کِسی بھی رُت کی شام ہو۔ کسی ماڑھے موٹے گاؤں کی ہو۔ کسی عام سے شہر کی ہو، کسی ملک کی ہو۔ جانے مجھ پر کیوں اس کا جادوئی سا اثر ہوتا ہے۔

کل جب اس اجنبی دیس کے ایک گھر سے محبتیں سمیٹ کر دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر باہر نکلی تھی۔ تب زمینی اور فضائی حسن کو دیکھتے اور اس سے محظوظ ہوتے خود سے پوچھتی تھی۔

''اب کیا کروں؟ شام کے بانکپن کو دیکھوں۔ کسی جگہ بیٹھ کر خود کو اِس بارش میں بھگوؤں۔ بابِ صغیر کے قبرستان جاؤں اور شام کے انقلابی شاعر کی آرام گاہ پر فاتحہ خوانی کروں۔

ہاں ایک صورت اور بھی ہے میں نے خود کلامی کی تھی۔

''زکریا کا گھر چونکہ فصیلِ شہر اور باب الفراج کے پاس ہے۔ برادہ نہر Barada ساتھ ہی بہتی ہے۔ زکریا نے سب کچھ بتایا اور سمجھا بھی دیا ہے تو وہاں چلوں اور نہر کنارے کی خوبصورتیوں یا کوجے پنوں کا نظارہ کروں اور کچھ جانوں کہ ایک نہر میرے شہر میں بھی بہتی ہے۔اس اجنبی شہر میں تھوڑی سی اپنائیت ،تھوڑا سا تقابلی جائزہ۔ یا پھر لوئے لوئے گھر واپس جا کر آرام کروں۔آج کی فٹیک اتنی ہی کافی ہے۔''

تاہم دل نے کہا۔

''اری مورکھ چھوڑ سب کچھ۔ اِس شہر نگاراں کی شام دیکھ۔ اُمیّہ مسجد کو ہرگز نہیں دیکھنا آج۔اور ہاں صلاح الدین ایوبی کے مقبرے پر بھی نہیں جانا۔ یہ دونوں تو خاص الخاص سوغاتیں ہیں شہر کی۔انتہائی قیمتی چیزیں ہیں۔سکون اور آرام سے دیکھنے والی۔''

پر ہوا یہ تھا کہ چلتے چلتے جانے اندر کی کن پنہائیوں سے اچھلتا کودتا ایک مصرعہ یادوں سے آٹکرایا تھا۔''گھر جاندی نے ڈرنا۔'' میاں محمد بخش جانے کہاں سے سامنے آ گئے تھے۔میں نے تو سچی بات ہے پل بھر کے لئے بھی اُن کے بارے نہیں سوچا تھا۔

لوئے لوئے پر لے کڑ یئے جے قد پھانڈا بھرنا۔

شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نے ڈرنا۔

پل بھر کے لئے رُک کر میں نے گردوپیش کو دیکھا تھا۔ایک گہری لمبی سانس بھر کر میں نے کہا تھا۔

میاں جی اجنبی دیس کی ان گلیوں گلیاروں میں اندھیرا ہو گیا تو ڈر تو لگے گا۔اور رہی بات جلدی جلدی تاڑا تاڑی پھانڈے ٹینڈے بھرنے کی تو میاں جی یہ تو ممکن ہی نہیں۔دمشق تو گہرے دریا

جیسا ہے۔اس میں تو مجھے روز بوکا ڈالنا پڑے گا۔ جتنا نکلے گا اُسے ہی سنبھال سکوں تو غنیمت ہوگا۔تو بس اب چلتی ہوں۔

اور آج ارادہ تو سویرے ہی آنے کا تھا۔مگر زینبیہ میں ایک جید عالم کی آمد،ان کا لکچر جسے سننے کی درخواست میر کارواں نے خصوصی طور پر مجھ سے کی تھی۔گروپ کے کسی صاحب ثروت کی طرف سے دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام جس کے کھانے کی بھی تاکید تھی۔بس تو آدھا دن اسی ہنگامے میں گزر گیا۔جب زینبیہ سے نکلی اور پرانے دمشق پہنچی۔دیکھنے کو منظر تو وہی شام والا ہی تھا۔

حمید یہ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ایک تو مردانہ رعنائی والا چہرہ اُس پر ایسا انوکھا سا پہناوا،سرخ پھُندے والی ٹوپی،جھلملاتی موتیوں منکوں اور کوڑیوں سے سجی واسکٹ،پشت پر مشک کی طرح لدا حقے کی صورت والا پتیل کا چمکتا کچھ کچھ سماوار جیسا بھی برتن جو دلہن کی طرح مختلف النوع آرائشی چیزوں سے پور پور سجا خوامخواہ رکنے اور دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔جو وہ گلاس بھر بھر کر لوگوں کو دے رہا تھا۔اس کے بارے بھی جاننے اور پینے کی دعوت دیتا تھا۔

اب بھئی رکنا تو تھا۔استنبول کے بازاروں میں بھی ایسے کردار دیکھے تھے۔مگر جو رنگینی اور تام جھام کا جہان یہاں نظر آیا تھا اس کا تو کوئی انت نہ تھا۔

پتہ چلا تھا کہ یہ قہوہ نہیں بلکہ املی سے بنا ہوا مشروب ہے اور اسے تمر ہندی کہتے ہیں۔

''تو پیوں؟'' میں نے خود سے پوچھا تھا۔

سچی بات ہے جی تو للچا رہا تھا۔پر کھٹا ہوا تو؟ گلا پکڑا گیا اور تپ چڑھ آیا تو؟ چسکے کو لگام دی۔ چلو خیر یہاں تو زبان کو نتھ ڈال لی۔مگر بقدش آئس کریم بیچنے والوں نے تو ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ ڈھول بج رہا تھا۔گانا چل رہا تھا۔عربی میں سمجھ کیا آنی تھی۔ بلا سے نہ آئے۔سین تو بڑا رومانی سا تھا۔ بیڈن روڈ کے چمن آئس کریم والوں کی طرح۔بس ان کے ہاں ڈھول پیٹنے کی کمی تھی۔

''بھئی یہ تو ضرور کھانی ہے۔'' اپنے آپ سے مکالمہ ہوا تھا۔

اب ایک کے بعد ایک کیل کانٹے سے لیس لعن طعن کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔

ابھی کوئی چار پانچ گھنٹے پہلے تو پلیٹ بھر زردہ تو نے ڈھپا (کھایا) تھا۔ عجیب ہابڑا پڑا ہوا ہے۔ زبان اور ہاتھ کو لگام دو۔ اب تک اگر شوگر نہیں ہوئی تو تمہارا یہ نادیدہ پن اب ضرور کروا دے گا۔

اور اِس ندیدے پن اور گندی نیت نے سب اعتراضات کا تیا پانچہ کر دیا تھا یہ کہتے ہوئے۔

''بدبختو ذرا سی میری عیاشی تمہارے دیدوں میں چُبھنے لگتی ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ ایک نہیں سُننی میں نے تمہاری۔''

میں آئس کریم کھا رہی تھی اور مزے لوٹ رہی تھی۔ دل کا رانجھا راضی ہوا تب آگے بڑھی۔ ساحتہ المسکیہ کے کھلے میدان میں داخل ہونے والی تھی۔ جب ٹھٹک کر رک گئی۔ میرے سامنے ایک ایسا کلاسیکل منظر تھا جس نے قدموں کو پتھر اور آنکھوں کو ساکت کر دیا تھا۔ حداد Hadad ٹمپل کے صدیوں قدیمی شکستہ سے کالموں کے عین درمیان سے اُمیّہ مسجد کا تانکا جھانکی کرتا خوبصورت مینار کیسے انوکھے سے منظر کا عکاس تھا۔ جیسے ایک شاہکار پینٹنگ ہو۔

اوائل جولائی کی گرم ہواؤں کے جھونکے پیشوائی کے لئے بڑھے تھے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھلے میدان کے ایک جانب کینا کے درخت تلے بنے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ میں نے گردوپیش کو دیکھا۔ صدیوں پہلے یہ بہت بڑا میدان تھا۔ رومن کالموں اور محرابوں سے سجا ہوا۔ جیوپیٹر Jupiter دیوتا کا ٹمپل یہیں تو تھا۔ اب ماہرین آثارِ قدیمہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آرمینیاؤں کے حداد ٹمپل کی باقیات پر جیوپیٹر ٹمپل بنا تھا۔ سچ کیا ہے؟ اِسے تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نے تاریخ کو وقتی طور پر دفع دور کرتے ہوئے خود سے کہا ہے۔

''بس دیکھو تمہارے اردگرد کیا ہے؟''

میرے دائیں ہاتھ نوادرات کی دکان کے چوبارے کی آبنوسی کھڑکیوں کی چوبی کندہ کاری اتنی گھتی ہوئی اور خوبصورت تھی کہ نظریں اُن میں پھنس پھنس جاتیں یوں کہ انہیں نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ساتھ دیوار پر قدرے سیاہی مائل عنابی رنگ کا درمیانے سائز کا قالین لٹکا ہوا تھا۔ ڈیزائن اور رنگوں کا امتزاج کیا حسن اور انفرادیت لئے ہوئے تھا۔

میں سامنے کافی بار سے کافی لے کر آئی۔ طلب تو ہرگز نہ تھی مگر اِس رومانوی کلاسیکل ماحول میں بیٹھ کر اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھنا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے کافی پینا جس قدر مزے کا کام تھا اس سے خود کو محروم کرنا مجھے کسی طور گوارہ نہ تھا۔

میرے عین سامنے ایک طرف دمشق کا شہرہ آفاق الحمیدیہ بازار ہے جس میں سے گزرتی ہوئی میں ابھی آ کر یہاں بیٹھی ہوں۔ دائیں جانب اُس اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کا شاہکار وہ امیہ مسجد تھی جو سچی بات ہے دمشق کا لینڈ مارک ہے۔ بائیں ہاتھ حسین شاپ ہے۔ یہاں کتابیں ہیں۔ مقامی دست کاری کی چیزیں ہیں۔

منظروں کی اِس حُسن و جاذبیت کو اپنے اندر اُتارتی میں صدیوں پرانے درخت کی جھالروں سے آنکھ مٹکا کرتی پھڑ پھڑاتے کبوتروں کی اُڑانیں دیکھتی ہوں جو آسمان کی بلندیوں سے اُترتے شکستہ کالموں پر تھوڑی دیر بیٹھتے اور پھر اُڑانیں بھرنے لگتے ہیں۔ آسمان کا سینہ کیسے ان کے ساتھ بھرا بھرا نظر آ رہا ہے۔

گردن گھما کر میں نے اپنی انتہائے بائیں جانب کی پشت کو دیکھا۔ مسجد کی دیوار ایک گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر جیسے پندرہ سولہ فٹ اونچے دروازے نے مجھے پکارا۔

''چھوڑو ضد۔ چلی آؤ۔ کل کس نے دیکھی ہے؟ دم کا بھی کوئی بھروسہ ہے۔''

اِس پکار، اِس آواز میں کیا جادو تھا؟ میں کسی طلسم زدہ انسان کی طرح اٹھی۔ مگر اس کے اندر جانے کی بجائے پہلے داہنی ہاتھ حسین شاپ میں داخل ہوئی۔ سنجیدہ سا درمیانی عمر کا مرد جس کے پاس جا کر میں نے اپنا تعارف کروایا۔ نزار قبانی کے کلام کی انگریزی ٹرانسلیشن کا پوچھا۔ میں تو اِسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ اس نے A selection of Nazzar Qabbani کوئی سو صفحے کی کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

''ہائے'' میرے اندر نے جیسے خوشی سے کلکاری ماری۔ میں نے پھولا پھرولی کی۔ کیا شاہکار نظمیں تھیں۔ ایک سو تیس سیرئین پاؤنڈ دیئے اور کتاب کو بیگ میں ڈالا۔

کاؤنٹر پر بیٹھا معمر مرد صاحب نظر اور سنجیدہ آدمی تھا۔ میرے چہرے پر بکھرے خوشی سے بھرے تاثرات اور والہانہ حرکات کا یقیناً اس نے مشاہدہ کیا تھا۔ جان گیا تھا کہ پڑھنے کی رسیا ہے۔ پیاسی ہے۔

میں نے جب کچھ جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کرسی اور توجہ دی۔ خوش قسمتی کہ دکان میں بھی رش نہ تھا۔ اکّا دکّا گاہک ملازم نپٹا رہے تھے۔

سیاست، لوگوں کے مزاج سے متعلق ذہن میں جو کھلبلی سی تھی وہی سوال کی صورت باہر آئی تھی۔

انہوں نے قدرے مدھم لہجے میں کہا۔

''شام دراصل ایک کلنٹ اور فیوڈل سوسائٹی جیسی ملی جلی صفات رکھنے والا ملک ہے۔ کلنٹ یقیناً سمجھتی ہوں گی کہ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جو کسی زبردست، کسی طاقتور، کسی بااثر کے زیرِسایہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ شامی لوگ ایسے ہی ہیں۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ تھوڑے مہذب تھوڑے گنوار۔ کچھ ماڈرن کچھ روایتوں میں جکڑے۔ وگرنہ کوئی بات تو نہیں نا کہ لگ بھگ نصف صدی ہونے کو آتی ہے اِن باپ بیٹے کے چنگل میں ہی پھنسے ہوئے ہیں اور یہ صورت صرف شام میں ہی نہیں بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں نظر آتی ہے۔ ہاں البتہ اب تعلیم یافتہ نوجوان نسل اور بیرون ملک رہنے والے اُن شامیوں کی اکثریت جو گرمیوں میں بھاگی بھاگی وطن آتی ہے اِن مجموعی رجحانات پر خاصی اثر انداز ہو رہی ہے۔ خوشی ہوتی ہے کہ اُن کی سوچیں زیادہ مثبت ہیں۔

میرے خیال میں یہ صورت زیادہ دیر تک نہیں چلے گی۔ بیرونی طاقتیں بھی بڑی سرگرم ہیں۔ ایک طرف ایران، دوسری طرف سعودی عرب، امریکہ، ترکی سب اپنے اپنے مفادات کے تانوں بانوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

چند لمحوں کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ آنکھیں جھپکتے کچھ سوچتے کبھی دروازے سے باہر دیکھتے وہ پھر متوجہ ہوئے تھے۔

اسداوراس کے اردگرد اکٹھے لوگوں کے پاس سیاسی بصیرت نہیں۔ دنیا کے اکھاڑے میں کھیلے جانے والے کھلاڑیوں میں ہماری تو کہیں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نظر نہیں آتی۔ یوں کٹے کٹے تنہا تنہا سے۔ قریبی اور دور کی دنیا میں کوئی حادثہ ہو جائے، کرہ ارض کے کسی خطے میں کوئی ارضی وسماوی آفت پھٹ پڑے۔ ہم دو لفظ کا پرسہ دینے کے روادار نہیں۔ اپنی اوقات کے مطابق کوئی مدد نہیں بھیجتے۔ سیاحت کے اعتبار سے ملک کس درجہ امیر ہے۔ حکمرانوں کو احساس ہی نہیں۔ مذہبی اور آثارِ قدیمہ دونوں اعتبار سے اس کی عالمی سطح پر تشہیر چاہیے مگر نہیں۔ یہ بیش بہا خزانے دھندلے پردوں میں ملفوف ہیں۔

ٹھک سے یہ بات میرے دل کو لگی تھی کہ میں ٹورزم ڈیپارٹمنٹ کے لئے کس درجہ خجل ہوئی تھی۔ گیند کی طرح لڑھکتی ایک عمارت سے دوسری اور دوسری سے تیسری کے چکر لگاتے لگاتے ہپوہان ہوگئی تھی۔ بالاخر دو حرف لعنت کے بھیجے تھے۔

اب وہ پھر خاموش تھے۔ اِس بار کی خاموشی قدرے طویل تھی۔ میں نے سوچا اب مجھے اجازت لینی چاہیے۔ ابھی اِسی گومگو میں تھی کہ وہ پھر بولنے لگے تھے۔

کیسا دلگیر سا لہجہ تھا اُس بوڑھے شخص کا۔

دنیا بہت سکڑ گئی ہے۔ بڑی طاقتیں اپنی مکاریوں کے نت نئے انداز اور نئے پیرہنوں سے سامنے آرہی ہیں۔ خود کو بچانے کی ضرورت ہے۔ جہادیوں کے ٹولے اور پیسوں کے بورے عراق بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پھر رُکے۔ لمبا سانس بھرا اور بولے۔

''پتہ نہیں میں کیوں پرُامید نہیں شام کے مستقبل سے۔''

خاصی دیر ہوگئی تھی۔ اجازت چاہی۔ یہ بھی درخواست کی کہ جب بھی ادھر آنا ہوا ان کے پاس آسکتی ہوں؟

''کیوں نہیں شوق سے آئیں۔''

جب عبداللہ جازر کے پاس سے اُٹھی۔ خاصی دل گرفتہ سی تھی۔

''یہ مسلم اُمّہ اِس کا بنے گا کیا میرے پروردگار؟ یہ تو اپنے پیروں پرآپ کلہاڑے ماررہی

ہے۔"

اب دھیرے دھیرے چلتی اس دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جسے باب برید کہا جاتا ہے۔ بلند و بالا جسے دیکھنے کے لئے گردن کو دوہرا کرنا پڑتا ہے۔ باب برید سے سیاحوں کے گزرنے کی مناہی ہے۔ جانے کیوں؟ ہاں البتہ چھوٹے دروازے سے داخلے کا پروانہ ملا۔

زمانے اور صدیوں کے سرد گرم ذائقے چکھنے والی کی صورت پر گوابھی بھی چھائی جانے والی کہنگی، پرانے پن اور بے رنگی کے لہراتے عکس جو باہر سے دیکھنے پر ذرا آنکھوں پر کسی بوجھ کی طرح گرتے ہیں۔ اندر آ کر ایک حیرت کدے میں بدل جاتے ہیں۔ قدامت کی فسوں خیزی لئے، وسعت کشادگی، دیواروں پر فطرت سے متعلق شاہکار دامن دل کو کھینچتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا تھا یہ اپنی جھولی میں تعمیر کی انفرادیت، وقار اور گھمبیرتا سے پور پور بھری ہوئی ہے۔ قدامت کی فسوں خیزی کا غازہ وجود کو حُسن بخشے ہوئے ہے۔ پیشانی اور ڈھیر سارے بازو بھی فطرت کے حسین شاہکاروں کے نوکیلے رنگوں اور شاہکاروں سے سجے سنورے پُر زور دعوت دید دیتے ہیں۔ سادگی بھی وقار میں اضافے کا باعث ہے۔ ایک خوبصورت اور عظیم عبادت گاہ کا روپ دھارے اپنی پشت پر صدیوں کی تاریخ کی گٹھڑی لادے تمکنت سے کھڑی مجھے سب سنانے کے لے کیسی بیتاب نظر آتی تھی۔

میں وہیں بیٹھ گئی تھی اور تاریخ نے پہلا باب میرے سامنے کھول دیا تھا۔

یہ تین ہزار سال جائے عبادت رہی۔ رومیوں، یونانیوں اور آرمینیاؤں کی۔ بپتسمہ کا حوض ابھی بھی موجود ہے۔ پہلے یہ آرمینائی دیوتا حداد Hadad کا مندر تھا۔ پھر ہزاروں سال پگان Pagan مندر بنا۔

مسلمانوں نے شام فتح کیا تو بہت عرصہ مسلمان اور عیسائی ساتھ ساتھ عبادت کرتے رہے۔ میرے اللہ کیا رواداری کا زمانہ تھا۔ یہ برداشت کا عنصر ہم میں سے اب کیوں نکل گیا ہے؟ ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کے لوگوں کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کا بیج مار

دینے کا خواہش مند ہے۔ کہیں بہت پہلے ظفر جمال بلوچ کی ایک تحریر نے بہت محظوظ کیا تھا۔ حالات کی ایسی عکاس تحریر کہیں کہیں پڑھنے کو ملتی ہے۔ آپ بھی پڑھیئے اور سر دُھنیئے کہ کیسا شاہ پارہ ہے۔

''ایک مشہور عالم دین مولانا عنایت اللہ گجراتی نے ایک نوجوان کو نصیحت کی کہ بیٹا جب تمہیں اللہ نے صحت دی ہے، جوانی دی ہے، سوچنے کو ذہن، بولنے کو زبان، چلنے کو ٹانگیں اور کام کرنے کو ہاتھ دیئے ہیں تو پھر تم اس کا شکر یہ کیوں ادا نہیں کرتے؟ کیونکہ جہاں خدا یہ چیزیں دینے کی قدرت رکھتا ہے، وہیں لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

نوجوان کو بات سمجھ آ گئی اور اُس نے نماز پڑھنی شروع کر دی۔

کچھ عرصہ کے لئے مولانا باہر پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے چلے گئے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ نوجوان دوبارہ فلموں کا رسیا بن چکا ہے۔

بلایا اور کہا کہ میں نے تو تمہیں مسجد کا راستہ دکھایا تھا، سینما کا راستہ کس نے دکھایا؟ نوجوان نے جواب دیا۔

''مولانا جو سکون مجھے سینما میں محسوس ہوتا ہے، مسجد میں محسوس نہ ہوا۔ آپ کے کہنے پر مسجد کا رخ کیا۔ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ کن بدعتیوں کی مسجد میں نماز پڑھ لی ہے۔ دوسری مسجد میں گیا۔ وہاں سے نماز پڑھ کر باہر نکلا تو تبصرہ ہوا کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہی درست نہیں۔ یہاں نماز پڑھو گے تو سابقہ ادا کی جانے والی نمازیں بھی فاسد ہو جائیں گی۔ تیسری مسجد میں گیا تو تبصروں نے پھر جان نہ چھوڑی۔

پریشانی میں نماز ترک کی اور ایک دن سینما کا رخ کیا۔ ٹکٹ لے کر اندر پہنچا تو سکون ہوا کہ ایک ہی قطار میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ بیٹھے ہیں لیکن کیا مجال جو کسی کو کسی پر اعتراض ہو۔''

یہ زمانہ تھا لگ بھگ کوئی 705 اور 708 کے درمیان کا جب اُس اُموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے یہاں ایک عظیم الشان مسجد بنانے کا سوچا۔ سوچا کہنا کچھ زیادتی کے زمرے میں جاتا ہے۔

اس کی دلی تمنا اور خواہش تھی۔ مگر عیسائی کمیونٹی   اِس کے لئے راضی نہ تھی۔ بہت بار کے مذاکرات اور ڈھیر ساری پیشکش کہ خلیفہ، اس کے عوض نہ صرف انہیں چرچ بنا کر دے گا بلکہ وہ دیگر جگہوں پر ان کی مزید عبادت گاہوں کی تعمیر کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ یوں اس کی تعمیر ممکن ہوئی۔ ولید اِسے بہت خوبصورت، بہت منفرد اپنی مثال آپ جیسا شاہکار بنانے کا خواہاں تھا۔ سچی بات ہے اور وہ اس میں کامیاب ہوا۔

حقیقتاً یہ مسجد قدیم دمشق کا حُسن ہے۔ اس کی خستگی بھی اور نیا پن بھی۔ بیچاری نے زمانے اور حملہ آوروں کے عتاب بھی بہت سہے۔ کئی بار تو لٹیروں کے ہاتھوں لٹی۔ سب سے بڑے لٹیرے تو منگول اور ترکمان تھے۔ سب گہنا پاتھ اُتارا اور اِسے ننگی بچھی کر کے چھوڑ گئے۔ پھر آگ کو بھی اِسے معدوم کرنے کا شوق چرایا۔ مگر اِس کا بگڑا و گڑا کچھ نہیں۔ پہلے سے زیادہ حسین اور پر وقار بن گئی۔

میں کھڑی ہوگئی تھی۔ چلنے لگی تھی۔ اس کے وسیع و عریض صحن میں جس کی ٹائلیں بے حد خوبصورت ہونے کے ساتھ ابھی تک گرم تھیں۔ وضو والے حصّے کی طرف بڑھتے ہوئے رک رُک کر اس کی بلند و بالا دیواروں پر آرٹ کے فطرت سے متعلق صدیوں پرانے شاہکاروں کو دیکھتی، انہیں رُک رُک کر سراہتی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ دارالخزانہ جیسا شاہکار کو بھی دیر تک کھڑے دیکھتی رہی۔ اِس کے ہشت پہلوؤں کی نقاشی بھی کس کمال کی تھی۔

دمشق کے شہریوں کی قیمتی اشیاء رکھنے کا محفوظ سٹور۔ کہیں عباسیوں کے دور میں اسے بنایا گیا تھا۔ اس کے دروازے کے تالے کی سات چابیاں اس کے مقرر کردہ سات محافظوں کے پاس ہوتی تھیں۔ دروازہ ساتوں کی موجودگی میں کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ اِس سسٹم کی کامیابی نے پھر مزید شہروں کی بڑی مسجدوں میں بھی ایسے بیت المال کھولنے کی حوصلہ افزائی کی۔

سامنے بپتسمہ کے حوض نے توجّہ کھینچی تھی۔ مسجد کا ہال دبیز قالینوں سے اور اُس کی محرابیں قرآنی آیات سے سجی تھیں۔ یہاں میں نے عصر کی نماز پڑھی۔ سکون سے بیٹھ کر کتاب کھولی۔ یہ کیسی حیرت انگیز سی بات تھی کہ جو صفحہ کھل کر سب سے پہلے سامنے آیا وہ اُمیّہ مسجد سے متعلق تھا۔ مسرت و انبساط سے پڑھنے لگی تھی۔

میں اُمیہّ مسجد کے صحن میں داخل ہوتا ہوں
آداب کہتا ہوں ہر ایک کو
کونے سے کونے تک
ٹائل سے ٹائل تک
ہر جا بکھرے کوفی رسم الخط کو
اِس باغ میں گھومتا پھرتا ہوں
اور
خدا کے خوبصورت لفظوں کے پھول
چُنتا ہوں
پہلے مینار کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں
پیار کے لفظ بولتے ہوئے
ایک صدا ایک پکار
سنائی دیتی ہے
آؤ چنبیلی کے پھولوں کی طرف
آؤ چنبیلی کے پھولوں کی طرف

محراب کے پاس ہی حضرت یحییٰ علیہ السلام کا روضہ مبارک ہے۔ یہاں ان کا سر مقدس ہے۔اِس ضمن میں جو کہانی ہے وہ کچھ زر، زن اور زمین کی فلاسفی سے ہی متعلق ہے کہ رومی یہودی بادشاہ نے اپنی کسی بھتیجی سے شادی کرنی چاہی۔حضرت زکریا علیہ السلام کے روکنے پر دونوں مشتعل ہو گئے۔ لڑکی کی فرمائش پر اُن کا سر کاٹ کر پیالے میں رکھ کر اُسے پیش کیا گیا۔ان کا مدفن بہرحال پچی کاری کے کام کی خوبصورت تصویر ہے۔

ہال کے عالی شان دروازے، چوب کاری کے کام کے عمدہ ترین نمونہ تھے۔ پچی کاری اور

رنگین شیشوں کا کام دلا آویز تھا۔ مسجد کا وہ حصہ دیکھا جو مقام راس سیدنا الحسین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہت رش تھا یہاں۔ ایرانیوں کی کثرت تھی آہ وفغاں کی فضا تھی۔ نقری جالیوں سے ہی آنکھ چسپاں کی۔ اندر کا تو منظر واضح نہیں تھا۔ ہاں البتہ منتوں مرادوں کی لیریں ضرور لہراتی تھیں۔

عصر کی نماز سے فراغت کے بعد میں صحن میں آ کھڑی ہوئی۔ شام کے باوجود صحن ابھی بھی گرم تھا۔ سچی بات ہے اس کی انفرادیت میں سب سے نمایاں پہلو اس کی سادگی اور عظمت کا رچاؤ ہے۔ دوسرے وہ تین مینار ہیں جو تینوں سٹائل میں منفرد ہیں۔ ہاں البتہ صحن میں بنا چوکور مینار سب سے بلند ہے۔ مشرقی سمت کا بلند مینار حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہے۔ اسے دیکھنا اور یہ جاننا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ پاک ہستی ظہور پذیر ہوگی۔ جو یہودیوں سے لڑے گی۔ دجال کا سر قلم کرے گی۔

یہیں میری ملاقات فلسطینی عورتوں اور بچوں سے ہوئی۔ فلسطین جن کا وطن تھا۔ جو اپنے وطن نہیں جاسکتے تھے۔ ان کے آنسو تھے۔ اُن کے نوحے تھے۔ امریکہ اور اسرائیل پر تبرّوں کی بوچھاڑ تھی۔ اِس دلکش لڑکی جس کا نام فاتن Fatin تھا نے یروشلم کی نظم سنائی۔ یروشلم جہاں اس کے والدین کا گھر تھا۔ جس سر زمین پر اس کے آباواجداد صدیوں سے رہتے تھے۔ جنہیں دیس نکالا مل گیا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر 6:

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

یہ 2012ء ہے۔ جولائی کے دن ہیں۔ چار سال ہوتے ہیں۔ اپنے ملک اپنے شہر اپنے گھر میں بیٹھی اپنے ملک کو خون میں نہاتے دیکھتی ہوں۔ تو آہوں اور آنسوؤں کے سیلاب میں بہتے بہتے معلوم ہوتا ہے کہ جس پر چاہتوں اور محبتوں سے آج کل لکھ رہی ہوں۔ جس کے کوچہ بازاروں میں گھومتے پھرتے، جس کے خوبصورت لوگوں سے اپنی ملاقاتوں کا حال احوال لکھتے ہوئے جانتی ہوں کہ وہ بھی آگ میں جلنے لگا ہے۔

تب بے اختیار ایک خیال آتا ہے تو پھر وہ ساری باتیں، وہ ساری پیشین گوئیاں اور وہ سارے قیافے درست تھے جنہیں سن سن کر انہیں پس پشت ڈالتی جاتی تھی۔

کلیجہ منہ کو آنے لگا ہے۔ حسین شاپ کے عبداللہ ال جازر کا کارڈ جسے میں نے اپنی نوٹ بک پر چپکایا ہوا ہے۔ وہ ای میل ایڈریس میں نے اپنی کمپوزر سعدیہ علی کو دیا ہے۔ صاحب نظر و صاحب فکر آدمی۔

میرا اندر پتہ نہیں کیوں اس شعر کا ترجمان بنا ہوا تھا؟

اے عندلیب آؤ کہ مل کر کریں آہ وزاری

تو ہائے گل پکارے میں ہائے دل

میں نے لکھا تھا ایک پاکستانی خاتون کہیں آپ کی یادداشتوں میں شاید ہو۔ آپ سے میری دمشق میں چند ملاقاتیں رہی تھیں۔ آپ کا ملک جس ابتلا سے گزر رہا ہے۔ میں اس پر بہت دکھی ہوں۔

اور آپ کے دکھ میں شریک ہوں۔کیا آپ مجھے جواب دیں گے؟

جواب مجھے ملا ہے۔اُن کی طرف سے نہیں۔اُن کے بیٹے کی طرف سے۔جس نے لکھا ہے میرے والد بیمار تھے۔اُن کے پتّے میں پتھریاں تھیں۔بیروت میں اُن کا آپریشن ہوا ہے۔اب وہ بہت بہتر ہیں۔چند دنوں تک واپسی کی امید ہے۔

دمشق خدا کی رحمت اور اس کے عتاب دونوں کی زد میں ہے۔مضافات میں شدید لڑائی ہے۔شہر میں بھی کہیں کہیں اور کسی کسی دن اثر زیادہ ہوتا ہے۔

تاہم شہر جی داری سے زندگی کے معاملات میں اگر الجھا ہوا ہے تو وہیں سہا ہوا بھی ہے۔چند دکھ بھرے واقعات کا تذکرہ تھا۔بہت سی تصویریں تھیں۔امیہ مسجد سے متعلق یہ خبر پڑھتے ہوئے میں ملول ہوں۔عبداللہ ال جازر کے بیٹے سلیمان نے لکھا ہے۔

ابھی دو دن پہلے امیہ مسجد کے صحن میں بم گرا تھا۔داخلی دروازے کے پاس ہی۔مرمت کا کچھ کام ہو رہا تھا۔دروازے، دیواریں، فرش اور وہ سارا حصّہ گڑھوں اور ملبے کے ڈھیر میں بدل گیا۔اندر نمازیوں میں بھگدڑ مچی۔میڈیکل کالج کے چند طلبہ بھی نماز کے لئے آئے تھے۔ابھی تھوڑی دیر قبل وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اندر گئے تھے۔یہ دمشق سے نہیں تھے۔کچھ لاطا کیا Latakia، کچھ حمص اور کچھ حلب کے تھے۔ہوسٹل کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں آٹھ آٹھ نو نو ٹھنسے ہوئے۔جب امن کا زمانہ تھا تب اِن کمروں میں دو سے زیادہ طلبہ کو نہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔

ایسی ہی دکھ بھری باتیں کرتے کرتے وہ مسجد کے اندر گئے تھے۔وہ جو ابھی چند لمحے قبل ہنستے قہقہے لگاتے تھے۔ان میں سے دو شہید اور چند زخمی ہوئے۔مزدور بہت زخمی ہوئے اور شہیدوں کی تعداد بھی کافی تھی۔

''ہماری دکان کو کافی نقصان پہنچا ہے۔کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے سے دو ملازم لڑکے بھی زخمی ہوئے۔''

میری آنکھیں گیلی ہوگئی ہیں۔میری بصارتوں میں وہ سارے لمحے، وہ ساری ساعتیں دوڑ

دوڑ کر آئی ہیں جو میں نے اس کے مستطیل آنگن میں گزاری تھیں۔ یہ مسجد اگر دمشق کا دل تھی تو میرے دل نے بھی اسے مرکزِ ثقل جانا تھا۔ ادھر گھومتی، ادھر گھومتی پھر اس کے چرنوں میں آ کر بیٹھ جاتی۔

اردگرد کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی رہنے والی عورتوں کا یہ ریٹائرنگ روم اور ان کی گپ شپ کی جگہ تھی۔ ڈھلتی شاموں میں جب اس کی بلند و بالا دیواروں کے اوپری حصّے افق پر بکھری سورج کی طلائی کرنوں میں نہا رہے ہوتے۔ اس کا کریم رنگی فرش دوپہر کی تمازتوں کو خارج کر کے معتدل ہو چکا ہوتا۔ سیاہ عبایا پوش عورتیں اس پر دائروں کی صورت پھسکڑے مار کر بیٹھ جاتیں اور گپ شپ کے سیشن شروع کرتیں۔ بچے سارے میں بھاگتے پھرتے۔ کبوتروں کے غول آنگن میں پلپیں ڈال رہے ہوتے۔

یہ منظر مبہوت کرنے والے ہوتے تھے۔ یہ مجھے دیر تک وہاں بٹھائے رکھتے۔ شام دھیرے دھیرے کہیں دور گم ہوتی چلی جاتی۔

میں انہی منظروں میں گم اب ایک بار پھر اِسے بت بنی دیکھتی ہوں۔ دمشق کا آسمان دھوئیں اور آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا ہے۔ امیہ مسجد کہیں گم ہوئی پڑی ہے۔ اس کا حُسن گہنایا ہوا ہے۔

تو اب جاہدال احمد یہ کی درد میں ڈوبی نظم پڑھیئے اور شام کی دھرتی کے بیٹوں کا کرب دیکھئے۔

شام کے آسمان پر چمکتے دو چاند\
یہ ہم ہیں\
دیکھو دل کے دریا پر معلق پل کی\
کس ورید سے خون بہہ رہا ہے\
اور فاصلے کم نہیں ہو رہے\
فرات کے لبوں سے چاہت کے دو لفظ بولے گئے ہیں\
اور تیسرا ماتم زدہ ملک کے لئے ہے\
تکلیف بھرے دو سال اور اب تیسرا بھی\
اُس لکھے ہوئے کو ٹال رہا ہے جو

تقدیر کے قلم سے لکھا گیا ہے
چنبیلی کے پھولوں جیسے شام
تمہارے خوبصورت نخلستان
جنہیں
آنکھوں کے دامن کی ہریالی چھوتی ہے
جو اُفق کی نیلاہٹ پر بھی ختم نہیں ہوتی
ہماری سڑکیں میجانا اور اتابا سے کتنا گونجتی ہیں
اور ہم تھکن زدہ لوگوں کے لئے کتنی شراب بہاتے ہیں
خدارا ہمارے خواب نہ نوچو
خدارا! اپنے دروازے ہمارے محبوبوں کے لئے بند نہ کرو
ہمیں ہچکچاہٹوں سے نکال لو
ہمیں گناہوں میں نہ پھنساؤ جو ہم نے نہیں کئے
ہمیں اپنے وطن کے سہارے اونچا اُڑنے دو
تاکہ ہم دہرے موسموں کے عذابوں سے بچ سکیں
☆☆☆
جاہد ال احمدیہ

باب نمبر 7:

ثمر یزبک شام میں انقلاب کے لئے آخری حدوں تک جانے والی جی دار خاتون

- ایئرفورس کے پاکستانی ہواباز وں نے یوم کپور جنگ میں بڑا تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔
- علوی فرقے سے تعلق کے باوجود ثمر اسد حکومت کی بہت بڑی مخالف اور ناقد ہے۔
- A woman in the crossfire اِس کی جدوجہد کی کہانی ہے۔
- کیا ISIS، کیا القاعدہ، کیا داعش سب غیر ملکیوں کی آلہ کار ہی نہیں، راہزنوں اور لٹیروں کے ٹولے ہیں۔
- یورپ کی نوجوان مسلم لڑکیوں کا ISIS اور داعش جیسی تنظیموں میں شمولیت دراصل اُن کی ایک تھرل فینٹسی ہے۔

2008ء کے اُن دنوں جب میں دمشق میں تھی۔ ایک گرم سی صبح عرب رائٹرز یونین کے مزہ Mezzeh میں واقع دفتر شامی لکھاریوں سے ملنے لگی۔

مزہ Mezzeh میں دفتر ڈھونڈ نا مصیبت بن گیا تھا۔ چلوز ینبیہ کا عباس ہوتا تو سود ید سولحاظ والا معاملہ یقینی تھا کہ وہ جگہیں ڈھونڈ نے میں ڈنڈی نہیں مارتا تھا۔ مگر اس ڈرائیور نے تو ماتھے پر آنکھیں رکھی ہوئی تھیں۔ بڑا ہی بدلحاظ اور بے مروتا سا۔ بارے خدا ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے رک کر اُس نے بتایا کہ یہی آپ کی مطلوبہ جگہ ہے۔

سچی بات ہے بڑی متاثر کن عمارت تھی۔ بڑے بڑے شاندار آراستہ پیراستہ کمرے ۔ پبلیشنگ سے متعلق مختلف شعبے، ہال، کیفے ٹیریا۔

میں نے چلتے ہوئے خیال ہی نہیں کیا کہ دن جمعے کا ہے۔ ہمارے لوگوں اور مسجدوں کی طرح دمشق میں بھی جمعے کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ لوگ بارہ بجے ہی دفتر خالی کر جاتے ہیں۔

''جی جمعہ پڑھنا ہے۔''

ساڑھے نو بجے تو ہوٹل سے چلی تھی۔ جگہ ڈھونڈ نے میں خجل خواری بھی بہت ہوئی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جب مطلوبہ جگہ پہنچی۔ پہلے تو پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں ماریں۔ کسی ذمہ دار فرد کی متلاشی ہوئی۔ یونین کے چیئر مین بارے جانا کہ وہ تو کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ ڈائریکٹر بھی غائب تھے۔

ہاں البتہ رابطہ آفیسر قاسم دبیسے ملنا ہوا۔ جنہوں نے کہا تھا۔

'' آپ کیسے وقت آئی ہیں؟ لوگ جمعے کی وجہ سے چلے گئے ہیں۔ ذرا جلدی آتیں تو بہت سے لوگوں سے ملنا ہو جاتا۔''

اُن سے تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔ میں نے سوال تو بہتیرے نو کیلے کئے مگر مجال تھی کہ کسی ایک کا جواب مجھے منفی شکل میں ملا۔ صحافیوں اور ادیبوں کے لئے حکومت کی عنایات ونوازشات کی لمبی چوڑی فہرست گنوادی۔ گھر کے لئے قرضے اور طبّی سہولتوں کا ذکر بڑی شدومدّ سے کیا۔

سیریا کی ادبی روایات اس کے خوبصورت امیرانہ ثقافتی ورثے کی طرح بہت حسین ہیں۔ اس نے بہت سی مشکلات اور سختیوں کو سہا ہے۔ وضاحت ہوئی تھی۔

اُن کے اضطراری سے انداز، کلائی کی گھڑی کو دو تین بار اچٹتی سی نگاہ سے دیکھنے کی فضول سی کوشش نے مجھے تنبیہ کی۔

''پاگل ہو اُٹھو۔ وہ تم سے جان خلاصی چاہتا ہے اور تم چمٹی جاتی ہو۔''

بہر حال جو مسئلہ تھا وہ بھی جلد ہی سمجھ آ گیا تھا کہ ہم اکٹھے ہی باہر نکلے تھے۔ مرکزی دروازے سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لیتے ہی وہ آہستگی سے بولے تھے۔

''کمروں میں کیمرے نصب ہیں۔ گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔''

''اوہو۔''

ثمر یز بک سے ملنا بھی ایک خوبصورت تجربہ تھا۔ اس کا ایڈریس قاسم دیبے نے دیتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ اُس سے ضرور ملئے۔ بہت ہی منفرد صلاحیتوں کی حامل خاتون ہے۔ رائٹر اور جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ فلم سکرپٹ، ٹی وی ڈرامہ رائٹر، ہیومن رائٹس ایکٹیوسٹ اور وویمن رائٹس کی علم بردار ہے۔ دبنگ عورت آپ کے سوالوں کے جواب زیادہ عمدگی سے دے گی۔ یہیں مزہ میں ہی فی الحال اپنی ایک عزیزہ کے پاس چند دنوں کے لئے رہ رہی ہے۔''

پتہ بھی انہوں نے دیا اور جائے وقوع بھی اپنے کارڈ پر لکھ دی کہ ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھنے میں سہولت رہے۔

''سمر بڑی دبنگ ہے۔ آپ کو اُس سے ملنا یقیناً اچھا لگے گا۔''

خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہی ایک بار پھر اسی بات کو دہراتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ عرب روایات کے برعکس انہوں نے مجھے لفٹ کی پیش کش نہیں کی۔ کیا یہاں بھی انہیں کوئی خوف لاحق تھا یا بے اعتنائی تھی؟

میں نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ خوش قسمتی کہ سواری بھی فوراً مل گئی اور گھر کی تلاش میں بھی زیادہ بھٹکنا نہ پڑا۔

چار منزلہ فلیٹ کے پہلے فلور پر جب گھنٹی پر ہاتھ رکھا میرا دل دھڑک رہا تھا۔ جانے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ پروردگار اب اتنی تخجل ہوئی ہوں تو ملاقات ہو جائے۔ جب کسی بندے کی شخصیت میں اتنے بہت سے اوصاف شامل ہوں۔ وہ اتنی جہتوں کا مالک ہو تو پھر اُس کا ملنا کارے دارد والے معاملے جیسا ہی ہوتا ہے۔

ایک سیاپا کہہ لیجیے یا احساس کمتری کا احساس جو کچھ اپنے لباس اور حُلیے کے سلسلے میں تھا کہ ایک تو پانچ چھ کلو کا عبایا پہنے ہوئے ہوں۔صورت ویسے ہی مسکینوں جیسی ہے۔ ویسے میں اِن عبایوں حجابوں سے قطعی باغی عورت ہوں۔صورت تو اللہ کی دین ہے اور پیدائش کے لئے گھر گھرانہ بھی کہیں اس کی ہی کسی منصوبہ بندی میں شامل ہے۔اس لئے کٹر قسم کے دینی گھر میں میرا نزول بس تھوڑے عرصے تک کے لئے ہی حائل ہوا۔ پھر اس نے بہتیرے چور راستے ڈھنڈو لئے تھے۔شادی کے بعد ڈھیل ہی ڈھیل تھی۔تاہم اب اس عراق والے سیاپے نے تو یہ سب مجبوراً پہنا دیا تھا۔

بہر حال شامی عورتیں بہت حسین دلبر سی اور انتہائی فیشن ایبل ہیں۔حجاب اور عبایا پہننے والیاں بھی کون سا کسی سے کم ہیں۔نک سُک سے آراستہ چاند کی طرح چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں۔

اب سیڑھیوں پر رُک کر ہلکا سا سپرے کیا تھا۔ بالوں کو درست اور تھوڑا سا ہونٹوں کو لال کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ایسا سب کرتے ہوئے دل ذرا سا بھی مطمئن نہیں تھا۔کمبخت یہ تو اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے والی بات تھی۔مگر کرتی کیا؟ سدا سے ایسی الّلی بلّلی ہوں۔

بہر حال یہ سب کرنے کے بعد بسم اللہ پڑھ کر بٹن پر انگلی رکھ دی۔

میری بیٹی کی عمر کی ہوگی وہ جس نے دروازہ کھولا تھا۔خوبصورت، دل کش خدوخال اور سنہری بالوں والی۔ ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر چند لمحوں کی حیرت اُس کے چہرے پر بھی بکھر گئی تھی۔ میں نے دیر نہیں لگائی۔فوراً ہی تعارف کروا دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ جب اُس نے پاکستان کا نام سنتے ہی مجھے گرم جوشی سے پذیرائی دی اور آنے کا راستہ دکھایا۔ یہ بے حد خوبصورت اور آراستہ پیراستہ فلیٹ تھا۔ لیونگ روم میں آکر بیٹھنے تک کے وقفے میں میری نظر بازی نے مکینوں کی خوش حالی وخوش ذوقی کی کہانی

سنادی تھی۔ثمر کی آنکھیں ہیرے جیسی چمک لئے جگمگاتی سی تھیں۔

مگر بڑا سیاپا پڑا۔ثمر انگریزی میں نری پیدل تھی۔اس کے ہاں بس کہیں کہیں ایک آدھ جملے کی ہی گنجائش تھی۔مگر اوپر والا بھی بڑا رحیم و کریم ہے۔بندے کو مشکلات سے نکالنا جانتا ہے۔سفر میں اس کے لئے خیر و برکت کے دروازے کھولنا فرض سمجھتا ہے۔

یہی بس اس وقت ہوا جب کمرے میں ایک ایسی خاتون داخل ہوئی جو اُدھیڑ عمری کے باوجود ایسی حسین تھی کہ بس ٹک ٹک دیدم و دم نہ کشیدم والا معاملہ تھا۔میرے اس درجہ جذب کو اس نے پسندیدگی سے دیکھا اور مسکرادی۔

اُس کی انگریزی بھی لاجواب تھی۔اتنی لاجواب کہ گمان پڑتا تھا کہ اصلاً نسلاً انگریز ہے۔مگر نہیں وہ ثمر یزبک کی رشتے دار تھی۔اس کی ماں کی عزیز۔وہ اسامہ بن لادن کی پہلی بیوی کی بھی رشتے دار تھی۔ڈھیروں ڈھیر باتیں تو بعد میں ہوئیں۔ثمر اور میرے درمیان ترجمانی کے فرائض بھی اس نے بعد میں ادا کئے۔پہلے ایک بڑا سنسنی خیز سا انکشاف ہوا جو کسی طور ایک دلچسپ سی کہانی سے کم نہیں تھا۔

تو قصّے کا آغاز 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ جسے یوم کپور کی جنگ بھی کہتے ہیں سے ہوا۔زمانہ بھٹو کا تھا جو عرب ممالک کے کم و بیش سبھی حکمرانوں کے یاروں کے یار تھے۔درخواست شام کے حافظ الاسد کی جانب سے آئی تھی کہ انہیں چند بہترین جنگی ہوابازوں کی ضرورت ہے۔

اِس جنگ میں حصہ لینے کے لئے پاکستان ایئر فورس کے چند جیالے پائلٹ شام سدھارے جنہوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور کسی حد تک فتح کو ممکن بنانے میں مدد دی۔اسرائیل کو اپنی ہزیمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

یہاں تک تو جو واقعہ تھا اس سے میں خود بھی تھوڑی سی واقف تھی۔مگر آگے جو سننے کو ملا وہ بڑا دلچسپ تھا۔

جنگ کے بعد اِن ہوابازوں کو حافظ الاسد نے اپنے صدارتی محل میں خصوصی ڈنر پر مدعو کیا۔یہ ایک طرح دوست ملک کے لئے اظہار محبت تھا۔اظہار ممنونیت تھا۔اسد فیملی کے چند افراد بھی مدعو

تھے۔حافظ الاسد کی بیوی کی ایک کزن بھی تقریب میں مدعو تھی۔

اور یہ کزن اہل وہی خاتون تھیں۔پاکستانی ہوابازوں میں تین چار بہت وجیہہ صورت، دراز قد اور بڑی ڈیشنگ قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ پتہ چلا کہ ایک پاکستانی پائلٹ تو ایسا بھایا کہ میل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر لیا۔ میں نے نام جاننے کی بہتیری کوشش کی مگر انہوں نے گریز کیا۔ پاکستانی شادی شدہ دو بچوں کا باپ تھا۔اِس کہانی کا انجام تو بہر حال المیہ ہی تھا۔تاہم اس کے طوفانی قسم کے عشق کی داستان بہت عرصے تک خاندان میں گردش کرتی رہی۔

ثمر کا فیملی پس منظر علوی فرقے سے ہے۔وہ جبلہ Jableh ایک ساحلی علاقے جولا طاکیہ کے قریب ہی واقع ہے 1970ء میں انتہائی دولت منداور صاحب ثروت Alawi گھرانے میں پیدا ہوئی۔پانچ بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے منفرد انقلابی سوچ وذہن رکھنے والی باغی سی بچی تھی۔

اپنے بھائیوں کے مقابلے میں اُس کا طرز زندگی کیوں مختلف ہے؟ نوک ٹوک کا سلسلہ لڑکیوں کے ساتھ زیادہ کس لئے ہے؟ ترجیح لڑکوں کو کیوں دی جاتی ہے؟

اور وہ سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔

میں آزادی چاہتی تھی۔اس ماحول میں میرا دم گھٹتا تھا۔ ہمارے روایتی معاشرے میں یہ بڑی قبیح حرکت تھی۔ایک لڑکی کے لئے۔لوگوں کا خیال تھا کہ میرے ساتھ کوئی مرد ہے۔جو کہ بالکل غلط تھا۔ مجھے تنہا اپنا مستقبل خود بنانے میں دلچسپی تھی۔ میں رائٹر بننے کی خواہش مند تھی۔لکھنا چاہتی تھی۔معاشرے کے دوغلا پن اور منافقتوں پر کھل کر بات کرنے کی متمنی تھی۔

''مجھے اعتراف ہے کہ اپنی فیملی کے لئے میں اذیت اور شرمندگی کا باعث رہی۔اکثر مجھے ندامت بھی محسوس ہوتی تھی۔''

انیس سال کی عمر میں وہ ایک بار پھر بھاگی۔کچھ عرصہ اکیلا رہنے کی بعد اُس نے شادی کر لی اور پیرس چلی گئی جہاں بیٹی بھی پیدا ہوئی۔شادی صرف چار سال رہی۔دوسالہ بیٹی کے ساتھ وہ پھر دمشق میں آ گئی۔ بہت سے کام شروع کئے۔ڈرامے، فلم سکرپٹ، ڈاکومنٹری بنانے کا سلسلہ۔ وویمن آف

سیریا جیسے پرچے کی ادارت۔ انتون مقدسی Anton Maqdesi شام کے عظیم مفکر، سیاست دان اور انسانی حقوق کا علمبردار جیسی شخصیت پر ڈاکومنٹری بنائی۔ ہیومن رائٹس اور وویمن رائٹس کے لئے کام شروع کردیا۔

یہ اُس کے لئے کس قدر مشکل وقت تھا۔ ناولوں کی اشاعت سے قبل بہت سے دیگر شعبوں میں کام کرنے سے گو اُس نے اپنے معیار زندگی کو غربت سے تھوڑا سا اوپر ضرور رکھا تاہم اپنے خاندان اپنے بیشتر عزیزوں سے کسی قسم کا کوئی میل جول نہیں رکھا۔ شہر سے باہر مضافاتی علاقے میں ایک کمرے کے گھر میں رہتی رہی۔

اُس کے ناول طفلت اس سماء Tiflatas Sama (آسمانی لڑکی) اور سلسل salsal نے بڑی دھوم مچائی۔ اِن ناولوں نے شامی معاشرے میں موجود منافقتوں، دوغلا پن اور دیگر بہت سی قباحتوں کو عریاں کیا۔

دمشق میں گزرے میرے خوبصورت دنوں میں ایک مزید حسین دن کا اضافہ ہوا۔ دل میں سدا بسیرا کرنے والی یادوں میں ایک مزید یاد شامل ہوئی۔ اُن کے گھر اُس دن ملقوبہ پکا تھا۔ چاندنی کی سینی میں اُس کی خوش رنگی بہت بھائی۔ ذائقہ بھی کمال کا تھا۔ زیتون کے کالے اور سبز پھل میں جھانکتے کھیرے کے قتلوں اور قہوے نے لطف بڑھایا۔

دوپہر گزرنے اور شام اُتر آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ جب میں رخصت ہوئی۔ میں نے ثمر کا سیل نمبر اور ای میل ضرور لیا۔ تاہم پاکستان آنے کے بعد کبھی اُس سے رابطہ ممکن نہ ہوا۔

اُس کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی تحریک ڈاکٹر ہدا کی اُس میل سے ہوئی تھی۔ جب جنگ کے دنوں میں وہ مجھ سے رابطے میں تھی۔ دو لائنوں کی خبر نے بھولی بسری یاد کو تازہ کردیا تھا۔

کچھ احمد فاضل، کچھ ڈاکٹر ہدا اور کچھ انٹرنیٹ سے میں نے اُس کے بارے مزید جانا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ تلخ ہوتی گئی۔ انقلاب اور جمہوریت کی باتیں کرنے لگی۔ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھی۔ 2011ء میں جب مزاحمت شروع ہوئی۔ اُس نے بلند آہنگ زبان

میں صرف ایک نعرہ لگایا تھا۔

یہ انقلاب ہوگا۔غریب کا امیر کے خلاف، کمزور کا طاقتور کے خلاف اور جمہوری روایات کا آمریت کے خلاف۔

2012ء میں اُس کی بڑی منفرد قسم کی کتاب A Woman in the Cross Fire مارکیٹ میں آئی۔ یہ ناول نہیں ڈائری ہے۔ کسی ڈراؤنے خواب کی مانند یہ کتاب اس جدوجہد کی کہانی کو پرت در پرت کھولتی ہے۔ جب وہ اسد حکومت کے خلاف مظاہرین کے ساتھ سینہ تان کر کھڑی تھی۔ پن pen انٹرنیشنل سوسائٹی ایوارڈ کمیٹی نے اسے ایوارڈ سے نوازا۔ احتجاجی مظاہروں میں وہ مار کھاتی، بے عزتی کرواتی۔ متاثرین کے زخموں پر پھاہے رکھتی۔ اسپتالوں میں بھاگتی، اخبارت کو مضمون بھیجتی۔ بیٹی کے ساتھ جگہیں اور گھر تبدیل کرتی تھی۔

اس کے شب روز مظاہرین کے انٹرویو لینے، اسپتالوں میں ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرنے، گلی محلوں میں متاثرین کو چیزیں فراہم کرنے اور یہ سوچنے کہ وہ اپنے ملک اور اس کے لوگوں کے لئے مزید کیا کر سکتی ہے؟ جیسی سوچوں اور کاموں میں گزر رہے تھے۔

یہی وہ دن تھے جب اُسے دھمکیاں بھی ملتیں۔

چاقو ہمیشہ ایک سہارے کے طور پر اس کے ساتھ ہوتا۔ ایسے ہی دنوں میں سیکورٹی فورسز کے چند لوگ اس کے گھر آئے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُسے ایک ایسی جگہ لے گئے جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ اُس کی کلائی کو جلایا گیا۔ زدوکوب کیا گیا۔ ذرا سا ہوش سنبھالنے پر اس نے اپنا چاقو نکالا اور تشدد کرنے والے پر پل پڑی۔ مرد نے دھکا دے کر اُسے زمین پر گرایا۔ کچھ دیر بعد اُسے اٹھایا گیا اور دو آدمی اُسے ایک اور سیل میں لے گئے جہاں اس نے تین نوجوان مردوں کو دیکھا۔ اُن کے ہاتھوں پر دھاتی شکنجے چڑھے ہوئے تھے۔ اُن کی انگلیوں کے ننگے سرے زمین کو چھوتے تھے۔ انہوں نے اُسے ایک جگہ کھڑا کیا۔ ایک نے اُس کا سر اوپر کیا۔ ایک ماسک سا جس میں سے صرف اس کی ناک باہر تھی پہنایا۔ اس کے بعد وہاں کیا تھا؟ چیخیں۔ کراہیں، دردناک منظر، خوفناک سانس کو روکنے والے لمحے۔

ہمت تو اس نے ان سب کے باوجود نہیں ہاری تھی۔

ہاں مگر وہ بڑا کٹھن وقت تھا۔

دراز قد، خوبصورت، حسین آنکھوں اور سرخ و سفید رنگ والی بیٹی ماں کی حرکتوں سے بہت عاجز تھی۔ سکول میں تھی تو کلاس فیلوز کے طعنے سنتی تھی۔ پاؤں پٹخ پٹخ کر وہ کہتی۔ مظاہروں میں جانے کی بجائے گھر میں رہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ گھر لاک کر جاتی۔

مجھے اپنی ماں پر فخر ہے۔ مگر میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی ہوں جو خوف اور تناؤ سے بھری ہوئی ہو۔ انقلاب کے لئے خود کو مصیبتوں میں ڈال لو۔ مجھے ایسا انقلاب نہیں چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے ناراض رہتی تھی۔

ثمر لکھتی ہے۔ گزشتہ جمعے کو جب میری بیٹی کو اطلاع ملی کہ اُس کی ماں ہٹ لسٹ پر ہے۔ اُس نے شدید غصیلے انداز میں کہا کہ میں ٹی وی پر جا کر صدر سے اپنی غیر مشروط معافی کا اعلان کروں۔ انکار پر جب ظالمانہ ہتھکنڈے میری بیٹی کے خلاف استعمال کرنے کی دھمکی ملی۔ اُس نے مجھے ہلایا اور رلایا ہی نہیں بلکہ اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ بیٹی میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔

فرانس بھاگنے اور وہاں پناہ لینے کا فیصلہ میرے لئے بہت کٹھن تھا۔ شام کو چھوڑتے ہوئے مجھے افسوس نہیں گہرا دکھ تھا۔ کرب تھا جو میرے اندر سے آہوں اور آنسوؤں کی صورت نکلتا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں اپنے ملک سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔

مجھے لگتا تھا جیسے میرا دم گھٹ جائے گا جیسے میں شام سے دور جا کر زندہ نہ رہوں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں دنیا گھومنے کی خواہش مند تھی۔ فرانس ہمیشہ سے میرا بہت پسندیدہ ملک ہے۔ میں بار بار یہاں آنا یہاں رہنا پسند کرتی تھی۔ مگر میں نے بہت آنسوؤں میں خود سے کہا تھا۔

''ایسے اور اِن حالات میں تو میں نے کبھی آنے کی خواہش نہیں کی تھی۔''

بہت دنوں دکھ کے الاؤ میں جلنے کے بعد میں نے خود کو سنبھالا۔ حوصلہ دیا۔ خود کو اُمید کی ایک نئی راہ دلائی۔

ہمیں ابھی انتظار کرنا ہے۔ اپوزیشن بھی اپنے راستے سے بھٹک گئی ہے۔ اس میں غلط لوگ شامل ہوگئے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے مفادات کا ٹکراؤ ہونے لگا ہے۔ اِس وقت صورت بہت گھمبیر ہے۔

حقیقی انقلاب تو اُس وقت شروع ہوگا جب اسد اپنے تخت وتاج سے اُترے گا۔ عورتوں کی حقیقی آزادی اسی وقت ممکن ہوگی ایک تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر بالغ معاشرے کی تکمیل تبھی ممکن ہو سکے گی۔

2015ء میں وہ پھر اپنے مادرِ وطن گئی۔ خیر خواہوں نے کہا مت جاؤ۔

''نہیں میں بہت مضطرب ہوں۔ بہت بے چین ہوں۔ وہ ترکی کے بارڈر سے باڑ کے ایک چھوٹے سے موگھے سے رینگ کر اس سرزمین پر داخل ہوئی جو اُس کی اپنی تھی۔ جس کے لوگ اس کے اپنے تھے۔

یہاں فری سیریئین آرمی اور ISIS کی کہانیاں تھیں۔ سپاہیوں، بچوں، عورتوں اور مردوں کے دکھوں کی کہانیاں اور درد بھری داستانیں تھیں۔

لاشیں اٹھاتے گھروں کو برباد ہوتے، بچوں کو مرتے دیکھنا کتنا کٹھن تھا۔ My Journey to the Shattered Heart of Syria اس کی روزمرہ یادداشتوں پر مبنی دستاویزی کتاب ہی نہیں بلکہ ایک ادبی شاہ پارہ ہے۔

تقریباً ایک سال کے عرصے میں اس نے تین بار ترکی کے راستے سرحد پار کی۔ دو بار اندر داخلے کی کوشش بہت اذیت ناک تھی۔ خاردار تاروں نے کمر کو لہولہان کر دیا تھا۔ اِن ملاقاتوں نے اُسے جہادیوں کے اصلی چہرے دکھائے۔ غیر ملکی شازشوں کی گہرائی سے آگاہ ہوئی۔

بہت سے سنجیدہ اور سمجھدار شامیوں کی طرح وہ بھی اِس صورت سے دل گرفتہ اور پریشان تھی کہ اسد حکومت کے جانے اور جہادیوں کے آجانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کہ یہ صرف ایک آمریت سے دوسری بدترین تنگ نظر اور متعصب آمریت کے دوزخ میں گرنے والی بات ہوگی۔

احرار الشام اور القاعدہ کے مقامی لیڈران سے اُس کا ملنا، ان کے خیالات ونظریات سے

آ گاہی بہت سے حوالوں سے اس جیسی روشن خیال خاتون کے لئے بہت مایوس کن تھی۔ وہ عورتوں اور اُن کی آزادی کے حوالے سے بے حد متعصب تھے۔ شام کے خوبصورت چہرے کے پیچھے اس کے سٹرانڈ مارتے اندر نے ویسے ہی غلاظتوں سے بھرے رہنا تھا۔ بس تھوڑا سا نوعیت تبدیل ہو جاتی۔ اُسے تو یہ بھی احساس ہوا کہ یہ جنگ تو غیر ملکیوں کی ہے۔ متشدد پسند لوگوں کی جن کی مدد بھی نہیں کی جا سکتی۔ عام سادہ لوح شامی تو بس اسی نظریئے پر ایمان رکھے ہوئے ہیں کہ یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ کی رضا تھی اور اللہ ہی بہتر کرے گا۔

ایک اور جگہ اُس نے لکھا۔

بوسنیا کی لڑائی کو دنیا نے سنجیدگی سے دیکھا اور محسوس کیا جب کہ شام کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی بجائے بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے مفادات کی آڑ لی۔

2012ء تک اُسے احساس تھا اور شاید جب بھی اس کی بات چیت باغیوں کے زیر تسلط علاقوں کے اسلامی امیروں سے ہوئی۔ اس نے یہی جانا کہ وہ سول سیکولر ریاست کے قیام کو پسند کریں گے۔ یہ احساس تو اُسے بعد میں ہوا کہ سب تو ان کی چالیں تھیں۔ ہتھیار کی اور جنگی سامان لینے کی کہ وہ تو اپنے زیر تسلط علاقوں میں نہ رشوت ختم کر سکے اور نہ جرائم۔ دوسرے اور تیسرے چکروں میں یہ تلخ حقائق اور کھل کر سامنے آئے۔ احرار ال شام کے امیر ابواحمد نے کس قدر رعونت سے کہا تھا۔

''نقاب کے بغیر کوئی عورت باہر نہیں آ سکتی۔ علوی تو شام میں رہ ہی نہیں سکتے۔ دوروز اور اسماعیلی بھی۔ ہاں اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو ٹھیک۔'' کچھ ایسا ہی رویہ القاعدہ کے لیڈر کا تھا۔ جس نے اُسے ملنے کے بعد کہا تھا۔

''تمہاری بہادری کہ تم ہم سے ملنے آئیں۔''

''آپ اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا بہادر نہیں؟''

وہ ہنسا اور بولا۔

''میں مرد ہوں اور یہ قدرتی امر ہے۔''

''اور میں عورت ہوں یہ بھی قدرتی امر ہے۔''

اُس کی ہنسی یکدم رک گئی تھی۔

مسلسل بیرل بموں سے متاثرین کے دکھوں کی تفصیلات جہاں ہرآن وہ موت کی سولی پر لٹکے ہوتے ہیں۔ایسا لگتا تھا جیسے دھرتی موت کا ہی راگ الاپتی ہے۔اسی کی عظمتوں کے گن گاتی ہے اور اسی کو اپنا فاتح قرار دیتے ہوئے اس کے قدموں میں بچھی جاتی ہے۔

پہاڑی علاقوں کے غاروں میں پناہ لینے والے ہزاروں سالوں کے اِس تہذیبی ملک کے شہری ایک بار پھر پتھروں کے زمانے میں پہنچ گئے لگتے ہیں۔

اُس نے اپنی گیلی آنکھوں کو پوروں سے صاف کرتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

وہ حکومتی نظروں میں ہی معتوب نہ تھی۔ بلکہ جہادی اور باغی قبائل کو بھی مطلوب ہوگئی تھی۔

ایک سوال کے جواب میں کہ اس نے خود کو کیوں مصیبت میں ڈالا؟ اس نے قدرے حیرت اور دکھ سے کہا۔

''مصیبت میں ڈالنا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کیا یہ میرا ملک نہیں؟ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے جنم لیا اور بڑھی پلی۔ میرے لوگ جو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں وہی میری زبان ہے۔ مجھے کیا چیز خوف زدہ کر سکتی ہے۔''

اس کے بار بار کے چکروں نے اُسے سمجھایا تھا کہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔

یہ جگہ جو کبھی بہت پرلطف روایات اور محبتوں سے بھری ہوئی بڑی ہی پرامن سی تھی ویسی نہیں رہی۔اب یہاں خوف زدہ، ڈرے سہمے ہوئے لوگ ہیں۔

یہ مذہبی خانے موجود تو پہلے بھی تھے پر اتنے گہرے کبھی نہ تھے۔ہم جب چھوٹے چھوٹے تھے تو یہ سنی، یہ شیعہ، یہ علوی۔ یہ دروز کہیں نہیں تھا۔ہم سب شامی تھے۔

ISIS کے بارے میں وہ برملا کہتی ہے کہ یہ غیر ملکیوں کی فوج ہے۔ پھر ذرا واشگاف الفاظ میں کہتی ہے کہ راہزنوں اور لٹیروں کے ٹولے ہیں۔

اُسے تو مغرب کی اُن نوجوان مسلمان لڑکیوں پر بھی شدید غصہ ہے۔ جو مغرب سے ISIS میں شمولیت کے لئے سفر کر کے آتی ہیں۔

یہ نوجوان لڑکیاں جو مغربی معاشرے میں پیدا ہوئیں وہیں بڑھی پلی۔ انہیں شام کے بارے کچھ علم ہی نہیں۔ عرب جنگجو ہیرو کی مردانہ وجاہت اور شجاعت اُن کی فینٹسی ہے۔ گھوڑے پر سوار بندوق کے ساتھ جن کی کہانیاں انہوں نے پڑھی اور سنی ہوں گی۔ مغرب کی پر سکون زندگی جس سے انہیں بوریت ہوتی ہے۔ تھرل اور کچھ نیا کرنے کی آرزو دھکیل کر یہاں لے آتی ہے۔

مجھے خوف ہے کہ اگر دنیا شام کے لوگوں کے مسائل نہیں سمجھے گی اور حکومت گرانے میں حقیقی لوگوں کی مدد نہیں کرے گی تو ایک اور بڑا خطرہ جنم لے گا۔ یہ میری اُمید بھی ہے اس میں وہ خطرات بھی مضمر ہیں کہ اسد حکومت ایران، روس سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ امریکیوں اور یورپی لوگوں کی حمایت کے لئے کوشاں ہے۔ مغرب ابھی اس معاملے میں اتنا واضح نہیں۔ بٹا ہوا ہے۔ تاہم وہ اس کے اقتدار کے لئے اس کی مدد کر رہے ہیں اور یہی چیز خطرناک ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 8:

اعظم پیلس میں ڈاکٹر ہدا سے ملنا

- بیسویں صدی کی نصف دہائی میں فرانسیسی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے نئے رجحانات اور نئے انداز تھے۔
- ہماری مساجد کی طرح نماز سے دو گھنٹے قبل ہی لاؤڈ سپیکروں پر نعتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
- عیسائی کواٹر کی نو سالہ لارینا خوشی خوشی سکول آئی اور پل جھپکتے میں موت کا شکار ہو گئی۔
- دمشق میں کاروبار حیات کے ساتھ ساتھ کاروبار موت بھی رواں دواں تھا۔

شام ثقافتی طور پر کتنا مالدار ہے اس کا اندازہ اس کی سیاحت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ ہاں پر اب جب میں لکھ رہی ہوں تو ایک طرف اگر اُن یادوں اور منظروں کی یلغار ہے۔ تو دوسری جانب ساتھ ساتھ آنکھیں بھی بھیگ رہی ہیں کہ جانے اِس جنگ نے کیا حشر کیا۔ اس کا وہ حُسن اور قدامت کی فسوں خیزی کتنی متاثر ہوئی۔

دیکھو تو ذرا میں بھی کس بھولپن کی اداکاری کر رہی ہوں۔ جانتی نہیں کہ یہ کیا، کتنا اور کتنی جیسے مبہم سے علامتی سوالات اٹھائے گویا خود کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش میں ہوں۔ کہیں شک وشبہ کا سہارا لینے کے درپے ہوں۔ ڈاکٹر ہدا، عبداللہ ال جازر، مونا عمیدی اور احمد فاضل کی ای میلوں نے کوئی بات تو

ڈھکی چھپی رہنے نہیں دی۔ چلو ٹی وی اور اخباروں کو گولی مارو کہ وہ تو ہر بات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔

تو اُس دوپہر کو جو اگرچہ تپتی تو تھی پر ایسی نہ تھی جس میں پشت پر غریبوں کی موتیوں کی لڑیاں بہتی ہوں۔ بلند و بالا گھروں کی دیواروں نے تنگ گلیوں گلیاروں کو فرحت بخش بنا دیا تھا۔ ہواؤں کے سڑاتے مارتے بلّے یہاں پل بھر کے لئے رو کتے اور تازہ دم کرتے۔ دریچوں اور بالکونیوں میں گھرا سر پر تنا نیلا روشن آسمان سب خوبصورت نظر آتا تھا۔

پرانے دمشق کی اشرافیہ کے گھر تھے کہ تعمیری شاہکار تھے۔ بیسویں صدی میں فرانسیسی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے نئے انداز اور رجحانات تھے۔ تو کچھ میوزیم بن گئے۔ کچھ ریسٹورنٹوں میں ڈھل گئے۔ اوراعظم پیلس بھی پرانے دمشق کا ایک ایسا ہی موتی تھا کہ جس کے بغیر ذکر دمشق مکمل نہیں ہوتا۔

آج کا سارا دن میں نے اِن محلوں، گھروں اور سراؤں میں گزارنا تھا۔ پہلی بسم اللہ اعظم پیلس سے ہی کرنی تھی۔

اُمیہ مسجد سے جنوب کی سمت چلتی جا رہی ہوں۔ اور سوق بز زوریہ Al-Bzouriyeh کے کونے پر یہ سیپی میں بند موتی اپنی ظاہری صورت سے ذرا نہیں لگتا کہ جب یہ بند سیپی منہ کھولے گی تو جو شاہکار دیکھنے میں آئے گا اس کی چمک دمک کس درجہ مسحور کرے گی۔

داخلی دروازے سے اندر قدم دھرتے ہی قدامت کا رنگ اور حُسن شروع ہوتا اور آنکھوں میں کھُبتا چلا جاتا ہے۔ ٹکٹ گھر سے ٹکٹ لینے کے بعد جونہی بلند و بالا چھت والی خوشنما ڈیوڑھی سے آنگن میں داخل ہوئی تو ایک پُرمسرت سی دنیا اپنے خوبصورت تعمیری رنگوں، کشادہ آنگنوں، موتی اُچھالتے فوارے، درختوں اور سبزے کے رنگ کے خوبصورت امتزاج سے آپ پر حیرت و مسرت کی دنیا کا دروازہ کھولتی ہے۔ آپ جو جولائی کی گرم دوپہر میں، تیز چمکتے سورج کی کرنوں میں نہاتے، اندر آتے اور اس سے بغل گیر ہوتے ہیں تو طمانیت اور سرشاری کی لہریں سی اندر تک دوڑتی چلی جاتی ہیں۔

دمشق کے حیرت انگیز گھروں میں سے ایک دلکش نمونے کے ساتھ میرے سامنے تھا۔

تعمیر 1749ء میں دمشق کے ہر دل عزیز گورنر اسد پاشاAsadالاعظم کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ مجھے اپنے ملک کا جنرل اعظم یاد آیا تھا۔ مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں بسنے والا ایسی ہی خوبیوں کا حامل یہ اسد پاشاالاعظم تھا۔ اس کا زمانہ دمشق کی خوشحالی کا بہترین زمانہ تھا۔

گورنر کا خاندان اِس میں 1920ء تک رہا۔ جب فرانسیسیوں کوشام مال غنیمت کے طور پر ملا تو انہوں نے اِسے اورینٹل سٹڈیز کا ادارہ بنادیا۔ ملک کی آزادی کے بعد پہلے یہ آرکیالوجی سکول اور بعد ازاں فوک لورمیوزیم بن گیا۔

وقت یہی کوئی ساڑھے گیارہ بارہ کا ہوگا۔ کمروں کے اندر جانے سے قبل میں صحن میں تالاب کے قریب دھرے بینچ پر بیٹھ گئی۔ مقصد ذرا سا ستانا تھا۔

اسی بینچ پر ایک گندمی رنگت اور موٹی آنکھوں والی خاتون بیٹھی تھی۔ تعارف ہوا تو جانی۔ یہ ڈاکٹر ہدا تھیں۔ تعلق حلب سے تھا۔ میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ حلب کی ہیومن رائٹس کی ڈائریکٹر بھی تھیں۔ کسی طبّی میٹنگ میں شرکت کے لئے وی آنا جا رہی تھی۔ درمیان میں وقت تھا تو پیلس دیکھنے آ گئیں۔

میں بھی اُن کے قریب بیٹھ گئی۔ سچی بات ہے بیرونی حسن کاری جس سرعت سے آنکھوں کو متاثر کرتی ہے ضرورت تھی کہ پہلے سکون سے بیٹھ کر اُس سے محظوظ ہوا جائے۔

دفعتاً اعظم پیلس کی خاموش سی فضائیں درود کی آوازوں سے گونجنے لگیں۔ گھبرا کر ڈاکٹر ہداء کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ مسجدوں میں گھنٹہ پہلے ہی یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بالکل ہماری مسجدوں والا سین تھا۔

ڈاکٹر ہدا سے حکومت بارے کچھ جاننا چاہا تو انہوں نے بڑے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''شام تو اِس اسد فیملی کی گویا ذاتی جاگیر بنا ہوا ہے۔ تیس سال تو باپ اقتدار کے ساتھ چمٹا رہا۔ اپنی زندگی میں ہی بڑے بیٹے باسل الاسد کو تیار کرنے لگا تھا۔ وہی بادشاہت والے انداز۔ وہ تو تیس

(30) سال کی عمر میں کار ایکسیڈنٹ میں مر گیا تو اس چھوٹے بشار الاسد کو بلا لیا۔ بھائی رفعت کمانڈر جنرل ہے۔ سارے رشتہ دار ملک پر قابض ہیں۔

یہی کچھ مصر میں حسنی مبارک کر رہا ہے۔''

''اور کچھ ایسے ہی منظر نامے میرے ملک کی پیشانی پر لکھے ہوئے ہیں۔ باپ کے بعد بیٹا یا بیٹی، بھائی، بہن۔ ملک نہیں جاگیریں ہیں۔''

میں نے دکھ میں لپٹی ہنسی ہنستے ہوئے پاکستان نامہ انہیں سُنا دیا۔

دراصل شامی لوگ چیزوں کو بہت مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ حافظ تو بڑا رعب دعب والا تھا۔ اِس بشار کے گُن آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔ ہاں بیوی اسماء ال عکراس Akhras بہت تیز اور ڈرامیٹک قسم کی اپروچ کی حامل ہے۔

2000 میں اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے دمشق بہار کا نعرہ لگاتے ہوئے درجنوں سٹڈی سرکلز اور بحث مباحثوں کے مراکز قائم کئے۔ سچی بات ہے 2001 میں دانشوروں اور وکلاء کے گروپوں نے آئین میں اصلاحات کے لئے زوردار مہمیں چلائیں۔ جن میں سرفہرست ایمرجنسی قوانین کا ہٹانا اور مکمل شخصی آزادیوں کا حصول تھا۔

مگر یہ آوازیں یہ کوششیں سب صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ پکڑ دھکڑ، مار پیٹ، مقدمے، بندی خانوں میں ٹھونسا ٹھنسائی شروع ہو گئیں۔

خاصی دیر تک ہمارے درمیان سیاست، عرب اور تیسری دنیا کے مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر ہدا بہت سلجھی ہوئی صاحب نظر خاتون تھیں۔ حالات اور مسائل کا گہرا ادراک رکھتی تھیں۔

اُن کی رہنمائی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ہدا سے ہی پتہ چلا تھا کہ اعظم پیلس دراصل رنگین پتھروں سے بنائے جانے والے Ablaq سٹائل کا نمونہ ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ سلامیک The Salamiek (مردانہ حصہ)۔ حرملیک Haramiek (زنانہ) اور خادمیک The Khadamiek یعنی شاگرد پیشہ۔ وہی ترکوں کے مخصوص سٹائل کا ایک انداز۔

تو سب سے پہلے مردانہ حصہ دیکھا۔ سلامیک کا کچھ حصہ تو انتظامی کمروں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے مستطیل برآمدے اور اس کے دیوان اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔ ہر کمرہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ آدھا حصہ چبوترہ نما جن پر بچھے قیمتی خوش نما رنگوں والے قالینوں پر کہیں صوفے اور کہیں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ محرابی صورتوں والے چوبی کندہ کاری ڈیزائن سے گندھے اور رنگ آمیزی سے لُتھڑے دروازے اُن کے اوپر ذرا فاصلے پر بنے دروازوں کے سے رنگ ڈھنگ لیے روشن دان۔ الماریوں میں سجے نوادرات اور قالینوں پر بیٹھے اور اِدھر اُدھر کھڑے نسوانی اور مردانہ مجسمے بلاد شام کے مختلف حصّوں کے نمائندہ تھے۔

برآمدوں کے عقب میں چھوٹی محرابی کھڑکیوں والے کمرے، کسی میں آلات موسیقی سجے ہوئے، کسی میں شیشہ پینے کا اہتمام تھا۔ اعظم پیلس کا ہر کمرہ مجسموں کے ساتھ شام کے امراء کی زندگی کا عکاس تھا۔ یہیں میں نے پرنس فیصل اور اس کے بیٹے غازی کی تصویریں دیکھیں۔ شریف مکہ کا بیٹا جس کے باپ نے فلسطین بیچ دیا تھا۔

حرم والے حصے کا اپنا حُسن تھا۔ مرکزی جگہ سے پہلے بائیں ہاتھ اور پھر دائیں طرف مڑنے سے سامنے سے کشادہ آنگن اپنے درختوں، بیلوں، پھول بوٹوں اور اپنے فواروں سے سامنے آتا ہے۔ دمشق کی گرمی سے پیدا تھوڑی سی گھبراہٹ اس کے بلند و بالا درختوں کی خوبصورت چھاؤں، اس کی پھولوں کی کیاریوں اور چھوٹے چھوٹے پودوں، اسکی وسعتوں اور دومنزلہ عمارت کی قدامت اور حسن سے تسکین سی پاتی ہے۔

چونکہ استنبول کے محل میناروں سے بہت اچھی شناسائی تھی۔ اس لئے کچھ بھی زیادہ حیران کن نہ تھا۔ تاہم یہاں میں اُس فضا میں سانس لے سکتی تھی۔ اُس ماحول کو دیکھ سکتی تھی اور محسوس کر سکتی تھی جو اٹھارویں صدی کے دمشق کے گھروں کی زینت تھا۔ اُس خوشبو کو سونگھ سکتی تھی جو کبھی اِن ہواؤں اور فضاؤں میں بکھری رہتی تھی۔

زندگی کے کتنے رنگ اِن کمروں میں گھُلے ہوئے تھے۔ نئی نویلی دلہن کا کمرہ اس میں سجا

فرنیچر۔ بہت سے کمرے روایتی فنکاروں کی ہنرمندی سے سجے اُن کے فن کو خود ہی خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔ یہاں وہ ہال بھی تھا جو محمل الحج کے نام سے ہے۔ یہ حج کے لئے جانے والے زائرین کے لئے تھا کہ گورنر خود انہیں رخصت کرنے آتا تھا۔

خاصی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی یا کہہ لیجیئے کہ گڈی (ٹرین) دیکھ کر پاؤں بھاری ہونے لگے تھے کہ سامنے کافی کا سٹال تھا۔ ہم نے سکون سے بیٹھ کر کافی پی اور باتیں کیں۔

یہ ڈاکٹر ہدا کی ہی تجویز تھی کہ کسی قریبی خان یا ریسٹورنٹ میں چل کر کھانا کھائیں۔ میں نے آمناً وصدقناً کہا۔ میرے لئے اِس سے بڑی کشش کیا ہوسکتی تھی۔

اعظم پیلس سے لے کر مدحت پاشا سٹریٹ اور سوق حمیدیہ کے درمیان کا حصہ بازاروں اور سراؤں کی خوبصورت دنیا ہے۔

میں تو کسی مسمریزم کئے شخص کی طرح کنگ سی تھی۔ اِن گلیوں میں کیا حُسن بکھرا ہوا تھا۔ بیلوں کا ستم ہی مان نہ تھا۔ آمنے سامنے سے جیسے جوانی کے کسی مخمور خواب کی مانند اوپر اٹھتی اور پھیلتی چلی گئی تھیں یوں کہ آسمان جیسے مہان کا راستہ روک بیٹھی تھیں۔ ایسا گھیر دار پھیلاؤ کہ آفتابی کرنوں کو بھی اندر جھانکتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔

کبھی یہ امیر شامیوں کے گھر تھے۔ تب اِن کے دروازے بند تھے آج یہ کھل گئے ہیں مگر بھاری جیبوں والوں کے لئے۔ ہر گلی کچھ منفرد اور کچھ مشترکہ ورثے کو سنبھالے تمکنت سے کھڑی تھی۔ چوڑی محرابی دیواروں کے آگے محرابی صورت دروازے کندہ کاری سے گندھے، کشادہ آنگن میزوں کرسیوں سے سجے، درمیانی حصے میں فوارے کی آبشاروں میں مسکراتے، درختوں کی بیلوں میں گھرے پڑے، کس درجہ رومانوی نظر آتے تھے۔

اُمیہ مسجد کے عقب میں ہم اُمیہ پیلس کے سامنے کھڑے تھے۔ اندر جانے سے قبل میں نے شریں مسعود کو یاد کیا تھا۔ شام دیکھو۔ کتنا صائب مشورہ تھا۔ کشادہ صحن کے عین بیچ فوارے کے دونوں پہلوؤں کی منڈیروں پر پھولوں سے لدے پھندے چوکور گملے دھرے تھے۔ تین اطراف بیلیں دوسری

منزل کے برآمدوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ آئرن بار سے ڈھنپی چھت سے کہیں کہیں گرتی سورج کی کرنیں فرش پر تباشے سے بناتی تھیں۔ میزیں کرسیاں اوران پر بیٹھے لوگ، چہل پہل، باتوں کا شور، کھانوں کی خوشبوئیں، موسیقی کی اُڑتی مدھم تانیں۔ اطراف کے کمروں میں شیشے کی دیواروں میں سے جھانکتے مناظرصحن کے سے جیسے نظاروں کے ہی عکاس تھے۔

میں ایک بار پھر انہی خوبصورت یادوں کے آنگن میں اُترتی ہوں۔ ان شہ نشینوں والے برآمدوں اورفواروں والے آنگنوں میں لوٹتی ہوں۔ ہم دونوں چار کرسیوں والی چھوٹی میز پر بیٹھ گئیں۔ ماحول کے حُسن کا رعُب، موسیقی کا سحر سب کافسوں میری آنکھوں سے چھلکتا تھا۔ میرے چہرے سے برستا تھا۔ ڈاکٹر ہدا نے میری کیفیات کومحسوس کیا اور بولیں۔

ہمارے شاعر نے دمشق کے اِن گھروں بابت کیا خوبصورت لکھا ہے۔

میں نے پوچھا۔

''یہ شاعر نزار قبانی تو نہیں؟''

''ہاں نا۔ وہی تو ہے ہمارے دلی جذبات کو چھونے والا۔ آپ نے پڑھا ہے اُسے؟''

''پہلے مجھے شاعری سنایئے پھر بتاؤں گی۔''

''اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ تاہم یقین کرنا چاہتی تھی۔''

''چلیئے سنیئے۔''

دمشق کے گھر تعمیر کے کسی آسمانی صحیفے سے کم نہیں
ہمارے گھروں کے ڈیزائن
ہماری جذباتی وابستگیوں کی بنیادوں پر ہیں
ہر گھر دوسرے سے جڑا ہوا
ہر بالکونی دوسری کی طرف بڑھتی ہوئی
دمشق کے گھر پیار ومحبت کے مظہر ہیں

وہ ہر صبح ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہیں

اور راتوں کو رازداری سے ملاقاتیں کرتے ہیں

میں نے اُن کا انگریزی میں ترجمہ شدہ مجموعہ جو میرے بیگ میں ہی تھا نکال کر دکھایا۔ بڑا خوش ہوئیں۔

''ارے اتنی محبت ہے آپ کو اُس سے؟''

وہ خوشی سے چہکیں۔

''ہاں نا۔''

سچی بات ہے۔ پہلے میں خدا کی شکر گزار تھی اور پھر ڈاکٹر ہداء کی کہ میرے لئے اکیلے یہاں آکر بیٹھنا بڑا ہی بونگے پن کا سا کام تھا۔ خدا نے بھرم رکھ لیا تھا۔ ہم دونوں اب اپنے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔ کہیں لمبی نالوں (پائپوں) والے حُقّے جنہیں مقامی طور شیشہ کہتے ہیں پیتے لوگ ہونٹوں سے دھواں خارج کرتے موسیقی پر سر دھنتے تھے۔ میری پیاسی متجسس نگاہیں اِدھر اُدھر کے لشکارے مارتے منظروں کو دیکھتی اور سراہتی تھیں۔

ڈاکٹر ہداء نے بڑی دلچسپ باتیں بتائیں۔ ایک تو اِن ریسٹورنٹوں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ چار پانچ گھنٹے کا ضیاع تو کوئی بات ہی نہیں۔ پہلے تو مزہ (maza) یعنی Appetizers کی دس قسمیں آئیں گی۔ شوقین تو ساتھ میں وائین یا بیئر سے بھی شغل فرماتے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گپ شپ ہوتی ہے۔ کھانا آتا ہے تو ڈیڑھ دو گھنٹے اس سے شغل ہوتا ہے۔ بعد میں قہوہ یا چائے کا دور اور اس کے بعد حقہ۔

بیرے کا دیا ہوا مینو کارڈ انہوں نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو بتاؤ کیا کھانا پسند کرو گی؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔'' آج تو آپ کی پسند چلے گی کہ میں تو شہر اور اس کے کھانوں سے اجنبی ہوں۔ تاہم کھانا سنگل ڈش ہو تو بہت اچھا ہو گا۔''

بیرے کو پتہ نہیں کیا کیا سمجھانے لگ گئیں۔ بولتی چلی جا رہی تھیں۔ گفتگو ساری عربی میں تھی۔

جب وہ منظر سے ہٹا میں نے پوچھا۔

''اتنی لمبی چوڑی ہدایات؟''

''دراصل میں نے گرلڈ کبابوں کا آرڈر کیا تھا۔ یہ لوگ بعض اوقات امپورٹ گوشت کے قیمے سے بنے کباب لے آتے ہیں جو اتنے مزیدار نہیں ہوتے۔ میں نے تازہ مٹن کا کہا تھا۔ جو مقامی دکانوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ دوسرے میں نے فطوش سلاد کا کہا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ یقیناً آپ کو بھی اچھا لگے گا۔''

کبابوں کی پلیٹ کیسی سجی ہوئی تھی۔ آٹھ کباب قدرے گول قدرے لمبوتری صورت لئے سلاد کے پتوں اور عین درمیان میں ٹماٹر کے پھول سے سجے سامنے آئے۔ سلاد کی پلیٹ کالے اور سفید زیتون کے پھل، ٹماٹر، پیاز، کاہو، پودینہ کے پتوں اور لیموں کے ٹکڑوں سے سجی تھی۔ ساتھ لسی تھی۔ کھانے نے بڑا مزا دیا۔ قہوے نے لطف دوبالا کر دیا۔ بل تقریباً ساڑھے چار سو سیرئن پاؤنڈ تھا۔ میرے اصرار پر بھی ڈاکٹر ہداء نے بل خود ادا کیا۔ اُٹھتے ہوئے وہ پڑھ رہی تھیں۔

لندن بکنگھم اعظم پیلس سے زیادہ شاندار نہیں
اور وینس میں سان مارکو San Marco کے کبوتر
بنوامیہ کی مسجد کی فاختاؤں سے زیادہ مقدس نہیں
اور لیس انویلڈز Les invalids میں نپولین کا مقبرہ
صلاح الدین ایوبی کے مقبرے سے زیادہ پرشکوہ نہیں

☆☆☆

دمشق کا جنگ زدہ چہرہ

یہ اکتوبر 2014ء اکتوبر کی شام ہے۔اس وقت میری یادوں میں محفوظ وہ حسین نظارے، میٹھی اور شوخ عربی موسیقی کی سارے میں بکھری دُھنیں۔ وہ گلیاں گلیارے کیا کیا نہیں یاد آ رہا ہے۔مگر یہ ساری یادیں ایک طرف۔اور میرے سامنے کافی ہاؤس کے اُس نوجوان ال مستقبل کی میل دوسری طرف جو مجھے بتاتی ہے کہ اِس خانہ جنگی نے پرانے دمشق کے مکینوں اور درودیوار کو کیسے متاثر کیا ہے؟ تحریر کے انداز میں ایک اپنائیت بھری مسرت کا احساس ہے کہ اُسے میں یاد آ گئی ہوں۔

کیا لکھوں اور کیا بتاؤں؟ خدا کا شکر ہے پرانا دمشق تو پھر بھی اِس وحشت کا اِس انداز میں شکار نہیں ہوا جیسے مِلکی اور مزہ کے علاقے دمشق کی مضافاتی جگہیں بہت بر بریت کا شکار ہوئی ہیں۔ عام لوگ تو بھاگتے جا رہے ہیں یا مرتے جا رہے ہیں۔ بشار کے فوجی جہاز بعض اوقات بہت نیچی پرواز کرتے ہیں۔ان کا شور خوف اور دکھ کے احساس کو نمایاں کرتا ہے۔کہیں دیواروں میں گولیوں کے نشان بھی خوفناک کہانیاں سناتے ہیں۔ابھی دو دن پہلے عیسائی کواٹر کی نو سالہ لارینا Laurini سکول پہنچی ہی تھی کہ کہیں سے گولہ آ کر سکول کے میدان میں گرا۔چھوٹی بچی لارینا زخمی ہوئی۔چند ملازم مر گئے اور بے شمار بچیاں زخمی ہوئیں۔

المیہ تو یہ ہے کہ حکومتی فوج میں بھی کسی شامی کا باپ ہے، کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر۔ اور FSA فری سیرئین آرمی میں بھی یہی رشتہ داریاں ہیں۔ دونوں کی خواہش ہے کہ عام لوگ نہ مریں مگر مصیبت یہ ہے کہ عام لوگ ہی مر رہے ہیں۔

تاہم دمشق کیا پورے شام میں زندگی بھی چلتی ہے اور بمباری بھی۔

چار ہزار سال سے بھی پرانا شہر جہاں لوگوں کو پتا ہے کہ اُن کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ تاہم کاروبارِ حیات بھی رواں دواں ہے اور کاروبارِ موت بھی۔

باب نمبر 9:

مدرسہ جکمکیہ اورال ظہریہ لائبریری

- شامی انقلاب کی عوامی جدو جہد کو دہشت پسند جہادی ٹولوں نے اُچک لیا۔
- پرانے شہر کی انہی گلیوں میں وہ تاریخ ساز ہوٹل جہاں جنرل ایلن بائی نے مشرق وسطیٰ کی بندر بانٹ کی۔
- ال ظہریہ لائبریری پرانے دمشق کا ہار سنگھار ہے۔

کنگ سی میں اُس عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑی تھی جو مدرسہ جکمکیہ (Jaqmaqiya) تھا۔ یہ کس قدر خوبصورت فن تعمیر کا حامل تھا۔ یہ مملوک خاندان کے سلطان جکمک کی یادگار ہے۔ داخلی دروازے کی شان نرالی تھی۔ بلند و بالا۔ سٹیلک stalic ٹائیلوں سے سجا لشکارے مارتا۔

اندر دو مقبرے ایک سلطان ال ظہر جکمک اور دوسرا ان کی والدہ ماجدہ کا۔ دونوں مقبرے رنگین سنگ مرمر کی موزیک سے سجے تھے۔ مرکزی ہال کا گنبد بھی کمال کا تھا۔ اور تالاب بھی۔ کبھی تو یہاں درس و تدریس کا کام ہوتا تھا۔ اب تو نوادرات اور کیلی گرافی کا میوزیم ہے۔ یہ دیکھنا اور سراہنا دلچسپ عمل تھا کہ حروف تہجی نے کیسے تدریجی مراحل طے کئے اور کیسے موجودہ صورت تک پہنچی۔

قریب ہی مدرسہ ظہیریہ اور وہیں ال ظہیریہ Al Zaheriah لائبریری بھی تھی۔ سچی بات ہے ان دونوں کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ ایسی عظیم اور شاندار کہ کتابوں کو تو دیکھنے کی جو چاہت اور خواہش تھی وہ تو اپنی جگہ مگر اُس کے سیاہی مائل چوبی دروازوں کو دستی کندہ کاری نے وہ

رعنائی بخشی تھی کہ اِس کمالِ فن کو داد دیئے بغیر آگے بڑھنا مجھے فن اور فنکار کی ہتک محسوس ہوئی تھی۔

صحن میں چھوٹے سے باغیچہ میں بیٹھ کر کتنی دیر اُن دروازوں اور کھڑکیوں کو دیکھتی رہی۔ جب دل کا رانجھا راضی ہو گیا تب اٹھی اور اندر گئی۔ اپنا تعارف کروایا۔ چار بوڑھے اور جوان لڑکے کتابوں کی کیٹا لوگنگ میں مصروف تھے۔ شیشوں والی الماریوں میں تانکا جھانکی کی۔ زیادہ تر عربی میں تھیں۔ فرانسیسی میں تھیں۔ انگریزی میں بھی کئی شیلف بھرے تھے۔

جی چاہتا تھا کوئی کہے اتنی دور سے آئی ہو۔ کتابوں کی شوقین لگتی ہو۔ بیٹھو۔ سکون سے انہیں دیکھو۔ اگر کوئی پسند آئے تو پٹ کھول کر نکال لو۔ بیٹھ کر اُس سے باتیں واتیں کرلو۔ ایک پیالی قہوہ پی لو۔

مگر کیسی عجیب بات تھی۔ کسی نے توجہ ہی نہ دی۔ کھلے ڈلے لفظوں میں کہوں تو یہ ہوگا کہ کسی نے زیادہ منہ ہی نہ لگایا۔ زیادہ بات چیت سے بھی گریز کیا۔

نورالدین زنگی کا مقبرہ بھی زیادہ دور نہ تھا۔ گلی تنگ تھی۔ دورویہ دوکانوں کے سلسلوں اور لوگوں کے ہجوم نے مزید تنگی پیدا کر دی تھی۔ مسجد کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی مزار ہے جس کی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی ہے۔ مسجد کو تالا لگا ہوا تھا۔ سلاخوں سے ہی اندر جھانکا تھا۔ سادہ کمرہ جس کے سامنے سیاہ کپڑے پر بڑا سا یا شیخ سلطان نورالدین زنگی لکھا ہوا تھا۔ کتنی دیر سلاخوں کو پکڑے پاگلوں کی طرح اندر دیکھتی رہی۔ عظمتوں کے جس مقام پر وہ فائز تھے یاد کرتی رہی۔

ان کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لگن کی اُس شہرہ آفاق کہانی میں کھوئی رہی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے خواب میں آکر انہیں کہتے تھے۔

''نورالدین میرے جسم کو کچھ لوگ نکال لینا چاہتے ہیں۔''

یہ سچی تاریخی کہانی کتنی دلچسپ اور خوبصورت ہے۔ نورالدین کا نیند سے بیدار ہونا، مضطرب ہونا۔ مسلسل تین دن اسی خواب کی تکرار، مدینے جانا اور مجرم کو گرفتار کرنا۔ یہ نابنجار یہودی تھے۔

مزے سے چلتے چلتے دائیں بائیں نظارے لوٹتے میں سوچے چلی جاتی تھی کہ کس قدر امیرانہ ثقافتی ورثہ اِن گلیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اِسی مٹر گشت میں تصویر بنوانے کی ہڑک اٹھی۔ ایک بے حد

خوبصورت کلاسیکل عمارت کے مرکزی دروازے پر کھڑے ایک نوجوان کو درخواست کی تو پتہ چلا کہ جس کے سامنے پوز بنا کر تصویر کھنچوا رہی ہوں۔ یہ بلڈنگ قدیم ترین ہی نہیں بلکہ بڑی تاریخ ساز بھی ہے۔ لڑکے نے معلومات کا پٹارہ کھول دیا تھا۔ کیمرہ مجھے لوٹاتے اور خود بھی اُسے سرتا پا دیکھتے اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

''یہاں جنرل ایلن بائی Allenby 1918ء کے دنوں میں اکثر ٹھہرتا تھا۔ اس کے کمروں میں بڑے تاریخ ساز فیصلے ہوئے تھے۔ یہ لارنس آف عریبیا کی بھی پسندیدہ جگہ تھی۔ عثمانیہ سلطنت کا سورج ڈوب گیا تھا۔ مشرق کے نئے چہرے نئے روپ نئے وجود تشکیل پا رہے تھے۔ شام کا یہ ٹکڑا فرانس کو تحفے میں عنایت ہوا تھا۔ اسی ہوٹل وہ لارنس جنرل ایلن بائی سے گلہ کرتے ہوئے کہتا تھا کہ اُسے آخر اِن اتحادی منصوبوں سے کیوں لاعلم رکھا گیا؟''

میری خواہش پر لڑکا مجھے اندر لے گیا۔ منیجر سے میرے بارے بات کرتے ہوئے اجازت لی۔ اور جب میں اِن خوبصورت غلام گردشوں اور شہ نشینوں میں گھومتی پھرتی تھی تو یہ دنیا، اس کے کھیل تماشے، اس کے کھلاڑی سب ایک لام ڈور کی طرح میرے سامنے دوڑتے پھرتے تھے۔

لڑکا تو از خود ہی میرا گائیڈ بن گیا۔ میں نے بھی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کی۔ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کو غنیمت جانا۔

''یہ بزوریہ سوق Souq.Al-Bazuriyeh ہے۔ ہمارے شام کے بہت بڑے شاعر نے اپنے اِن گلی کوچوں اور بازاروں کو اپنی شاعری میں زندہ کر دیا ہے۔''

سنیئے ذرا۔ وہ گنگنانے لگا تھا۔ ساتھ ترجمہ بھی کرتا جاتا تھا۔

میں خود کو سوق بزوریہ میں گم محسوس کرتا ہوں
گویا مصالحوں کے بادلوں پر سوار ہوں
لونگوں، دارچینی اور خوشبوؤں کے بادلوں میں تیرتا ہوا
عرق گلاب سے وضو کرتا ہوں

اور بہت بار اپنے جذبات کے اتھاہ جذبوں کے ہاتھوں
سوق ال اترائن میں بھول جاتا ہوں
نیناچی کے ترکیب اجزائی کو
اور کوکا شینل کی خوشبو کو
لیکن اے دمشق! تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟
تم کیسے میری ثقافت کو بدل رہے ہو
اور میرے احساس ذوق کو
میں لیکورائس کے تیز خوشبودار ذائقہ کو بھولتا جا رہا ہوں
اور Rachmaninott کے آرکسٹرا کو بھی
شام کے باغ مجھے کیسے بدل سکتے ہیں
کیونکہ میں تو دنیا کا وہ پہلا کنڈکٹر ہوں
جو ولو درخت سے آرکیسٹرا
کی رہنمائی کرتا ہوں

یہیں مدرسہ ال عزیزہ Al-Aziziya کے صحن میں دو مزار سیریا کے وزیراعظم اور دوسرا عراق کے گورنر یاسین پاشا کا ہے۔ان کے قریب ہی تین مزار اور ہیں۔ترکی میں اُن پر لکھا ہوا مجھے کیا سمجھ آنا تھا اگر لڑکا مدد کے لئے موجود نہ ہوتا۔

وہاں ہاشم سے ملنے کا لطف آیا۔میرا وطنی۔پاکستانی۔جس کا تعلق ملتان سے تھا اور جو زمانوں سے کینیڈا میں مقیم تھا۔شام کی سیاحت کے لئے آیا تھا۔گزشتہ چار دنوں سے وہ حلب میں تھا اور اُس کا کہنا تھا کہ اُسے حلب نے زیادہ متاثر کیا ہے۔اس کے ساتھ گائیڈ بھی تھا۔

یہاں یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہوا۔میرے والا اعزازی اور ہاشم والا اُجرتی۔دونوں ایک

دوسرے کومعلومات کی مار سے زود وکوب کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

بہرحال ہم نے جانا کہ یہ مزار میجر فتح بے، میجر نوری بے اوران کے معاون صادق بے کے ہیں۔ یہ اُس پرواز کے شہید ہیں جو پہلی بار استنبول کی قاہرہ کے لئے تھی۔ دمشق کے لوگوں نے پہلی بار اپنے شہر پر اُڑتے کسی جہاز کو دیکھا تھا مگر فلائٹ کو قاہرہ جانا نصیب نہ ہوا۔ کریش ہوگیا۔ شام کی ایک جھیل Tiberias میں گرا تھا۔ تینوں کی لاشیں دمشق لائی گئیں اور یہاں دفن کی گئیں۔

تو اِب ہوابازوں کے لئے فاتحہ خوانی کی اور جی جان سے کی۔

مجھے اپنے باپ کی چچازاد بہن کا شوہر یاد آیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے کا زمانہ۔ رائل انڈین ائیرفورس کے پہلے چند مسلمان پائلٹوں میں سے ایک۔ غریب سے والدین کا بیٹا۔ کمیشن لے کر جب ائیر فورس کی وردی میں پہلی بار گاؤں اپنی چودہ دن کی نومولود بچی کو دیکھنے آیا تو پورا گاؤں اُسے دیکھنے بھاگا اور ہر ایک کی زبان پر تھا۔ یہ ولی ہے کیا؟ یہ تو کہیں کا شہزادہ لگتا ہے۔

ہاں بھئی افسری کا حُسن سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ گاؤں کے بعض حاسدوں نے رائے زنی کی۔

جہاز کی مرمت ہوئی تھی۔ اور ٹسٹنگ فلائنگ آفیسر ولی محمد نے کی تھی۔ جہاز جالندھر چھاؤنی کے اوپر ہی فضاؤں میں شعلوں کی نذر ہوگیا تھا۔ ساتھ میں وہ غریبڑوں کا بیٹا ولی محمد بھی۔ اور گاؤں کی عورتیں چھاتی پیٹتی اور ہاتھوں کو کفِ افسوس سے ملتی کہتی تھیں۔

نظر لگ گئی اُسے۔ نظر لگ گئی۔ یا مرمت شدہ جہازوں کو اُڑانے کی ذمہ داری ہمیشہ نیٹو لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔ ٹیسٹ میں جہاز پاس ہوگیا تو پھر گورا بے شک اڑائے۔ یہاں بھی تو وہی بیٹھے تھے۔ جو ہندوستان کی تقدیر کے مالک تھے۔

☆☆☆

باب نمبر 10:

دمشق کا چاند چہرہ گہنایا ہوا

کتنے دن ہو گئے تھے۔ اپنی اِن یادوں کو کاغذوں پر اُتارتے ہوئے۔ اخبار میں اندر کے صفحات پر کہیں کہیں شام سے متعلق کوئی خبر بھی نظر سے گزر کر مضطرب کر جاتی۔ تڑپا جاتی۔ انہی دنوں مجھے عبداللہ الجازر کی میل ملی۔

آپ نے لکھا ہے شاید ایک پاکستانی خاتون کہیں آپ کی یادداشتوں میں ہو۔ یاد ہیں مجھے آپ۔ بہت اچھا لگا ہے آپ نے دمشق کے درد، شام کے غم کو محسوس کیا اور پوچھا کہ ہم کیسے ہیں؟

میرے بیٹے نے آپ کی پہلی میل کا جواب دیا تھا۔ میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ اپنی بیماری کے سلسلے میں بیروت اپنے قریبی عزیزوں کے پاس ٹھہرا تھا۔ جب واپسی کا قصد کیا تو وہ بولے کہاں جاتے ہو؟

میں نے کہا۔

''دمشق اپنی جنت یا دوزخ میں کہ مجھے وہیں جانا ہے۔ اس کے بغیر نہ میرا جینا نہ میرا مرنا۔''

کیا لکھوں اور کیا کہوں؟ حکومتی ٹولے کی اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہشیں، بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور عام شامی شہریوں کی اِس خاندان سے نجات کی تمناؤں نے اِس گندی اور ظالم جنگ میں اگر کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ عام لوگوں اور اس ملک کے قابلِ فخر تاریخی اثاثے کو۔

اِس میں کوئی شک نہیں۔ انقلاب کا نعرہ لگانے والے تو شامی لوگ ہی تھے۔ وہ جی داری سے اُٹھے بھی تھے۔ مگر اِسے تو ادھر ادھر کے جہادی ٹولوں نے اچک لیا جیسے انتظار میں ہی تھے۔ کیا مشرق

وسطیٰ، کیا وسط ایشیا، کیا افغانی اِس جہاد کے لیے بھاگتے آئے۔ بڑی طاقتیں بھی خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں۔حکومت کی کرتوتوں نے چند باغی فوجی افسروں کی صورت فری سیرئین آرمی اپنے مقابلے پر لا کھڑی کی۔

عام آدمی تو ہکا بکّا رہ گیا۔ وہ ملک جہاں مذہبی رواداری ہمیشہ سے تھی۔ کون سُنی ہے، کون شیعہ، کوئی دروز ہے یا کوئی عیسائی یا علوی۔ بڑے شہروں میں تو اِن کی باتوں کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ چھوٹے شہروں میں صورت گو ایسی فراخ دلانہ تو نہ تھی۔ تاہم اخلاقی اقدار کی پاسداری کا بھرم ضرور تھا۔

بشار کے دشمن اور مخالفین کی اِن باتوں میں حقیقت کا عنصر بہت کم اور مبالغہ آمیزی بہت زیادہ ہے کہ اقلیتی فرقے علویہ کے شام پر زمانوں سے حکمران رہنے کا اہم جواز عیسائیوں اور دیگر اقلیتی فرقوں کا کا اکثریتی سُنیوں کے عتاب سے بچانا مقصود تھا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ دمشق سُنی اکثریت کا شہر ہے۔ بشار کی سرکاری فوج، اس کے قابل اعتماد اہم جرنیل سب کا تعلق سُنی مسلک سے ہے۔ فوج اِس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ آئی ایس ایس آئی اور courtesy of جیسی تنظیموں کے زیرکمان ملک کا کیا حال ہوگا؟ اگر بشار کی حکومت ختم ہوتی ہے۔

مگر اب اِن جہادی ٹولوں کے شوشوں نے خوف دہشت کی جو فضا پیدا کر دی ہے اس میں ساری قوم مبتلا ہوگئی ہے۔ تمام مذہبی گروپ ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے ہیں۔

دمشق کے مضافاتی علاقے باغیوں یا جہادیوں کے قبضے میں ہیں۔ سرکاری فوجیں اِن علاقوں کو بیرل بموں اور شیلز کے پے در پے حملوں سے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ دارالحکومت پر قبضے کی کاوشیں جاری رہتی ہیں۔ پرانا دمشق اور شہر میں خودکش حملے ہوتے رہتے ہیں۔ فلاں جگہ دھماکہ ہوا۔ اتنے لوگ مارے گئے۔ اتنے زخمی ہوئے۔

تاہم شہر میں جونہی شیلنگ ہوتی ہے یا بم گرتے ہیں۔ اُن کی فوری صفائی کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایمبولینس بھاگی بھاگی آتی ہیں اور سب کچھ پل بھر میں صاف ہو جاتا ہے۔

ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔اُن کی نیچی پروازوں سے پرانے دمشق کے خوبصورت دروازے اور کھڑکیاں تھرتھراتی ہیں۔بجلی کا گھنٹوں بند ہونا بھی جاری رہتا ہے۔بہت سارے کھاتے پیتے لوگ قریبی ملکوں میں چلے گئے ہیں۔تاہم عام لوگ ابھی یہیں ہیں۔شہر میں جگہ جگہ بوگن ویلیا کھلا ہوا ہے۔جیکارنڈا درخت ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔سڑکوں کی صفائی ستھرائی کا بھی بڑا اہتمام ہوتا ہے۔

اوپیرا ہاؤس کے سامنے جہازی سائز کا پوسٹر آویزاں ہے جس پر لکھا ہوا ہے۔ I love Damarcus۔دمشق کے شہرہ آفاق باورچی اپنے مشہور کباب حسب عادت گرل کرتے ہیں۔اُن کی خوشبوئیں چاروں طرف پھیل کر بظاہر نارمل ہونے کا اذن دیتی ہیں۔

شہر میں بیلے ڈانسرز اور ہوٹلوں کے مالکان کو ہدایت ہے کہ وہ رقص پارٹیوں کا اہتمام جاری رکھیں اور مخالفوں کو پیغام دیں کہ ان کا ثقافتی ورثہ زندہ ہے۔

سکول کھلے ہیں اور بچوں کو یونیفارم میں سکول بھیجنے پر بہت اصرار ہے۔بشار حکومت یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ وہ مضبوطی سے کھڑی ہے اور باغیوں کو شکست دینے اور ختم کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔

سب کچھ ہے۔بشار کے زیرسایہ اس کا دارالخلافہ ایک طرح اس کا قلعہ بنا ہوا ہے۔پروپیگنڈہ جنگ کا یہ بڑا کامیاب ہتھیار ہے۔اکّا دکّا مگر لوگوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جیسے چھن سی گئی ہے۔وہ لگاتار خبریں سنتے ہیں۔زندگی کتنی پریشان اور افسردہ ہے۔ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے کہ یہ ہمارا ملک ہے۔ہماری زندگی ہے۔

دمشق میں چیک پوسٹیں بہت کم ہیں۔بڑے ہوٹلوں میں Dubkah ڈانس زوروشور سے ہوتا ہے۔ابھی تین دن پہلے میں ایک بڑے ہوٹل میں شادی کی ایک تقریب میں گیا۔ بے حد اہتمام تھا۔زرق برق ملبوسات اور موسیقی کی مدھر تانیں اور خوشبو اڑاتے کھانوں کی مہک کہیں یہ نہیں بتاتی تھی کہ کہیں قتل وغارت کا بازار بھی گرم ہے۔بم اور شیل گرتے ہیں اور زندگی موت میں ڈوب جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں یہ لوگ بشار کے قطعی حمایتی نہیں تھے۔ نہ کل تھے نہ آج ہیں۔ نہ یہ جہادیوں اور باغیوں کے طرف دار ہیں۔ اِس ملک کے عام شہری جو اپنے لئے اِن حالات میں بھی خوشیاں ڈھونڈ تے ہیں اور پیغام دیتے ہیں کہ زندگی کو ہر صورت رواں دواں رہنا اور رکھنا ہے۔ بشار کی فوج کی اکثریت سُنّی ہے۔ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد فوج میں ہے۔ عام لوگ پریشان ہو گئے ہیں اِن احتجاجیوں کے ساتھ جو لوگ آکر ملے ہیں وہ بے حد انتہا پسند ہیں۔ یہ تو آسمان سے گر کر کجھور میں اٹکنے والی بات ہوگی۔

میں دمشق کی تنگ گلیوں میں گھومتا ہوں
اور کھڑکیوں کے پیچھے شہد رنگ آنکھیں
مجھے خوش آمدید کہتی ہیں
کبوتر اپنے میناروں سے بلند ہوتے ہوئے
مجھے دمشق آنا مبارک ہو کہتے ہیں
اور صاف ستھری شامی بلیاں جو باہر آتی ہیں
جو ہمارے ساتھ پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں
اور ہمارے ساتھ ہی بیاہی گئیں
میرا استقبال کرتی ہیں

☆☆☆

باب نمبر 11:

باب صغیر اور مقبرہ صلاح الدین

- وی آنا کے لوگوں کا Croissant کلچے کی ایجاد دراصل ترکوں کی ہزیمت کو یاد رکھنے کا اظہار تھا۔
- باب صغیر میں قبرستان اہل بیت صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کے حوالے سے کچھ مثالی صورت کی عکاس نہ تھا۔
- صلاح الدین ایوبی کا مقبرہ تزین و آرائش کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔
- ال ظہریہ Al - Zaheriah لائبریری حسن تعمیر اور کتب کی کثرت کے باعث پرانے دمشق کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

دمشق کے مٹیالے سے آسمان اور زمین پر بکھری اِس روشن سی صبح جسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے قریبی عمارتوں کی ماتھا پٹیوں پر سجے دیکھ کر میں نے اپنے اندر ایک لطیف سی مسرت کو اُترتے محسوس کیا تھا۔ تپائی پر ناشتے کا سامان سجا کر نسرین نے مجھے آواز دی تھی۔

اور اب جب پنیر سے لدا پھندا سلائس مزیدار چائے کے گھونٹوں کے ساتھ اندر اُترا تھا تو ساتھ ہی اپنے رب کی بھی شکر گزاری ہوئی تھی کہ جس نے گائے بھینس بنائی اور یہ مزیدار تحفہ عنایت کیا۔ یہ بھی اُسی وقت سننے میں آیا نسرین سے کہ آج قافلہ زیارات کے لئے دمشق جائے گا۔

تو خود سے کہتی ہوں۔ ’’چلو بھئی آج ان کے ساتھ ہی نتھی ہوتے ہیں۔ ٹیکسی کے کرایے

بھاڑے کی بچت تو ہوگی ہی۔''

لوگوں نے وقت کی خاصی پابندی کی۔غالباًرات کو بلیٹن جاری ہوا ہوگا۔اِس سفر نے لطف دیا کہ بس چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سُست رفتاری سے چلتی اور نئے منظروں سے آنکھوں کو سیراب کرتی رہی ۔کہیں عمارتوں کے نئے، کہیں پرانے رنگ ڈھنگ، دکانوں کے اندر باہر نکلتے اور داخل ہوتے لوگ، چوراہوں پر ایک چہل پہل کا سا سماں، مردوں، عورتوں اور چھوٹے بچوں کے انداز واطوار کیسے مزے کے دلفریب اور موہ لینے والے تھے۔سکون سے اندر بیٹھے بیٹھے میں نے ان سبھوں سے لطف اٹھایا۔

بس نے اہل بیت سٹریٹ کے پاس ایک کھلے میدان میں اُتار دیا۔اہل بیت کا یہ قبرستان پرانے دمشق کی فصیل کے ساتھ باب صغیر کے قریب ترین ہے۔ال جراح سٹریٹ Al-Jarrah Street اُسے دوحصوں میں تقسیم کرتی ہے۔

لوگوں کی طرح مجھے کوئی بیتابی وشتابی نہیں تھی۔اور جب میں خود سے پوچھتی تھی۔تو سب سے پہلے مجھے کس طرف جانا ہے؟ میں اور میرا دل بھی عجیب من چلا اور باغی سا ہے۔اندر سے جواب آیا تھا۔ وہ نزار قبانی سے نہیں ملنا؟ وہ یہیں باب صغیر میں ہی تو دفن ہے۔

ارے ہاں بھئی اُس سے تو ملنا ہی ملنا ہے۔پرانی محبت نئے سرے سے جوان ہوگئی ہے۔مگر اس وقت اٹھنے اور گھومنے پھرنے کی بجائے میرا دل منظروں کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کا بڑا ہی خواہش مند ہے۔

اور میں سڑک کے ایک جانب پختہ چبوترے پر بیٹھ کر اس دنیا کی بھیڑ میں کھوگئی۔بیچنے والوں کی آوازیں اور ریڑھیوں پر لشکارے مارتی سوغاتوں کا پھیلاؤ جن میں کیمروں اور موبائلوں تک کی بہتات تھی۔ایسا ہی رش عاشقان خریداروں کا تھا جو کہیں ریڑھیوں کے گرد، اور کہیں زمین پر بکھرے سامان کے گرد کھڑے بیٹھے مول تول میں اُلجھے ہوئے تھے۔ایک پاکستانی دیہاتی خاتون چھوٹی سی میکسی ہاتھوں میں لہراتے ہوئے جھگڑتی تھی کہ پانچ سولیرا۔اتنی مہنگی تساں تے ان نیر مچایا ہویا اے۔(یعنی تم لوگوں نے آفت مچار کھی ہے۔)

بے اختیار ہی نگاہیں اوپر اٹھ گئی تھیں۔آسمان کی کشادگی کا پھیلاؤ جہاں تک نگاہ جاتی بکھرا ہوا نظروں کا گھیراؤ کرتا تھا۔نظر لوٹتی تو احساسات کی یلغار بھی ہم رکاب ہوتی تھی۔کہیں تسبیحیں، خاک شفا، جائے نماز، اور کہیں میکسیاں، کھلونے، کیمرے، موبائل۔دین اور دنیا دونوں کا کاروبار عروج پر تھا۔واہ مولا تیرے رنگ۔

اب اٹھی تو نزار قبانی کے لئے تھی مگر پتہ نہیں بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے لئے محبت نے ایکا ایکی ہی جوش مارا۔یوں اُن کے لئے بھی میری ممتا ہمیشہ ہی اُبلی رہتی ہے۔ویسے وجہ تو جانتی ہوں۔دو چیزیں مشترکہ ہیں ہی۔کالا رنگ اور احساس کمتری کا احساس۔

تو اب سب سے پہلے اُن کی قبر کی متلاشی ہوئی۔شمال کی جانب جانے کا کسی نے بتایا۔مزار نیچے گہرائی میں تھا۔سیڑھیاں تھیں اور کمرہ عاشقان سے بھرا ہوا تھا۔جولائی کے دنوں کا حبس دم گھونٹتا تھا۔تاہم پرواہ کسے تھی۔ایک تصویر بنوانے کا ہوکا کہ سندر ہے، دوسرے فاتحہ خوانی کی فکر کہ سکون سے دعا ہو جائے۔تیسرے تھوڑی سی رازونیازی۔ بہرحال تینوں کام ہوئے۔رازونیازی بھی اور ایک درخواست بھی گوش گزار کی کہ جیسے عاشق اُس ہستی کے وہ تھے۔اس عشق کا پھور چھور (بچا کچھا) مجھے بھی نصیب ہو جائے۔

وہیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر جعفر بن طیار رضی اللہ عنہ تھے۔بہت سی قبریں اور بھی تھیں۔ایک مشترکہ دعائے خیر سب کے لئے کی۔

حضرت ام سلمیٰ اور اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہ دونوں میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج۔ فاتحہ دونوں کے لئے ہوئی۔لب سڑک حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دی۔بی بی فضہ کے لئے بھی دعائے خیر کی۔

اب مجھے اپنے اُس محبوب کی قبر پر پہنچنے کی جلدی تھی۔تو خجل خواری بڑی ہوئی۔لوگ بھی کتنے بونگے تھے۔مناسب طریقے سے رہنمائی ہی نہ کرتے تھے۔تو لمبے لمبے خوبصورت کتبوں والے قدرے تنگ راستے پر چلتی درختوں اور بوٹوں کو دیکھتی اس کی قبر پر پہنچی تھی۔اس کے کتبے پر درج تھا مثویٰ مثویٰ

فقیدالشعر العربی۔

ہاتھ اٹھائے تو اس کی صورت آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔ بھلا ہو زکریا کبرت کا کہ جس کے پاس پورا البم تھا۔کیسی دل کش شخصیت کا حامل تھا۔اُس کی دوسری عراقی بیوی بلقیس تو جیسے حُسن و خوبصورتی کا شاہکار تھی۔ایسے ہی تو اُس کی موت پر اُس نے'' لکھ لکھ مارے بین'' جیسی مثال کو سچ کر دیا تھا۔ہاں زہرہ اک بیک اس کی کزن،اس کی پہلی بیوی بھی بڑی دلکش تھی۔

مجھے اس وقت شدید دکھ ہوا تھا کہ جب زکریا سے میرے پوچھنے پر کہ اس کے گھر کو میوزیم بنایا گیا ہے یا کسی اور جگہ میوزیم ہے کہ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔زکریا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔میں نے دُکھ سے کہا تھا۔

''آخر ہم مسلمان قومیں اپنی ادبی،تاریخی شخصیات اور ورثوں بابت اتنی بے حس کیوں ہیں؟ قاہرہ میں نجیب محفوظ کا میوزیم نہیں۔'' میں نے پرانے قاہرہ کے گلی کوچے روند مارے تھے۔تھکی ہاری اور رونکھی سی آواز میں میں نے بے اختیار خود سے کہا تھا۔

''مصریوں تمہیں کیا ہو گیا ہے؟تم نے اپنے اتنے لیجنڈری لکھاری کی کوئی قدر نہیں کی۔میں پیاسی بھٹکتی پھر رہی ہوں اور مجھے کچھ مل نہیں رہا ہے جو میری تشفی کر سکے۔''

نوٹ: اور اس وقت میں جو 2016 کے موسم بہار کی رتوں میں بیٹھی اپنے لکھے ہوئے کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہوں۔جانتی ہوں کہ نجیب محفوظ کا بہت خوبصورت میوزیم مصری حکومت نے 2015 دسمبر میں بنایا ہے۔چلو خدا کا شکر ہے۔

تو زکریا شام کی حکومت اتنی بے حس کیوں ہے؟

زکریا نے میرے اِس دکھ بھرے سوال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔پھر وہی ہوا تھا کہ ڈاکٹر لُدمیلا کی طرح کہ جب وہ مستنصر حسین تارڑ سے کہتی تھی کہ تم مجھے قبرستان لے چلو اور پھر وہ فیض صاحب کی قبر کے گرد گھومتی اور ان کے اشعار پڑھتی اور انہیں محبتوں اور عقیدتوں کے نذرانے پیش کرتی تھی۔

میں نے بھی اُسی روایت پر عمل کیا تھا کہ لکھنے والے کسی بھی خطے کے ہوں کسی بھی قوم اور کلچر

سے ہوں۔ان کے بنیادی جذبات واحساسات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔اور کوئی درود،کوئی دعا پڑھنے کی بجائے میرے لبوں پر اُس کی وہ مشہور زمانہ نظم " کیا آپ مجھے اجازت دیں گے؟" آ گئی تھی جو میں نے بھیگی آنکھوں سے پوری پڑھی تھی۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مطلق العنانی ہے
جہاں دانشوروں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے
جہاں لکھاری بے دین،منکر اور مرتد سمجھے جاتے ہیں
جہاں کتابیں جلائی جاتی ہیں
جہاں سوال کرنا گناہ ہے
جہاں معاشروں میں رواداری اور برداشت نہیں
جہاں طاقت زبان اور سوچ پر پہرے لگاتی ہے
مجھے اجازت دیں
کہ میں اپنے بچوں کو یہ سکھاؤں
خدا نے انسانی روح اور جسم کو قتل کرنے سے منع کیا ہے
کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے دھمکائے اور قتل کرے
کیا آپ مجھے اجازت دیں گے
کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں
خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں
ان سے
جو مذہب کے تاجر ہیں
اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے
اور وہ بہت رحیم و کریم ہے

''ہائے کیا شاعر تھا۔''

جب اپنے اس عشق کی تشفی سے فارغ ہوئی اور وہاں پہنچی جہاں بسیں کھڑی تھیں تو وہاں بسیں تو تھیں مگر وہ نہیں جن میں لد کر میں یہاں آئی تھی اور جنہیں میں نے اُترنے کے بعد ان کے پاس اک ذرا رک کر اُن کی کچھ خاص نشانیاں ذہن نشین کی تھیں۔

تو اب؟ سوال سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے اِس سوال پر میں خود ہی ہنس پڑی تھی۔ تو اب اکیلی مٹر گشت کرو۔ تمہیں ڈر کس کا ہے؟

ہاں واقعی اب ٹیکسی میں بیٹھی اور وہیں صلاح الدین کے مجسمے دمشق سٹیڈل پر آ اُتری۔ بھئی صلاح الدین کا مزار دیکھنا ہے۔ اِس تحفے، اِس سوغات کو اب فضول اپنی خود ساختہ فینٹیسی کی نذر نہ کروں۔ اندر باہر گلبل گلبل سی ہو رہی ہے۔ چلو ٹھنڈ تو پڑ جائے گی نا۔

تو راستے وہی پرانے تھے۔ جنہیں کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر منظروں میں نیا پن بھی تھا۔

ارے رُک گئی ہوں۔ کیسا دلا آویز سا منظر سامنے ہے۔ ہواؤں میں تیزی ہے اور درختوں کی ٹہنیاں بار بار جھک جھک کر اپنی پشت پر کھڑی قدیم عمارتوں کو جیسے تعظیم دیتی ہیں۔ جیسے اُن کے قدامت کے حُسن کو سراہتی ہوں۔ دائیں بائیں دو گلیاں نمودار ہو گئیں۔ اب کھڑی دونوں کو دیکھتی ہوں۔ بڑے بڑے پتھروں سے بنے بلند و بالا گھر جو اب یقیناً ریسٹورنٹ بنے ہوں گے۔ شیشے کے دروازوں کے سامنے گملوں میں اُگی دیواروں کو چڑھتی بیلوں نے سٹریٹ کو کتنا خوبصورت بنا دیا تھا۔

سیدھی چلتی گئی۔ آگے اور منظر تھے۔ محراب در محراب چھتے ہوئے گلیارے جو سرنگوں کی طرح آگے بڑھتے تھے۔ کہیں گلیاں کشادہ راستوں اور چوراہوں پر کھلتی تھیں۔ اتنے خوبصورت سہ منزلہ مکانوں کا سلسلہ۔ زمینی منزل پر دیواروں سے سجی بہت سی اشیاء بکتی تھیں۔ گاڑیاں بھی پارک تھیں۔

میں رُک گئی۔ ایک ٹھیلے پر برف کے کریٹ پر سجے چمکتے نارنجی رنگ کے ایک پھل پر نظر پڑی تھی جسے ریڑھی والا چھیل چھیل کر اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کو دے رہا تھا۔ پوچھنے پر ایک لڑکے سے پتہ چلا تھا کہ یہ کیکٹس ناشپاتی ٹائپ کا سٹرس پھل ہے اور جس کا مقامی نام حبارا ہے۔ کھٹا میٹھا نرم ٹھنڈا کھا کر

بہت لطف آیا تھا۔

تو میں آگے بڑھی۔ قلعہ دمشق کی دیوار ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ تو منزل پر پہنچنے سے پہلے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے مزار کی زیارت ہوگئی۔ دورویہ دوکانوں کا سلسلہ اور تنگ سی چھتی ہوئی گلی ایک سمت ذرا سا رُخ پھیرتے ہوئے ان کے روضہ مبارک میں لے گئی تھی۔ اندر کا ماحول ایسا جگمگ جگمگ کرتا تھا۔ شیشے اور پچی کاری کا ایسا کام کہ جی خوش ہوگیا۔ مزار کا ہال وسعت میں بھی اور آرائش میں بھی بے مثال تھا۔ اس کی زیبائش میں ایرانی حکومت کا کردار ہے۔ روضہ مبارک کی جالی بھی بہت خوبصورت چاندی اور سونے میں ڈھلی ہوئی۔ ان کے ساتھ لپٹے ہوئے عقیدت منداوران کے آنسو۔ عقیدتوں اور چاہتوں نے کیسے اُن درویش صفت لوگوں کو سونے چاندی کے خولوں میں لپیٹ دیا ہے۔ نفل پڑھے۔ دعائے خیر کی۔ تھوڑا سا صحن میں گھومی پھری۔ تصویریں بنائیں اور باہر نکلی۔

یہ گلیاں اندر ہی اندر پھیلتی کہیں حمیدیہ بازار جا نکلتی تھیں اور کہیں صلاح الدین کے مزار کی طرف۔ مزار ایوبی مسجد اُمیہّ کے پہلو میں واقع ہے۔ تو جب ایک بورڈ ڈنظروں میں آیا جس پر لکھا ہوا تھا۔

''صلاح الدین ایوبی''

پڑھنے کے ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ بلند و بالا محراب نے توجہ کھینچی۔ مزار کی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ لیموں اور سنگتروں کے پیڑوں پر وہ دھول جمی ہوئی تھی جو مزار پر کام کے سلسلے میں رگڑائی کی صورت اڑتی تھی۔ فضا دُھواں دُھواں سی تھی۔ مزار چھوٹا سا تھا۔ اس پر مزدوروں کا سلسلہ۔

اندر دو قبریں تھیں۔ ایک اصلی اخروٹ کی چوبی لکڑی سے بنی ہوئی جس پر کلمہ طیبہ کا لباس اوڑھے سبز چادر کے نیچے وہ عظیم ہستی استراحت فرماتی تھی۔ اور ساتھ ہی دوسری۔ تو پتہ چلا کہ سفید سنگ مرمر والا تعویز جرمنی کے شاہ قیصر ولیم دوم نے 1898ء میں تاریخ کے اِس عظیم ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سلطنت عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید کو تحفتاً پیش کیا تھا جب وہ شام سے گزر کر یروشلم جا رہا تھا۔

یہ کانسی سے بنے پھولوں کے مکٹ سے سجا ہوا تھا۔ جسے وہ کمینہ لارنس آف عریبیا انگلینڈ جاتے ہوئے اُتار کر لے گیا تھا۔ آج کل یہ امپیریل وار میوزیم میں سجا ہوا ہے۔ تھوڑا سا افسوس ہوا۔ مزار کی وسعت اتنی نہ تھی کہ دس لوگ اگر اندر آ جائیں تو سکون سے کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کر سکیں۔

اب فاتحہ خوانی جیسی رسمی چیزیں تو کر لیں۔ مگر دل کہیں بوجھل بوجھل سا تھا۔ یہ مسلم امہ کتنے عذابوں میں پھنسی پڑی ہے۔ اپنی خواہشات کے پھیلاؤ اور پیار نے کیسے اِسے مغرب کا یرغمال بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کردار سے عاری اور بے عملی کے لاشے۔

میں نے نم آنکھوں سے مزار کو پھر دیکھا تھا۔ کیا انسان تھا۔ کردار کی عظیم چوٹی پر بیٹھا۔ مرتے وقت ذاتی چیزوں میں کچھ تھا ہی نہیں۔ کفن دفن کے اخراجات کے لئے بھی رقم پکڑنی پڑی تھی۔ پہلو میں ہمیشہ کمر کے ساتھ لٹکنے والی تلوار کو رکھا گیا۔ پہلی تدفین امانتاً قلعہ دمشق میں ہوئی۔ بعد میں یہاں منتقلی ہوئی۔

دل جانے کیوں اتنا بھاری بھاری سا تھا۔ وہیں بیٹھ گئی تھی اور اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

صلاح الدین دنیا کے تہذیبی تصادم کے بھی کتنے جبر ہیں۔ تاریخ کے سینے میں درج یہ نئی نسلوں کو بڑے تلخ اور نفرت سے دہکتے پیغام دیتے ہیں۔ لو دو تین چھوٹے بڑے واقعات تو میں تمہیں سنا ہی دیتی ہوں۔

ایک بہت اہم تو یہی ہے کہ جو مشرقی یورپ کے دوراندیش مسلمانوں خصوصی طور پر یہودیوں کی تلخ سوچوں کی صورت سامنے آیا تھا کہ 1683ء کے وی آنا محاصرے میں عثمانیوں کی ہزیمت پر جو انداز یورپ کے لوگوں، خصوصی طور پر اہل وی آنا کا سامنے آیا تھا۔ وہ لمحہ فکر یہ تھا۔ صبح کے ناشتے کے لئے ہلالی صورت جیسے کلچے کی ایجاد جسے انہوں نے Croissant کا نام دیا تھا دسترخوان پر اس کی موجودگی ضروری ٹھہرائی۔ مقصد یہی تھا کہ ترکوں کی ہزیمت کی یاد تازہ رہے۔ اس طرزِ عمل نے غیر عیسائی دنیا کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا کہ ان زمینوں پر عیسائیوں کا دوبارہ قبضہ اُن (مسلمانوں اور یہودیوں) کے لئے عذاب سے کم نہ ہوگا۔ اور تاریخ نے اِسے سچ ثابت کیا تھا۔

بیت المقدس پر صلیبی جنگ کے فاتحین نے 1099ء میں جس بہیمانہ طریقے سے یہودیوں اور مسلمانوں کا قتل کیا تھا۔ صدیاں گزرنے پر بھی اس کی سفا کی تاریخ کے ساتھ انہیں بھی یاد تھی کہ آباؤاجداد نے نسل درنسل اسے زندہ رکھا تھا اور اب اگر ایسا کہیں ہو گیا تو کیا کوئی صلاح الدین ایوبی ہوگا جوان کے لئے رحمت کا باعث بنے گا؟

صلاح الدین تمہیں اس ہو چھے فرانسیسی جنرل ہنری گورو کا واقعہ بھی تو بہت اچھی طرح یاد ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر فرانس کو مال غنیمت کے طور پر ملنے والے اس ملک شام کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے آیا تو تمہارے مقبرے پر جوتا پھینکتے ہوئے کیسے چلاّ کر کہا تھا۔

''سُنتے ہو صلاح الدین۔ ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو ہم نے سبز ہلالی پرچم سرنگوں کر دیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر عروج پر ہے۔''

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

کتنا کم ظرف اور لعنتی تھا۔ پر تم نے بھی یہ سب سُنا اور چپ رہے۔ اٹھے بھی نہیں۔ صلاح الدین تم نے کب تک سوتے رہنا ہے۔ صدی بیت گئی ہے۔ فلسطین کتنا بے آبرو ہو گیا ہے۔

ڈھیر سارا بہت سارا وقت وہاں گزارا تھا۔ اور مزید گزارنے کی ابھی بھی حسرت تھی۔

خان اسد پاشا کے سرائے سے
ابو خلیل القابانی ابھرتا ہے
اپنے دمشقی نچے اور بروکیڈ کی پگڑی میں
اُس کی آنکھیں سوالوں سے بھری ہوئی ہیں
ہیملٹ کی طرح
وہ چونکا دینے والا جدید ڈرامہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے
لیکن اُن کا مطالبہ کراگوزی ٹینٹ ہے
وہ شیکسپیئر کا کوئی قطعہ پیش کرنا چاہتا ہے
لیکن وہ اُس سے al-Zir کے بارے میں پوچھتے ہیں

وہ کوئی نسوانی آواز ڈھونڈتا ہے
جو اُس کے ساتھ گائے
اوہو وہ تو شام ہے
لیکن وہ اپنی عثمانی رائفلوں سے فائر کرتے ہیں
ہر اُس گلاب جیسے درخت کو جو گاتا ہے
وہ کسی نسوانی آواز کو ڈھونڈتا ہے
جو اُس کا ساتھ دے
'او پرندو او فاختاؤ'
وہ اپنے چاقوؤں سے تمام فاختوں
اور عورتوں کو ذبح کر دیتے ہیں
اور ہزاروں سال بعد
دمشق ابوخلیل القابانی سے معافی مانگتا ہے
اور اُس کے نام پر ایک شاہانہ تھیٹر قائم کرتا ہے
☆☆☆

باب نمبر 12:

خاک وخون میں لُتھڑی کہانی
فارس مہدی کی زبانی

آہ ہمارا شامی انقلاب ناکام ہوگیا۔ جن حسین خوابوں کے حصول کے لیئے جس جان لیوا جدوجہد کا آغاز ہوا تھا وہ ہمارے دامن میں ناکامیوں اور نامرادیوں کی راکھ ڈالتے ہوئے ختم ہوگیا۔

پینتس 35 سالہ فارس فری سیرین آرمی آفیسر کی شدت غم سے بوجھل سُرخ آنکھوں کی گھنی پلکوں سے دو آنسو نکلے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے رخساروں پر سے پھسلتے اس کی سیاہ داڑھی کے بالوں میں گم ہوگئے۔

ایک سسکی، دکھ اور شکستگی کی انتہاؤں میں لپٹی اس کے لبوں سے نکلی اور فضا میں بکھر گئی۔

''میرے اندر سے درد کے گولے اٹھتے ہیں۔ میرے شام کی آنکھ کا ہر آنسو خون کا آنسو بن گیا ہے۔''

ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا۔ اگر کچھ بچا ہے تو وہ کہانیاں جو ہم اپنے بچوں کو سنایا کریں گے۔ اُن ہزاروں، لاکھوں شامیوں کی جنھوں نے اسد حکومت کی آمریت، ظالمانہ جبر، تشدد اور قہر کے خلاف بے بہا قربانیاں دیں۔ خود اپنی جانوں، اپنے جگر کے ٹکڑوں، اپنے گوشت پوست کے رشتوں، اپنے مادی وسائل کی۔ کچھ نہیں ملا انہیں۔

ہم نے اس انقلاب سے وابستہ بہت سارے خواب خود دیکھے تھے اور اپنے لوگوں کو بھی دکھائے تھے۔ وہ سب چکنا چور ہو گئے۔ کیا یہ کھیل تھا جو ہم نے کھیلا؟ نہیں ہرگز نہیں۔

کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں۔ شاید وہ بھی سچے ہوں مگر بخدا ہم نے تو زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔ اور دیکھو تو سہی ظالم دنیا نے کیا کیا؟ وہ تو اپنے کھیل تماشے میں لگ گئے۔ وہ تو بن بلائے اپنے پیسوں، اپنے اسلحے کے بوروں اور اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ غداروں سے مل گئے اور انقلاب کی روح میں زہر گھول دیا۔

نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا میں فارس مہدی دمشق کے مغربی مضافاتی قصبے قطانہ Qatana میں آنکھ کھولنے، بڑا ہونے، یونیورسٹی میں پڑھنے اور ملازمت کے حصول میں بہت سارے دکھوں کو دیکھتا، انہیں سہتا ہوا بڑا ہوا تھا۔ کہیں اندر محرومیوں اور ناانصافیوں کی سلگن تھی جو مضطرب رکھتی تھی۔ سیرین آرمی میں بطور آفیسر کمیشن کے ملنے میں میرے مقدر اور میرے بخت کا کمال تھا۔

درعا میں احتجاجیوں پر گولیاں چلانے سے انکار کرنے والے فوجی دستے میں، میں شامل تھا۔ اُن سرکاری فوجی افسروں نے جو جیپیں دوڑاتے اور ایک نئی صبح کے طلوع میں اپنا حصّہ ڈالنے کے لئیے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جنہوں نے فری سیرین آرمی تشکیل دی تھی میں اُنہی میں سے تو ایک تھا۔ یہ شامی فوج کے ہی باغی آفسر تھے۔ میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسے شامی فوج کے انہی نے کِسی غرض، کسی لالچ، کسی طمع کے لئیے نہیں بنایا تھا۔ وہ لوگ اپنے جذبوں میں سچے اور سُچے تھے۔ عام شہریوں کے دکھوں اور مسائل کو سمجھنے والے کہ وہ انہی لوگوں میں سے ہی تو تھے۔ عام لوگوں کی محبتیں اور ہمدردیاں بلاتخصیص مذہب و نسل انہیں حاصل تھیں۔

ایک نہیں سینکڑوں واقعات ہیں۔ ایک کا تو میں خود عینی شاہد ہوں۔ احتجاجیوں پر کریک ڈاؤن ہوا۔ ہم پرانے دمشق کے گلی کوچوں میں پناہ کے لئیے بھاگے کہ سرکاری فوجیں تعاقب میں

تھیں۔ یہ پیچ در پیچ گلیاں، یہ راستے ہمارے لئیے اجنبی نہیں تھے کہ ہم دمشق یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ویک اینڈ کی راتیں ٹولیوں کی صورت انہی گلیوں میں مٹرگشت کرنے میں گزارا کرتے تھے۔ دائیں بائیں مڑتے مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میں مدحت پاشا کی بغلی گلیوں کے موڑ کاٹتا دائیں بائیں گھومتا اُس محرابی گلیارے سے ہوتا ہوا ایک کھلے دروازے کی ڈیوڑھی سے ایک گھر میں داخل ہو گیا۔ فوراً میں نے دروازے کے پٹ بند کرتے ہوئے کنڈی لگا دی۔ چوبی کندہ کاری کے کام والے پست قامت کے دروازے کے پٹوں سے پشت ٹکاتے ہوئے میں نے اپنی تیز رفتار دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ڈیوڑھی سے آگے مجھے کشادہ صحن دکھائی دے رہا تھا۔ جس کی کیاریوں میں چنبیلی اور گلاب کے بوٹے نظر آتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں ڈیوڑھی سے گزرتا صحن میں آ کھڑا ہوا۔ دومنزلہ گھر کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ انگور کی بیلیں آہنی راڈوں پر چڑھی آنگن میں دھوپ کو روکنے میں کافی معاون ثابت ہوئی تھیں۔ ابھی میں ہراساں سا گومگو کی حالت میں کھڑا تھا۔ تبھی انگنائی سے آگے برآمدے میں ایک نوجوان چاند چہرے جیسی لڑکی کو حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے دیکھا جو ملحقہ کمرے سے نکل کر آنگن میں کھڑی مجھے حیرت وتعجب سے دیکھتی تھی۔

چند لمحے میں بھی اُسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بالمقابل جا کھڑا ہوا۔

ملتجی لہجے میں میں نے کہا تھا۔ ''شامی فوج میرے تعاقب میں ہے مجھے پناہ چاہیے۔'' لڑکی نے فوراً سوال کیا۔

''فیری سیرئین آرمی سے ہو۔'' اثبات میں میرا سر ہلنے پر اس نے انگلی سے بائیں جانب کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''فوراً اندر چلے جاؤ۔ اور ہاں تم نے دروازہ بند کر دیا ہے۔'' میرے سر ہلانے پر وہ بولی۔ میرے بھائی کے کپڑے الگنی پر ٹنگے ہیں۔ انہیں پہن لو۔ اپنی وردی کو پلنگ کے نیچے چھپا

دو۔ساتھ والے کمرے میں میرا بیمار باپ لیٹا ہوا ہے۔اُس کے پاس بیٹھ جانا۔اگر کچھ لوگ تمہاری تلاش میں اندر آ جائیں تو تم نے انہیں میرے والد ایڈورڈ قاسم کا رشتہ دار بتانا ہے۔تم مالولہ سے اُس کی عیادت کے لیئے آئے ہو۔تمہارا نام ڈیوڈ رستان ہے۔مجھے مِرنا کہتے ہیں۔جلدی کرو۔میں تمہارے لیئے قہوہ بناتی ہوں۔

یہ تھی وہ محبت جس کا اظہار شام کے لوگوں نے قدم قدم پر کیا۔اور اب شامیوں نے ہمیں پیار کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہم نے انہیں تباہ کر دیا۔ہمارے اندر غلط لوگ آ گئے جنہوں نے ہماری جدوجہد کو کھوٹی کر دیا۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسد حکومت کے تشدد ہتھکنڈے احتجاجیوں کو کچلنے کا باعث بھی ہیں۔

میں اپنے گہرے دوست کے نوجوان بھتیجے شکیب کو جانتا ہوں کہ جب احتجاجی مظاہروں پر گولیاں چلنے لگیں۔میرے دوست کا وہ بھتیجا جو دو چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔اُس نے اپنی الماری کے اُس سیف کو کھولا جہاں اُس نے سونے کے دو ٹکڑے سنبھالے ہوئے تھے۔انہیں بیچا اور بندوق خرید لی۔لیکن بندوق ہاتھ میں پکڑ کر اس نے پہلا سوال خود سے کیا تھا۔

میں کن پر گولی چلاؤں گا۔اپنے چچا اور ماموں کے دوستوں اور بیچ میٹ زپر۔شامی سپاہیوں پر جو ملک کی فوج ہے۔جو میری اور میرے بچوں کی محافظ ہے۔جو ہمارے ہی وجود کا حصّہ ہے۔وہ ہمیں کیوں مار رہی ہے؟

''نہ ختم ہونے والا انقلاب'' یہاں دنیائے شام کی انقلابی شاعرہ جوشیلی ایکٹویسٹ خاولہ جس نے اسد حکومت کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کو پوری دنیا میں بے نقاب کیا۔یہ اِس کی روزمرہ یادوں کا مجموعہ ہے۔"Sinper" خفیہ گولی چلانے والا ایک گہری اور دل میں طوفان اٹھانے والی اُس کی نظم جسے موجہ نے ترجمہ کیا،فیس بک پر چڑھایا اور پوری دنیا میں یہ نشر ہوئی۔

"Sniper" کو ذرا دیکھیئے۔

"Sniper" کو ذرا دیکھئے ۔
انگلی جو رکتی نہیں
عضو جو تقدیر کے آگے جھکتا ہے
وہ تقدیر جیسے خاموش رائفل لکھتی ہے
اور تم
کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟
کس نے تمہیں یہ سکھایا؟
جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو
کس نے تمہیں اس سنگین لمحے میں منجمد کیا
یہ لمحہ جو
مجھے، تمہاری آنکھ اور گولی
کو اکٹھا کر دیتا ہے
اور یہی وہ لمحہ ہے جو
مجھ سے میرا خواب چھینتا ہے
اور تمہیں ناموری دیتا ہے
سنائپر
☆☆☆

باب نمبر13:

حلب

- مشہور افسانہ نگار لال ذاکر کشمیری کے بزرگوں نے جنگ کربلا میں عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ کا نہ صرف ساتھ دیا تھا بلکہ اُن کا سر مبارک بھی یزید کے قبضے سے چھڑایا تھا۔
- پرانے حلب کے مختلف کوارٹر نسلی اور مذہبی خصوصیات کی بنا پر وجود میں آئے تھے۔
- پرانے حلب کی گلیوں، بازاروں اور عبادت گاہوں کے چہرے مہرے عصر حاضر کی سرخی پاؤڈر سے نہیں بلکہ گھر کے دودھ مکھن کی نرماہٹ اور تری سے آراستہ لشکارے مارتے تھے۔
- حکومتی اور باغی فوجوں کے ٹینک توپیں شہر کے اِس عظیم ورثے کی تکّا بوٹی کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

''کل حلب جانے کا پروگرام ہے۔'' یہ اطلاع نسرین سے ملی تھی کہ جب میں دن بھر کی جنگل خواری کے بعد شام کو ہوٹل لوٹی تھی۔

یہ بھی اُسی سے معلوم ہوا تھا کہ واپسی دن کے دن ہے۔

مجھے محسوس ہوا تھا اس کا لہجہ شاکی سا ہے جب وہ بولی تھی خفگی کا عنصر چھلکا پڑ رہا تھا۔

''یہ تو کاٹھ مارنے والی بات ہے۔ بھاگے بھاگے جاؤ۔ ہاتھ لگاؤ اور لوٹ آؤ۔ بندہ تو چڑھنے اُترنے میں ہی ہپوہان (ہلکان) ہو جائے گا۔''

تین چار دن کی دمشق میں صحرانوردی اور رنگ رنگ کے لوگوں سے میل ملاقاتوں خاص طور

پر ڈاکٹر ہدا سے سننے کو ملا تھا کہ البیو یا حلب جسے تہذیبی حساب سے دنیا کی ماں کہا جاتا ہے۔ یہ پرانے وقتوں میں اس شامی خطّے کا میٹرو پولس،عثمانیہ دور میں سلطنت کا تیسرا بڑا اور آج کا دوسرا بڑا صنعتی، اقتصادی،تہذیبی اور ثقافتی غازے سے لپا تپا چمکتے دمکتے چہرے والا شہر ہے۔جس پر وقت اور زمانہ صدیوں سے ناز کرتا رہا ہے۔شہر جس نے وقت کے بڑے بڑے فلسفیوں، دانشوروں اور فنکاروں کو جنم دیا۔ دمشق ہی کی طرح اُس کا بھی قرون وسطیٰ کا نمائندہ قلعہ،محل باڑیوں، بازاروں،مسجدوں،شینی گاگوں، چرچوں اور اپنی شہرہ آفاق گلیوں سے سجا ایسے حیران کن اور موہ لینے والے حُسن کا مالک ہے کہ بندہ بار بار دیکھ دیکھ کر بھی نہ رَجے۔

اس کا المدینہ سوق بھی شہر کا لاجواب تحفہ ہے۔منقش اور رنگوں سے یوں لُتھڑا پڑا ہے کہ آنکھیں ہی پھٹنے لگتی ہیں۔تو اب ایسے تہذیب وثقافت میں لُتھڑے پتھڑے شہر کو دیکھنے کے لئے ہوا کے گھوڑے پر سوار کیسے ہوا جا سکتا ہے؟ تو نسرین کا شکایتی سا لہجہ سو فی درست تھا۔

''ارے'' میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''اب اگر مقدر اتنا بخت آور ہوا اور یہاں لے ہی آیا تو بھئی اِسے ہاتھ لگانے والی بات تو ہرگز ہرگز نہیں قبول۔''

نسرین نے وضاحت کی کہ قافلے کا مقصد تو صرف مقدس مقامات کی زیارات تک ہی ہے۔

''تو اب کیا ہو؟''

اور اِس کیا ہو؟ نے سوچ و بچار اور امکانات کے دروازے کھولے۔غور وغوض شروع ہوا۔دو تین جی داروں کا ساتھ ہو جائے تو مزہ آ جائے۔نسرین کو سبز باغ دکھائے۔علی اور فاطمہ کو پکڑا۔

کوئی دو دن پہلے کی بات ہے۔میں شام کو جب اپنے کمرے میں جانے کے لئے لفٹ میں داخل ہوئی۔دیکھا کہ ایک خوبصورت دل کش اور نوعمر جوڑا بھی میرے ساتھ ہی لفٹ میں داخل ہوا۔لڑکی تو وہی تھی جس نے پہلے دن نسرین کے ساتھ کمرے میں انٹری دی تھی۔ پیاری سی من موہنی سی۔ہاں جس کے لڑ لگی تھی وہ بھی بڑا وجیہہ اور دلکش تھا۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کہاں کہاں گھومتی رہتی ہیں؟ ہمیں بھی اپنے ساتھ نتھی کرلیا کریں۔ کچھ آپ کا بھلا ہوگا کچھ ہمارا۔''

''شوقین ہیں پھرنے کے؟''

''ارے مت پوچھیئے کچھ۔'' مرد نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ بولتی ہنستی آنکھوں والی بیوی نے جواب دیا تھا جو فاطمہ تھی۔

''لو بھئی پھر تو مزے ہوگئے۔ ایک اکیلا دو گیارہ اور تین ایک سو گیارہ۔ لطف آئے گا۔''

اندر کی خوشی نے سچی بات ہے براچھیں آخری داڑھ تک چیر دی تھیں۔

کتنے فائدے، کتنے مزے۔ خرچ میں حصّہ داری ہی نہیں مان۔ پھر اکیلا آدمی اور خاص طور پر عورت پھرتے ہوئے نری اُلو کی پٹھی لگتی ہے۔

جی چاہا یہیں شکرانے کے نفل نیت لوں۔ بھئی شکر گزاری کا اظہار اور کیسے ہو؟

اب جب بات کی تو نہ صرف ٹھیک ہے کہا بلکہ شکر گزار بھی ہوا کہ زیارتوں سے فارغ ہو کر دو تین دن شہر میں گزارے جائیں اور نہ صرف شہر کی قابل ذکر جگہوں بلکہ واپسی پر راستے کے اہم مقامات جیسے ادلیب Idleb، حما اور حمص Homs وغیرہ کی بھی سیاحت کی جائے۔

''لو بھئی یہ تو موجیں ہوگئیں۔'' دل گنگنا اُٹھا۔ جھوم جھوم گیا۔

میر کارواں سے اجازت کا مرحلہ میرے ذمہ ٹھہرا اور خدا کا شکر تھا کہ انہوں نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کردی اور کسی قسم کا تعرض نہ کیا۔

روانگی بہت سویرے ہوئی۔ صبح نکھری ہوئی اور فضا روشن روشن سی تھی۔ مجھے ماحول کا نشیلا پن کچھ زیادہ ہی ہانٹ کر رہا تھا۔ واقعی باہر اندر سے کتنا جڑا ہوا ہے۔ آپ کی من پسند خواہش بہار کے کسی خوشگوار جھونکے کے چپکے سے ویرانے میں در آنے جیسے احساس کی طرح پوری ہوتی نظر آئے تو پھر مستی و سرشاری کا خود پر طاری ہونے کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

سفر کی دعا میں نے دل میں پڑھی تاہم میر قافلہ نے بلند آواز میں پڑھائی۔

سڑک کشادہ، خوبصورت، صحرائی اور پہاڑی نظاروں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ایک جانب اگر حدِ نظر پھیلے ہوئے صحرا کی وسعتیں تھیں تو دوسری جانب پستہ قامت پہاڑی سلسلوں کی زنجیر جن کی اختتامی حد بحیرہ روم تھا۔ راستے کی دلنوازی کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں، چلتے پھرتے بچوں، عورتوں اور چھوٹے موٹے کھیتوں سے بڑھ جاتی تھی۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کا نظر آنا بھی اِس ماحول کا ایک اہم جز تھا۔

دھوپ کا پیار لمحہ بہ لمحہ عروج پر تھا۔ النبک Al-Nabk میں رُکے۔ بے حد خوبصورت شہر تھا۔ جدید وضع کی عمارتوں سے سجا سنورا۔ حمص کو دیکھا تو وہ جلیل القدر ہستی شدت سے یاد آئی جن کی سپاہیانہ زندگی کی لغت میں شکست نامی لفظ کہیں نہیں تھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور میرے دل کو اطمینان تھا کہ اِسے واپسی پر اطمینان سے دیکھیں گے۔ حماہ Hama اس خوبصورت شاہراہ کا ایک اور شاندار شہر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان پچاس کلومیٹر کا فاصلہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں طے ہوا۔

بس میں بیٹھے کسی مرد نے اِس شہر کے واٹر ویلز Water Wheels کی بات کی کہ ان کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔ تاہم بس جیسے ڈاک کا گھوڑا بنی ہوئی تھی۔ رکنے، ذرا سا ستانے ایک دو گھونٹ چائے پانی پینے پلانے کا تو جیسے کوئی تصور ہی نہیں۔ وجہ یقیناً وہی واپسی کے فکر سے جڑی ہوگی۔

''بلا سے نہ رُکو۔ بگٹٹ بھاگتے جاؤ۔ مجھے ذرا سی بھی پرواہ نہیں۔ میرا اندر ٹھنڈا ہے کہ مجھے واپسی کا سفر اپنی مرضی سے کرنا ہے۔''

باہر کے منظروں نے آواز دی تھی کہ ہمیں بھی دیکھ لو۔ پردیس میں اتنی مشابہت اور اپنائیت کہاں ملے گی تمہیں؟

واقعی ہو بہو وہی وطنی تصویریں تھیں۔ ٹیوب ویل چلتے اور ڈھور ڈنگر چرتے تھے۔ کہیں کہیں عالیشان، کہیں کہیں ماٹھے گھر اور کسان مرد و عورتیں کام کرتی ہوئی نظر پڑتیں۔

حلب اپنے دو تاثرات کے ساتھ اُبھر کر سامنے آیا تھا۔ اونچی نیچی قامت کی پہاڑیوں پر بستا رستا، زندگی کی گہما گہمیوں سے بھراپُرا جس کے لینڈ مارک قلعے نے دور سے ہی ہاتھ ہلا ہلا کر خوش آمدید کہا تھا۔ لبوں پر ہنسی آئی اور مُومُو نے شکر گزاری کے میٹھے بول بول کر اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

حلب کو دیکھنا خوش نصیبی ہی تو تھی کہ وہ ہمارا جدّ امجد حضرت ابراہیم اسی شہر کی کسی ایسی ہی پہاڑی پر گائے کا دودھ دوھ کر لوگوں کو پلاتے تھے۔ حلب نام بھی اسی وجہ سے پڑا۔

بھوک نے اندر باہر حشر کیا ہوا تھا۔ چائے کے ایک کپ کی طلب طوفان اُٹھائے ہوئی تھی۔ مگر اس حشر نشر اور طوفان کو ضبط کی زنجیروں سے باندھنا ضروری تھا۔

راس الحسین یا مسجد النقطہ جا کر دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ دھوپ کی تیزی مجھے کسی شوخے کی اترا ہٹ جیسی لگی تھی۔ شکر تھا ہوا میں نرمی اور محبت تھی۔ لطف اندوز ہونے کی فرصت نہیں تھی کہ مسجد کے باتھ روم کے لئے دوڑ لگائی۔ پہاڑی قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹی سی تھی۔ سیڑھیاں بھی مختصر ہی تھیں۔ وضو والے چبوترے پر بیٹھ کر کوئی پندرہ منٹ تک منہ ہی دھوتی رہی تھی کہ پانی کے چھینٹے تازہ دم کر دیں۔

شکر ہے کھانے کو لہسن اور دہی والے شوارما ملے۔ کولا کے ٹن پیک نے ساتھ بڑا اسواد دیا۔ چلو نماز ادا کی۔

کمرے کے آخری کونے میں ایک اونچے پیڈسٹل پر ایک ضریح کے اندر سرخ کپڑے پر رکھے پتھر پر سر مبارک عالی امام رکھا ہوا تھا۔ واقعے کے ساتھ بہت ایمان افروز روایت جڑی ہوئی ہے کہ 61ھ میں جب یزید کے سپاہی عالی مقام امام کا سر مبارک دمشق لا رہے تھے، قافلہ ماروت مارتھ Marroth Mart پر رُکا۔ عیسائی راہب نے سر مبارک نیزے کی انی پر ٹنگے دیکھ کر پوچھا اور جاننے پر اُسے رات بھر اپنے پاس رکھنے کے لئے دس ہزار درہم کی پیش کش کی جو منظور ہو گئی۔

خدا کے برگزیدہ انسان کی باطنی آنکھ نے اُس سر سے پھوٹتا نور کا ہالہ دیکھ کر اندر کی کہانی جان لی تھی۔ سر مبارک پتھر پر رکھا اور ساری شب اس کے سرہانے روتے اور باتیں کرتے گزار دی۔ روایت

ہے کہ بعد میں اسلام قبول کرلیا۔

کچھ ایسا ہی واقعہ اردو زبان کے معمار کشمیری لال ذاکر کی تحریر سے ہمارے سامنے آتا ہے جسے کے ایل نارنگ ساقی نے لکھا کہ لال ذاکر کا تعلق موہیال برادری سے تھا جو حسینی براھمن کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے بزرگوں نے جنگ کربلا میں امام عالی رضا جناب حسین کا نہ صرف ساتھ دیا تھا بلکہ ان کا سر مبارک بھی یزید کے قبضے سے چھڑا کر لائے تھے۔

انسانوں کے ظلم و جبر کی کہانیاں دیکھ لیں۔

پتھر پر خون کے قطروں کے نشان آج بھی اسی طرح نظر آتے ہیں۔ دیوار پر نصب پتھر کے کتبے پر لکھی یہی کہانی خود کو دہراتی ہے۔

سچی بات ہے مشہد اڈھا کا کی سیڑھیاں اتنی زیادہ تھیں کہ علی کی پیشکش پر کہنا پڑا تھا۔

''بیبا چاہتے ہو بھرُتہ بن جائے میرا؟ اپنی اِن خوبصورت آنکھوں سے جو دیکھو گے وہ مجھے دکھا دینا۔ اپنے اِن بڑے بڑے کانوں سے جو سنو گے وہ مجھے سنا دینا۔ کافی ہے میرے لئے۔''

درختوں کی شاخوں اور پتوں میں سرسراتی ہوا کے جھونکوں سے لطف اٹھاتی علی سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے دو مدفون بیٹوں بارے سنتے، اُن کے لئے فاتحہ پڑھتے اور دعائے خیر مانگتے مانگتے خود سے کہتی ہوں۔

''بھئی اب آگے بڑھیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ اِس بات کو اوپر والے کی شکر گزاری کے کھاتے میں ہی ڈالنا چاہیے کہ پڑھا لکھا، حالات حاضرہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ علی کا کھاتے پیتے زمیندار گھر سے تعلق اور کھلے دل کے ہونے کا مجھے فائدہ ہوا کہ اُس نے ٹھہرنے کے لئے اندرونِ شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل کا انتخاب کیا۔ ''بیت وکیل''

کہیں سترھویں صدی کے آغاز کا مینشن جس تک پہنچنے کے لئے جن چند گلیوں سے گزرے اُن کے حُسن کی گھمبیر تا سناٹے میں بھی بولتی تھی۔ محراب در محراب ڈیوڑھیوں گلیاروں کے سلسلے لگتا تھا کوئی

الف لیلویٰ داستان سناتے تھے۔سحر زدہ سی بس آنکھیں دائیں بائیں مٹکاتے چلی جارہی تھی۔

ڈیوڑھی موچی دروازے کے کسی مینشن جیسی لگی۔ٹھنڈی،نیم تاریک سی جس میں جلتی زرد روشنیاں ماحول کو بڑا رومانوی ساٹچ دے رہی تھیں۔کشادہ آنگن میں موتی اڑاتے چوکور تالاب کے کنارے کھڑے اس کے مینجر سے بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے میں قطعاً خائف نہ تھی کہ جانے سودا کتنے میں طے ہو؟

کبھی وقت اپنا نایاب تحفہ دینے اور ماحول اپنے بانکپن کے ساتھ یوں آپ کے سامنے آتا ہے کہ سب کچھ لٹانے کو جی چاہتا ہے۔اور میں اُس لمحے اسی احساس کی گرفت میں تھی کہ جس سمت نظر اٹھاتی تھی کہیں کھڑکیوں،کہیں دروازوں کی چوب کاری کہیں بالکونیوں کے سٹائل،کہیں پھولوں بیلوں کے پھیلاؤ مجھے بےخود کرتے تھے۔کمبخت میری آنکھیں پھاڑتے تھے۔دائیں بائیں گردن گھماتے گھماتے ڈھیلے پھرانے لگے تھے۔ کوئی نہ کوئی انوکھی چیز ہر بار کسی نئے کونے کھدرے سے باہر آکر لُبھانے لگتی تھی۔

مینجر ہاتھوں اور چہرے کے اعضاء سے کام لینا جانتا تھا۔تمثیل کاری خوب ہوئی تھی۔بہرحال سودا ہرگز ہرگز برا نہ تھا۔

دو کمرے ہمیں مل گئے۔کمرے میں داخل ہونے سے قبل آہنی ریلنگ والے ٹیرس کے نچلے حصّے کی چوبی جھالروں کو پیار سے دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا تھا کہ مجھے لگا تھا میں تو تاریخ کی ٹنل میں داخل ہوگئی ہوں جہاں سے گزرے وقت کی پرچھائیوں کی جھلکیاں دیکھ سکتی ہوں۔

فاطمہ اور علی اپنے کمرے میں چلے گئے۔نسرین اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔میں لیٹی ضرور مگر مجھے کہاں چین تھا۔لیٹا ہی نہ گیا۔سوچا چھت پر جاؤں۔شہر کا بلندی سے نظارہ ہو۔یہ لت مجھے قاہرہ سے پڑی تھی کہ جہاں ناشتہ ساتویں منزل کے ٹیرس پر ملتا تھا اور جہاں میں آدھ گھنٹہ بنیروں سے ٹکی حریص نظروں سے اپنے سامنے تاحدِ نظر بکھرے شہر کو دیکھتی تھی۔

منظروں کا پھیلاؤ موہ لینے والا تھا۔دل کش ترین قلعہ تھا۔جیسے کسی گول بھرے پیالے میں

سگھڑ گھر گھر ہستن نے کسٹرڈ کی اُبھری سطح کو مختلف النوع میووں کی گارنش سے سجا دیا ہو۔ کچھ دیر اوپر رہنے کے بعد نیچے آئی اور باہر گلی میں آ گئی۔ چلتے ہوئے مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں راستہ نہ بھول جاؤں۔اسی لئے بیگ میں ہوٹل کا کارڈ خصوصی طور پر رکھا تھا۔

مجھے تو سمجھ نہیں آتا تھا کہ پرانے حلب کی گلیوں بازاروں کے خاندانی حُسن کی گھمبیرتا کی وضاحت کے لئے کہاں سے تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈوں؟ میرے پاؤں شل تھے اور ٹانگیں بے جان۔ پر میری آنکھیں چار دنوں کے کسی بھوکے ہابڑے کی طرح پھٹی پڑی تھیں کہ جس کے سامنے ایکا ایکی ہرے دھینے پیاز میں گندھا آلوؤں والا گرما گرم پراٹھا آ جائے۔

محراب در محراب گلیاروں سے گزرتے بلند و بالا دیواروں کے سایوں میں کہیں زور زور سے اور کہیں آہستگی سے سانس لیتی ڈرتی تھی کہ کہیں اس نظر بازی کے چکر میں اُلجھ کر اوندھے منہ نہ گر پڑوں اور کوئی گٹہ گوڈا ہو چھے کی یاری کی طرح تڑک نہ اٹھے۔کہیں چھوٹے کہیں بڑے سنگی اینٹوں والی اونچی اونچی دیواریں خدا سے ہم کلام ہوتی نظر آتی تھیں۔کمروں کے روشن دان، بالکونیاں،ان میں سجے پھول بوٹے بنیروں سے جھانکتی بیلیں، پتھروں کی موڑ مڑتی گلیاں جن کے دائیں بائیں پھولوں پودوں سے مہکتے کسی حسینہ کے کانوں میں لٹکتے جھولتے جھومتے بُندوں کی طرح نظر آتے تھے۔بجلی کے پرانی وضع کے لیمپ جنہیں گیٹ لیمپ کہتے ہیں جا بجا آراستہ تھے۔

سچی بات ہے ان کے چہرے مہرے عصر حاضر کے سرخی پاؤڈر سے آراستہ نہ تھے۔ بلکہ کسی قدیم خاندانی پروقار عورت کی طرح گھر کے دودھ مکھن کی نرماہٹ اور تری سے آراستہ چمکتے تھے۔

''ہائے میں صدقے جاؤں۔ہائے میں قربان جاؤں اِن گلیوں کے۔''

کچھ زیادہ دور نہیں بس جہاں جا کر گلی کشادگی میں داخل ہوتی تھی اور چھوٹا سا کیفے گھر تھا۔ اندر جا کر قہوہ لیا۔ پاکستانی جان کر پذیرائی ہوئی اور گپ شپ ہوئی۔سلیٹی توپ میں ملبوس بوڑھے نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔

سارا پرانا حلب اِسی رنگ میں گندھا ہوا ہے۔دراصل اِس رنگ کی بڑی وجہ حلب کی جغرافیائی

اور تاریخی حیثیت ہے کہ بارھویں سے سولہویں صدی تک حکمرانوں نے شہریوں کو کوچہ بند تنگ گلیوں میں حجرہ نما گھروں کی تعمیر کے لئے مجبور کیا کہ حلب ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار رہا۔مختلف کواٹر اور قلعے سماجی اور اقتصادی لحاظ سے خود مختار تھے۔ ہر کواٹر (حصہ) نسلی اور مذہبی خصوصیات کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔کھاتے پیتے لوگوں نے بڑے بڑے مینشن بنائے۔جنہیں بدلتے وقت کے تحت اب ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں میں بدل دیا گیا ہے۔

میرا لاہور بھی کچھ اسی ڈھب کا ہے۔مگر جو رعنائی اور زیبائی یہاں نظر آتی ہے اس کا تو عشرِ عشیر بھی ہمارے ہاں نہیں۔ ہائے کتنی حسرت تھی میرے لہجے میں۔ ہر جگہ ہر ملک میں میں تو انہی تقابلی جائزوں میں ہلکان ہوتی رہتی ہوں۔ایک نمبر کی حاسد۔

یہ تو دنیا بھر میں منفرد ہے۔ ورلڈ ہیریٹج نے اسی بنا پر اسے اپنا لیا ہے۔کوئی ساڑھے آٹھ سو ایکڑ پر پھیلا ہوا کوئی لاکھ سوا لاکھ کے قریب لوگوں کا شہر۔

بوڑھے کی انگریزی اچھی تھی۔ لہجے میں تفاخر تھا۔

بشار کے بارے بات ہوئی تو آہستگی سے دکھی لہجے میں بولا۔

''خبیث ہے پورا۔ جب آیا تھا تو بہت ساری اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں ہم لوگوں نے۔مگر اندر خانے کی سیاستوں اور مار دھاڑ نے بیڑہ غرق کر دیا۔کرپشن اتنی زیادہ کہ ملکی زندگی میں ناسور کی طرح پھیل گئی ہے۔ پھر زبان بندی کی بھی اِسے بڑی خواہش ہے۔صدام کی طرح اس کی سیکرٹ سروس بھی بلا کی ہے۔ جمہوریت کی ضرورت ہے ہمیں۔ بعث پارٹی اور اس کے نظریات اب بہت پرانے ہو گئے ہیں۔نوجوان لوگوں میں نیا خون ہے وہ تبدیلی چاہتے ہیں۔

قہوے کا پیش کرنا تو عرب مہمان نوازی کا لازمی حصّہ ہے۔اتنا کڑوا کہ سمجھ نہیں آتی تھی یہ لوگ کیسے پیتے ہیں؟

میں نے زیادہ مہم جوئی نہیں کی۔ بھولنے بھٹکنے کا ڈر تھا۔ یہ میرے لاڈلے محمدﷺ کے مدینے کی گلیاں نہیں تھیں کہ جہاں انسان بھٹکنے کی دعائیں کرے۔ کچھ علی طبعاً ذرا تیز طبیعت کا لگا تھا۔ میں نے

محسوس کیا تھا کہ میری عافیت اس کے مزاج کے ساتھ چلنے میں ہے۔

حلب قلعے کی سیر کے لئے نکلے تو شام کی رنگینیاں شہر کے حُسن کو قاتل بنا رہی تھیں۔ مرکزی گیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے سے قبل بیرونی دیوار کے ساتھ اک ذرا ٹیک لگا کر گرد و پیش کو دیکھا۔ بس لگا جیسے دنیا کی قدیم ترین تاریخ کا ایک پراسرار شاہکار اپنی ہیئت کے ساتھ اپنی چوڑی چکلی سنگی سیڑھیوں کے ہمراہ جیسے میرا منتظر تھا۔

موجودہ شام کا لینڈ مارک، ماضی کے سیف الدولہ ہمدانی کا گراں قدر تحفہ جس کے اونچے محرابی دروازے سے اندر داخل ہونے تک میرا حال لوہار کی دھونکنی جیسا تھا کہ پچاس میٹر بلندی پر ہنستے کھیلتے جانا اب اِس عمر میں خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ یہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ خیر سے چڑھائی کے اِس دریا سے پار اُتروں گی تو آگے بہت سے چھوٹے بڑے دریا پھر پیپائی کے لئے منتظر ہوں گے۔

پوڑوں میں گو خاصی قربت تھی پر بیچارے چنڈھے بغیر رکھ دیئے گئے تھے۔ رکھنے والوں نے سوچا ہوگا کہ آنے والوں کے خیر سے جوتے گرائینڈر کا کام کریں گے۔ مگر یا تو لوگوں کے کھلّے لتر بڑے نالائق نکلے اور یا پھر پوڑے بڑے ڈھیٹ تھے۔

پیر قدرے ناہمواری پر کبھی کبھار لڑھک سے جاتے تھے۔ پہلا اور دوسرا دریا پار کرنے کے بعد رک کر اونچی اونچی دیواروں میں قید کھلی فضا میں گرد و پیش کو دیکھا۔ بس یوں لگا جیسے دیوجنوں کی قید میں اُن کے ظلم و ستم سہنے والی پریاں بیچاریاں مضروب ہوئی یہاں وہاں ٹکڑوں میں بٹی اپنی قسمت کو روتی ہیں۔

کتنے روپ کتنے منظر پہلو بدل بدل کر سامنے آرہے تھے۔ دشمن کو روکنے کے متوقع حربے یعنی چوڑی اور گہری خندق، دروازوں کی محرابوں میں تیراندازی کے لئے سوراخ، نوکدار کیلیں ایک اچھے قلعے والے سبھی سامان موجود تھے۔

تعمیری انداز بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ یقیناً ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کے مصداق آنے والے ہر تاجدار نے اس میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی ہوں گی۔ ڈھلانی راستے سے اُترو

آ گے پھر سیڑھیاں چڑھو۔ کسی گھمن گھیری والے دروازے سے کسی کشادہ آنگن میں اُتر جاؤ جہاں کنوئیں ہو، شکستہ محرابوں والے دروازے ہوں۔ ٹوٹا پھوٹا ملبہ ہو۔ تو پھر کسی کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھنا اور تصویر اتروانا کیسا دل چسپ تجربہ تھا۔ تھوڑی سی اس مہم جوئی کے بعد ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ نسرین تو پہلے ہی ہانپ رہی تھی۔ نو جوان جوڑا البتہ بڑا مستعد تھا۔

''چلو تم ہمیں اس کی مسجد دکھا دو اور سنا ہے کہ یہاں کوئی محل بھی ہے۔ اس کی زیارت بھی ہو جائے۔ بس یہ تھوڑا سا ہمارے لئے بہتیرا ہے۔ ہم کہیں بیٹھیں گے اور تم لوگ اپنا رانجھا راضی کرتے رہنا۔

مگر آپ لکھیں گی کیا؟'' شبیر ہنسا۔

''یہی سب۔ کچھ تم سے بھی تو سنوں گی۔ باسٹھ سال کی عورت سے تم کیا توقع کرتے ہو کہ وہ تمہاری طرح چھلانگیں مارتی پھرے؟ جب تمہاری عمر کی تھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ گلگت اور بلتستان کے لوگ گواہ ہیں اس بات کے۔''

بہر حال علی کی رفاقت نے کام دکھایا۔ اس نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گائیڈوں سے جانکاری کی اور تہہ خانے کے محل میں لے آیا۔ راستے دیکھ کر تو حیرت سے گنگ ہونے والی بات تھی۔ کیا کندہ کاری تھی۔ کس قدر خوبصورت نقاشی کا کام دروازوں، محرابوں اور جالیوں پر جگمگا تا تھا۔ یہ مملوکوں کا محل تھا۔ اِس کے کمرے، دیوان، ان کے درودیواریں اور چھتیں گو یا دستِ فن کی پور پور میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

تھرڈ میلینم قبل مسیح کے اِس قلعے پر کسی ایک قوم کا تھوڑی، بے شمار قوموں کے احسان ہیں۔ کہیں یونانیوں، بازنطینیوں، ایوبیوں، کہیں مملوکوں اور اس اکیسویں صدی کی تھوڑی سی احساس مندی آغا خان کلچرل ٹرسٹ کے کھاتے میں بھی جاتی ہے۔ اب تو خیر سے یونیسکو نے گود لے لیا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔

علی نے عجائب خانہ کا بتایا۔ ''دیکھنا ہے؟'' پوچھا۔

''چھوڑو۔ تھکن سے نڈھال ہو رہے ہیں۔''

اُس وقت سورج کی روشنی اپنے دم واپسی پر تھی۔ ماحول میں جولائی کی لتھڑی شام کا ڈوبتا حُسن رکنے اور اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سارا حلب نیچے قدموں میں بکھرا ہوا تھا۔ اُس کے رنگوں کے عکس گویا فضا میں تیرتے پھرتے تھے۔

''میں اور یہ سب۔''

آنکھیں بند ہوگئی تھیں کہ اس پہاڑی پر میرے اُس جدّ امجد ابراہیم علیہ السلام نے گائے کا دودھ دھویا تھا اور بانٹا تھا۔

تاریخ کی دلآویزی نے جذبات کو بھگو دیا تھا۔ مسجد کو دیکھنے کی خواہش اور وہاں سجدہ دینے کی تمنا کا تو کچھ پوچھیئے نہ۔ بلند و بالا مینار گویا جیسے آسمان کی پہنائیوں میں جھانکتا تھا۔ بلاتا تھا۔ تو پھر کشاں کشاں کھنچتے چلے گئے تیری چاہت میں۔

دونوں جانب کی پتھریلی اونچی نیچی زمین پر تنگ سے راستے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے درِ یار پر دستک دے دی تھی۔ فاصلے کی زیادتی بھی نہ کھلی اور تھکاوٹ بھی جیسے کہیں اُڑنچھو ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ ہاتھوں کی پھیلی ہتھیلیوں پر دعائیں کیا تھیں؟ بچوں اور ان کے بچوں کی سلامتی کی۔ یہ ممتا بھی کیا اونتری چیز ہے؟ مری جاتی ہے اور بچے چاہے جوتی کی نوک پر رکھیں۔

بہر حال کوئی دو گھنٹے کے بعد واپسی ہوئی۔ بھوک زوروں پر تھی۔ وہ تینوں قلعے کے سامنے ہینڈی کرافٹ کی مشہور مارکیٹ میں گھسنے کو بے تاب تھے۔ میرے یہ کہنے پر کہ پہلے طعام بعد میں کوئی اور کام پر سب نے آمناً وصدقنا کہا۔ وہیں ایک ڈھابا نما ریسٹورنٹ میں جا گھسے۔ گرل کیے چکن اور بیف کباب ساتھ میں دہی، سلاد اور دو تین قسم کی کھٹی میٹھی چٹنیاں۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے یہ بڑی بڑی روٹیاں کہ ایک روٹی جو نہ کلاوے میں سمٹے۔ جس سے پورا ٹبر رَج جائے۔ تو ہمارے لئے بھی بس ایک ہی کافی تھی۔ دہی مزے کا تھا۔ نام کو کھٹاس نہ تھی۔ یوں بھی کھانا بڑا سستا پڑا۔ اسی 80 لیرا فی کس جان کر خوشی ہوئی۔ اتفاق میں برکت ہے کا صحیح مفہوم تو آج جانا تھا۔

شاپنگ میں تینوں کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ سچی بات ہے بالکل موڈ نہیں تھا۔ مگر ''چلو دیکھوں

توسہی ذرا'' نے لالچ دیا۔ مارکیٹ کے لشکارے دور سے ہی اُبلے پڑ رہے تھے۔سوچا اندر کیا لینے جانا ہے؟ قریبی کھلے میدان کی طرف بڑھتے ہوئی بولی۔ ''جب جی چاہے یہیں آجانا۔''

پھرایک موزوں جگہ پر بیٹھ کر ملگجے سے اندھیرے اُجالے میں اپنے گردوپیش کو دیکھنے لگی تھی۔ انسانی سیلاب رنگوں، بھانت بھانت کے ملکوں اور بولیوں میں یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔

اُس وقت جب میں سمے کی اُن خوبصورت رعنائیوں سے لطف اٹھا رہی تھی۔کیا وقت کے کسی ہزارویں حصے میں بھی کہیں یہ سوچ میرے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں تھی کہ صرف آنے والے چھ سات سال کے درمیانی وقت میں ہی قرونِ وسطیٰ کے تعمیری انداز والے دروازوں اور دیواروں والا یہ قلعہ جو حلب کا لینڈ مارک ہے کھنڈر بنا دکھ بھرے منظروں کا عکاس ہوگا۔اُس کی وہ شاہانہ ہیبت تڑپا دینے والے المیے میں بدل جائے گی۔باغی فوجوں کے ٹینک توپیں یہیں اِسی میدان میں ڈیرے ڈالے اِس کی تکّا بوٹی کرنے کے درپے ہوں گے۔سرکاری فوجیں بھی اسی پر کمندیں ڈالنے کے لئے مری جارہی ہوں گی۔شہر کے ساتھ کوئی مخلص نہیں ہوگا۔شہریوں کا کوئی خیر خواہ نہیں رہے گا۔دونوں حکومتی اور مخالف اپنے اپنے مفادات کے اسیر اس کا سکون غارت کرنے اور اِسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں گے۔

یہ خوبصورت حلب شہر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔مشرقی حصہ بشار کے مخالفوں کے کنٹرول میں جو بشار کو نکال پھینکنے کے درپے۔سرکاری فوجیں اس کی بچی کھچی اینٹ سے اینٹ بجانے کا عزم کئے اس پر دن رات چڑھائیاں کررہی ہوں گی۔ڈھائی لاکھ کے قریب جو لوگ رہ گئے ہیں ان کے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہوجائیں گے۔

خوش وخرم چہکتے مہکتے ماحول کو دیکھتے ہوئے ایسے کسی المیے،ایسی کسی سوچ کا دور دور تک سان وگمان تک نہ تھا۔کہ وہ آگ جو کہیں 2011 کے وسط میں درعا جیسے چھوٹے شہر میں بھڑکی تھی۔اس کی تپش کیسے دھیرے دھیرے دوسرے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کردے گی۔یہ سوچ کہاں تھی کہ حلب بھی ایک دن اس کی زد میں آجائے گا۔ایک صنعتی،ایک تجارتی،ایک مفاہمتی شہر۔

پر ہوا کیا؟ اِسے کس کی نظر لگ گئی؟ یہ اِس آگ میں ایسا کودا کہ جھلسا ہی نہیں ہائے راکھ ہو

گیا۔

یہ وہ دن ہیں جب ہر صبح اٹھ کر اخبار میں پہلی خبر سیریا سے متعلق دیکھتی ہوں۔اب حلب ہی زیادہ نشانے پر ہے۔ڈاکٹر ہدا سے میں نے پوچھا ہے۔ یہ تو بڑے سمجھدار کاروباری ذہنیت کے لوگ تھے۔انہیں کیا ہوا؟

وہ لکھتی ہیں۔

آپا آپ کی طویل عرصے بعد آنے والی میل نے مجھے بہت کچھ یاد دلایا ہے۔آپ کے درد بھرے محسوسات نے عجیب سی خوشی سے ہم کنار کیا ہے کہ کوسوں دور بیٹھے لوگ ہمارے دکھوں پر ہماری تباہی پرغم زدہ ہیں۔ یہ تباہی شاید ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

حلب میں سنی لوگوں کی اکثریت تھی۔ جو بہر حال اسد کے علوی مسلک کے تعلق کو اتنا پسند تو نہ کرتے تھے مگر کاروباری لوگ ہمیشہ اپنے کاروبار کا مفاد دیکھتے ہیں۔ایران اور حزب اللہ لبنان کی علاقے میں بڑھتی دلچسپی نے لوگوں میں بے کلی اور اضطراب پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ابتدائی جھڑپوں میں اقلیتوں نے بھی سنیوں کا ساتھ دیا۔ترکی پہلے ہی مداخلت کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔امریکہ کی در پردہ سیاست بھی اپنا کھیل کھیل رہی تھی۔

آپا یہاں مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یورپی ملکوں کی سیاست کو تو ایک جانب رکھیں۔ اُن کی ہمدردیاں اور خیر خواہی ہمارے ساتھ بھلا کیسے ہوسکتی ہے؟ اسرائیل ہوا۔امریکہ اور روس ہوئے۔ ہمارا تو سب تخم مارنے کے درپے ہیں۔مگر یہ جو ڈھیروں ڈھیر اسلام کے دعوے دار ملک ہیں اور وہ جو ہمارے ہمسائے ہمارے ماں جائے ہیں اُن کا کیا رنڈی رونا روؤں؟ ترکی کے لئے کیا کہوں؟ عالم اسلام کی سربراہی کا تاج سر پر سجانے کا خواہش مند۔دیکھوتو ذرا کن کے ساتھ کھڑا ہے؟

اور اِس مرکز رشد و ہدایت کے دعوے دار ملک کو بھی دیکھو۔وہ اپنی بادشاہت بچانے کے لئے ان کے چرنوں میں یرغمال ہوا پڑا ہے۔تلوے چاٹتا ہے۔ ہے کوئی جو کہے شام کو تباہ ہونے سے بچاؤ۔

ڈاکٹر ہدا کی میل کیسی دل شکن سی تھی۔ پڑھتی جارہی ہوں۔آہیں بھرتی جارہی ہوں۔ ہماری

تباہی میں غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ کوئی پوچھے کہ اگر شام سے مسلکی اختلاف ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے والوں کے ساتھ کھڑے ہو جائیں کیونکہ انہیں ایران قبول نہیں؟

میں نے سکرین سے نگاہوں کو ہٹا لیا ہے۔ میری سوچیں بڑی زہریلی ہو رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا ہے۔

خیر سے اپنا ملک بیچ میں دھڑام سے کود پڑا ہے۔ یہ اپنا رونا بھی تو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اب خود سے باتیں کئے جاتی ہوں۔ ہائے میرے اِس ملک کے سفر زیست کا کوئی ایسا عہد جب اس نے اپنے مفاد کے لئے کوئی آبرومندانہ فیصلہ کیا ہو۔ ہائے اِسے بھی کیسے حکمران ملتے رہے۔ خودغرض، اقتدار کے بھوکے۔ ست بھوکوں کی طرح اِسے نوچتے کھسوٹتے رہے اور ابھی تک یہی حال ہے۔

دیر تک انہی کنجر کانیوں میں اُلجھی کڑھتی رہی۔ جلتی رہی۔

اب خود کو نارمل کرنے، مضطرب ذہن کو پرسکون اور اپنی توجہ ہٹانے کے لئے مجھے کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھنا پڑا۔ اب وہ جوانی والی باتیں تو رہی نہیں۔ ذرا سی پریشانی، بری خبر بلڈ پریشر کو اوپر تک لے جانے کا باعث بن جاتی ہے۔ پورا دن چاہتے ہوئے بھی میں نے کمپیوٹر نہیں کھولا۔

اب فرار کہاں تک ہوتی۔ کمپیوٹر پھر آن کیا ہے۔ ڈاکٹر ہدا کی میل نے پھر بہت مضطرب کر دیا ہے۔

کوئی ایک مسئلہ ہو تو بندہ دکھ کا رونا روئے۔ ڈھیر لگے پڑے ہیں۔ جنہوں نے عافیت کے لئے ہجرت کی۔ اُن کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹک گئے۔ کیمپوں کی زندگی جہاں سہولیات کا فقدان۔ بچوں کے لئے سکول نہیں۔ نوخیز لڑکیوں کی عمر رسیدہ مردوں سے شادیاں۔ طلاقیں۔ صحت کے مسائل۔ لو نظم پڑھو، کلیجہ چیرتی ہے

پہاڑ بھی گواہ ہیں

ایک قوم اور اُس کی صدیوں پرانی تہذیب کی تباہی پر

بچے ابھی تک یتیم بن رہے ہیں ایک جابر آمر کے ہاتھوں
میں اُس وقت تک مسکراؤں گا نہیں اور نہ ہی کوئی خوشی سے محسوس کروں گا
کہ جب تک ظالم کا خاتمہ نہیں ہوتا
تا کہ بچے اپنی دھرتی پر آزادی سے چل پھر سکیں
بچوں کو تو بس بچے ہی رہنا چاہئیے اور کچھ بھی نہیں
اس جنگ نے کتنے بچوں کو مار دیا صرف طاقت اور اقتدار کے لئے
معصوموں کی اُن کے گھروں میں ہلاکت یا بحیرہ روم میں اُن کی غرقابی
صرف اس لئے کہ صرف ایک آدمی
انہیں آزادی کا حق نہیں دینا چاہتا

☆☆☆

باب نمبر 14:

حلب کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی جھلکیاں

- o شہر تعلیم یافتہ اور کاروباری ہے۔ امن اور بھائی چارے سے رہنا اُن کی مجبوری ہے۔
- o حلب کی گلیاں کسی مصور کے نوک برش کا شاہکار جیسی دِکھی تھیں۔
- o بڑے شہروں میں نہیں مگر چھوٹے شہروں میں اسلامی انتہا پسندی کا عنصر خاصا طاقتور تھا۔
- o اِس خانہ جنگی نے بچوں کی ایک نسل کو عام زندگی کے نارمل رویوں سے محروم کر دیا ہے۔
- o مشرقی حلب پر قبضے کا واحد حل یہی ہے کہ انسانیت سوز ظالمانہ انداز میں اس پر دھاوا بولا جائے کہ اس کی بازگشت نسلوں تک سنائی دے۔

ناشتے نے بڑا مزہ دیا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے زیادہ ماحول کے حُسن نے دیا۔ قدامت کا حُسن دامن دل کو بار بار آنکھیں لڑانے پر مائل کرتا تھا۔ تاہم آنکھوں نے دونوں کام کئے۔ شامی پنیر اور دہی دونوں کی خوش رنگی نے متاثر کرنے کے ساتھ ذہن کو بھی اُکسایا کہ انصاف کرنا ہے اور پورا پورا کرنا ہے۔ کالے اور سبز زیتون رج کے کھانے والی بات کی۔ قطعی نہ سوچا کہ زیادتی بلڈ پریشر بڑھنے کا باعث ہوسکتی ہے۔ فواFawa، بینز، ٹماٹر، کھیرے سب کو تھوڑا تھوڑا رگڑا۔

اُمیہ مسجد کا دیکھنا سرفہرست تھا۔ یہ بہت سے اور ناموں سے بھی مشہور ہے۔ اسے الیپو کی عظیم مسجد یا جامع حلب الکبیر کے نام سے پکار لیں۔ بہرحال حلب کی قدیم ترین اور عظیم ترین ہونے کا اعزاز اُ

س کے پاس ہے۔سلیمان بن عبدالما لک کی تعمیر کردہ 715ھ کی یادگار جلوم Jalloum ڈسٹرکٹ میں واقع ہے۔کوئی آٹھویں صدی میں بنائی گئی تھی۔اجڑنے اور بسنے کی تاریخ حسبِ روایت ہے۔

بارھویں صدی کے آغاز میں سلطان نور الدین زنگی نے اِسے نئے سانچے میں ڈھالا۔ منگولوں کے ہاتھوں بھی برباد ہوئی۔

صحن کی کشادگی متاثر کرتی تھی۔جائے وضواور دارلخزانہ دمشق کی اُمیہ مسجد جیسے ہی تھے۔ہاں البتہ محرابی برآمدوں اور تزئین وآرائش میں ضرور فرق تھا۔محراب ومنبر اور حضرت زکریا علیہ السلام کا مزار مبارک۔ یہاں نفل پڑھنا اور حضرت زکریا علیہ السلام کے حضور دعا کرنی جن سے بڑی قدیمی دوستی تھی۔ بیٹے کی خواہش کے لئے سالوں اُن کی اسی دعا کو حرزِ جان بنایا تھا جس میں انہوں نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کا ذکر کرتے ہوئے اوپر والے کی رحمت مانگی تھی۔رب سچے کے قربان جاؤں وہ سرفراز ہوئے تھے۔صدقے جاؤں اُس خدا کی ذات اور رحمت کے۔اُن کی دعا کے صدقے یہ غریب نمانی عورت بھی نوازی گئی تھی۔

بہت سی متنازعہ باتیں بھی تاریخ بتاتی ہے۔کھیتڈرل قبرستان کی جگہ تھی۔کسی دوسری جگہ یہ بیان ہے کہ سینٹ حلینیا کا باغ تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اصل بات بس اتنی سی ہے کہ سبھی کچھ فاتح کی مرضی اور خواہش سے چلتا ہے۔وہ مفتوح علاقوں کے بچے، بڑے عورتیں، بوڑھے کولھوؤں میں پسوا دیں یا انہیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لیں۔اُن کی مرضی،اُن کی رضا۔صدیوں سے آج تک کی یہی ریت روایت اور رواج ہے۔سوائے اُس عظیم ہستی ﷺ اور عمر فاروقؓ کے۔کسی اور نے اگر اِس روایت سے انحراف کیا تو میری کمزور تاریخ دانی سمجھ کر معاف کردیں۔

نماز کا تو کوئی وقت نہ تھا۔نفل پڑھے۔خدا کا شکر ادا کیا کہ جس نے موقع دیا۔اسباب فراہم کئے کہ جو صدیوں کا لبادہ اوڑھے کھڑی ہے اِس پیکرِ عظمت کے تن بدن پر ماتھا ٹیک سکوں۔کاش تب جان سکتی۔کاش کہیں کوئی چھٹی حِس چھوٹی سی سرگوشی میں ہی کہہ چھوڑتی۔

’’مُورکھ دولفظ اِس کی سلامتی کے بھی مانگ لے۔ہونا تو وہی ہے جو اوپر والے نے مقدر کردیا

ہے۔ پر کل جب تو ہزاروں میل دور بیٹھی اس کے میناروں کو اس تباہ کن انداز میں گرتے دیکھے گی تو تیری آنکھیں پتھرا جائیں گی اور اِس کے خوبصورت آنگن میں اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر تجھے باور کرائیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ مسلمان ہیں یا مسلمانوں کے گماشتے۔اس کے یہ چمکدار روشنیاں سی بکھیرتے محرابی برآمدے جلے جلے منظر تجھے دکھائیں گے تو تیرا کلیجہ باہر نکلنے کو پھڑ پھڑائے گا۔اور شاید تو کہے کاش کچھ اس کے لئے بھی مانگا ہوتا۔

واقعی آج میرے پاس تاسف بھرا اظہار ہے کہ تب زبان کو کیا دندل پڑ گئی تھی کہ کچھ کہتی تو سہی۔ یوسف کو خریدنے والی اُس مائی کی طرح جو سوت کی اٹی لئے اُسے خریدنے نہیں تاریخ میں خود کو خریداروں کی فہرست میں درج کروانے کے لئے آئی تھی۔

پر میں اپنی اس فضول سی سوچ پر خود ہی طنزیہ سی ہنسی ہنس دی ہوں۔

''واہ بڑی خوش فہمیاں ہونے لگی ہیں تجھے۔تو اور تیری دعائیں۔اپنے گھر اور ملک کی خیر منا۔یہ سب کھیل اوپر والے کے ہیں۔''

چلو چھوڑو اِن باتوں کو۔خود سے کہتے ہوئے جولائی 2008ء کی ٹنل میں دوبارہ گھستی چلی جاتی ہوں۔

ال مدینہ سوق چلتے ہیں۔زندگی کے سارے رنگوں کی گویا یہاں بارش ہو رہی تھی۔دکانیں آنکھیں پھاڑتی تھیں۔سامان کا سیلاب دروازوں سے باہر تک امنڈا پڑ رہا تھا۔حافظ الاسد اور بشار الاسد کہیں دونوں باپ بیٹا اور کہیں بیٹا اکیلا بھی بڑے بڑے پوسٹروں پر ٹنگے ہوئے تھے۔

تینوں نے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں۔تینوں کا کہنا تھا کہ بھئی دمشق سے یہ زیادہ سستا ہے۔

علی حلب کے نیشنل میوزیم اور khussowh مسجد دیکھنے کے لئے مُصر تھا۔میں انکاری تھی۔دمشق میں میوزیم اور ڈھیروں ڈھیر مسجدیں تو دیکھ بیٹھے تھے۔اس نے مجھے عہد فاروق کی توبہ مسجد دیکھنے پر بھی اُکسایا۔اور جب میں ٹس سے مَس نہ ہوئی تو ہنستے ہوئے بولا۔

''یہاں کتنے سینما گھر ہیں۔کئی ایک میں انڈیا کی فلمیں لگی ہوئی ہیں تو پھر چلیں کوئی فلم ہی

دیکھ آئیں۔''

''چلواور جی کو جلاؤ۔ اپنی تو تبت سنو کی شیشی بھی کسی دکان پر پڑی نظر نہ آئی کہ چلو تپتے سڑتے دل کو تھوڑی سی ٹھنڈک ہی پہنچے۔ یہاں دمشق ہو، حلب، استنبول یا قاہرہ۔ امیتابھ بچن، شاہ رخ اور ایشوریہ کے نعرے ہی دل گرماتے اور برماتے ہیں۔ہم تو سچی بات ہے کہیں ہیں ہی نہیں۔''

میں تو حلب کے گلی کوچوں میں کھونے کی متمنی تھی کہ تاریخ تو اُس کے گلی کوچوں میں بکھری ہوئی تھی۔ چلو تینوں نے اتفاق کیا۔ طے ہوا کہ میں اپنا راستہ ناپوں اور وہ اپنا۔اور جب جس کا جی چاہے وہ ہوٹل پہنچ جائے۔

میں تو گویا بن پیئے ہی ترنگ میں آئی تھی۔اتنے مختلف النوع لسانی، مذہبی اور ثقافتی تہذیبوں کا مرکز کہیں عرب سنی مسلمان، عرب علوی کرُد سُنی، عرب آرتھوڈوکس عیسائی، عرب دروز Druze، عرب اسماعیلی، فلسطینی، یزیدی وغیرہ وغیرہ۔ رنگارنگ نسلوں اور قوموں کا ایک دل کش امتزاج شہر کا حُسن تھا۔

یہ گلیاں تھیں یا کسی مصور کے نوک برش کا شاہکار تھیں یا دستکاروں کے کمال فن کا اظہار تھیں۔ ان میں کہیں صنوبر جیسی قد وقامت کہیں کھجور اور کہیں سروجتنی مکانوں کی قطاریں گویا پریاں قطار اندر قطار جیسی صورت کی غماز تھیں۔

مزے کی بات کہ ان کی بلندیاں اور ان کی پستیاں کہیں بھی اپنے ترتیبی تناسب کے اعتبار سے یکساں نہ تھیں۔مگر عجیب سی بات تھی کہ یہ نظروں پر گراں نہ گزرتی تھیں۔ان کے دریچوں ودر کے سینوں اور ماتھوں پر وہ فنکاری تھی جو بار بار دیکھنے کے لئے مجھے کہیں پل بھر کے لئے روکتی، کہیں دیر تک ٹھہراتی اور کہیں آگے بڑھاتی تھیں۔مزے کی بات کسی ڈرامائی کہانی کی طرح ایکا ایکی یہ گلیاں موڑ مڑتیں اور چوراہوں میں جا کر اپنے انجام کا دل کش انداز میں اظہار کرتے ہوئے میرے لئے حیرتوں کے نئے جہاں وا کرتی تھیں۔

ایک چھوٹا سا دلکش سا کھوکھا نما ریسٹورنٹ۔ کرسی پر بیٹھتی ہوں۔قہوے کا کہتی ہوں۔اس

وقت رش نہیں۔ نوجوان لڑکا قہوہ کی پیالی سامنے رکھتا ہے۔ بسکٹوں کی ورائٹی میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔ کسیلا سا گھونٹ گھونٹ یہ میرے اندر جاتا سیال پانی دھیرے دھیرے تھکن کو بلاٹنگ پیپر کی طرح چوستا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی سی بات چیت۔ کچھ سیاسی۔ لڑکا تیز طرار جوشیلا سا۔ میرے ذرا نوکیلے سوالوں پر یقین اور اعتماد بھری آواز میں کہتا ہے۔

شہر تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگوں کا ہے۔ جن کا امن اور بھائی چارے سے رہنا اُن کی بزنس مجبوری ہے۔ مختلف النوع مذاہب اور ثقافتوں کا گڑھ ہے یہ۔ سیاست پر بات کرنی چاہی۔ لڑکے نے سوال کے ساتھ ناک پر مکھی اُڑانے جیسے طرز کا سلوک کیا۔

''یہ علوی Alawites کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''اسلام کی ایک الجھاؤ میں لپٹی ہوئی شاخ۔ مذہب کو تو چھوڑیں۔ یہاں پرانے حلب میں تو ڈھیروں مذاہب اور فرقے ہیں۔''

کیفے میں کچھ لوگوں کے آنے سے وہ اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ میں اُٹھ گئی۔ کہیں گلی ختم ہوئی اور میرے سامنے ایک اور کشادہ گلی نمودار ہوئی۔ یہاں وہ چھیل چھبیلا سا نوجوان کمر پر جس کے عین درمیان ایک بڑی سی دکان منقش تانبے اور پیتل کی آرائشی اشیاء سے سجی اِس ماحول میں یوں جگمگا رہی تھی جیسے سیاہ رات میں کوئی روشن تارہ جگمگ جگمگ کرتا ہے۔ کیا بیان ہو اُس دروازے کا، اُس پر جھکے چوبی شیڈ کا اور اندر کے طلسمی سے ماحول کا۔

ایک کونے میں رجسٹر پر جھکا ایک بوڑھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ دو ملازم تین ٹورسٹوں کے ساتھ مصروف تھے۔ پتہ نہیں بیچارے کس دیس سے تھے؟ ایک لفظ انگریزی کا نہیں بول سکتے تھے۔ ہنسنے ہنسانے والی مضحکہ خیز صورت تھی۔ انہیں یونہی ایک دوسرے میں اُلجھا چھوڑ کر میں آگے بڑھی۔ بوڑھے کے پاس رکی۔ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا گیا۔ تعارف ہوا۔ بڑی رواں اور شستہ انگریزی تھی۔ خدا کا شکر جیسے دندناتے آ گئی تھی۔ اِس انداز کا برا نہیں مانا تھا۔ بیٹھنے کو کہا تھا۔ بیٹھی اور بات چیت کی طرف توجہ کی۔ شہر کی سماجی زندگی بارے کچھ جاننے کی لگن ہی سوال کی صورت سامنے آئی تھی۔ چند لمحوں کی سوچ۔

خاموش نگاہوں سے ذرا ماحول اور میرا جائزہ۔ پھر مدھم سے لہجے میں گفتگو۔

حلب اگر چہ بہت سے نسلی اور مذہبی خانوں میں منقسم ہے۔لیکن حلب کے شہری اِن باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ بڑی وجہ شہر تجارت اور صنعتوں کا گڑھ ہے۔ پیشے بھی مختلف نسلی و مذہبی فرقوں میں زمانوں سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔اِس کی مثال یوں سمجھیئے کہ جیولری اور مکینکس کا زیادہ کام آرمینیائی لوگوں کے پاس ہے۔اور وہ اِس کام کے ماہر بھی ہیں۔کُرد لوگوں کی اکثریت نے تعمیراتی کام سنبھالا ہوا ہے۔سنی لوگوں کی اکثریت بزنس سے متعلق ہے اور عیسائی کمیونٹی فیبرکس کے کام میں بہت فعال ہے۔ پیشے اور کاروبار کی ایک دوسرے سے جڑت نے لوگوں میں رابطہ داری اور وسعت نظری پیدا کر رکھی ہے۔ایک دوسرے کی خوشی وغم کی تقریبات میں جانا اور دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے معاملات بھی روزمرہ معمول کا حصہ ہیں۔ہاں شہر کے مضافات میں یہ صورت نہیں ہے۔

بشار کے اندازِ حکومت بارے بڑی دھیمی سی آواز میں بولا تھا۔ کچھ کام بہت اچھے کئے ہیں۔ انفراسٹرکچر بہت بہتر ہوا ہے۔حلب میں کچھ ہی سال پہلے کوئی مال نہیں تھا اب بے شمار ہیں۔اسی طرح پرائیوٹ اسپتال،سکول،بینکوں اور شہر کی اقتصادی ترقی نے حلب کو شام کا دوسرا بڑا تجارتی مرکز بنا دیا ہے۔ رقا الفرات سے کیواک دریا Quwaiq River کا دوبارہ چالو کرنا بھی بڑا کام ہے۔تاہم کرپشن بھی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ چپڑاسی سے وزیر تک ایک زنجیر ہے اِس تسلسل کی جس نے عام آدمی کی زندگی کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔

ایک سوال انتہا پسندی کے حوالے سے بھی پوچھا۔

اسلامی انتہا پسندی تو ہے اور بعض جگہوں میں اس کی جڑیں گہری ہیں۔گو حلب اور دمشق میں اس کا زور نہیں۔جیسے میں نے پہلے کہا کہ یہاں اعتدال ہے۔میانہ روی ہے۔مگر ادالیب اور دمشق کے مضافات اور خود حلب کے گاؤں گڑھ ہیں۔اسلام کو بھی طبقاتی اور سیاسی حد بندیوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ بڑے لوگوں کا اسلام پیسہ اور معتدل رویے ہیں۔ جبکہ درا اور رقا کے دیہی علاقوں کی سماجی زندگی میں اسلام اپنی قدامت پسندی کے ساتھ پوری طرح رچا بسا ہے۔ جہاں سُنی اکثریت ہے جو سلفی عقیدے

سے منسلک ہے۔ ہاں البتہ حمص میں سنی اعتدال پسند لوگوں کا ایک طبقہ بشار کا حامی اور دوسرا اُس کا مخالف جمہوریت کا حامی اور انقلاب لانے کے لئے بے چین ہے۔

وہ خود آرمینیئن تھے۔ یہودیوں بارے پتہ چلا تھا کہ اب حلب میں کوئی یہودی نہیں۔ کبھی بہت تھے۔ اسرائیل بنا تو ڈھیرے ڈھیرے سب اپنی جائیدادیں بیچ باچ کر وہاں چلے گئے تھے۔

شام کے ڈھلنے میں قطعی تیزی نہ تھی۔ مجھے بھی لوئے لوئے گھر جانے کی قطعی جلدی نہ تھی۔ اپنی یادداشتوں والے سارے بھانڈے ٹینڈے بھرنے کی ضرورت تھی۔

میری آنکھوں میں بھوک ناچتی تھی۔ ندیدہ پن چھلکتا تھا۔ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ گرسنہ آنکھوں کے برتن میں کیا کیا ڈالتی جاؤں۔

دیئے جلے تو جیسے دھرتی کے سائبان کا تھال کوچہ و بازار میں اُتر آیا۔ کسی نے کہا تھا۔ قصر ولی میں ہر روز مقامی میوزک نائٹ ہوتی ہے۔ اُسے ضرور دیکھئے۔ جہاں کھڑی تھی وہاں سے قصر ولی کتنے پیچ وخم کے بعد تھا۔

غیر ملکیوں کا ایک ٹولا کہیں ادھر ہی جا رہا تھا۔ لڑکے نے کہا ان کے ساتھ نتھی ہو جائیں۔ یہ وہیں جا رہے ہیں۔ اب کھڑی حساب کتاب میں اُلجھتی ہوں۔ فاصلہ کتنا ہوگا؟ واپسی کیسے ممکن ہوگی؟ اور پھر جیسے دل نے کہا۔ لڑکا تو جوانی کے جذبوں سے بھرا ہوا ہے۔ پینڈے مارنا اس کے لئے کونسا مشکل کام ہے؟ اِسے تو یہ دو چار گلیوں والا معاملہ ہی لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو تیرا ملیدہ ہو جائے۔ فرانسیسی ٹولہ تو کسی کو لفٹ کروانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

نی میں جانا جوگی دے نال

ہائے نی جانا ٹلہّ جوگیاں تے

معلوم نہیں پکار سچی تھی کہ جب اپنے ہوٹل پہنچی تو میرے ساتھی واپس آ چکے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ آج ہوٹل میں میوزک نائٹ منائی جا رہی ہے۔

واہ مولا میرا ٹلہ جوگیاں چل کر میرے پاس آ گیا

پروگرام آہنی راڈوں پر کھڑے بیٹھے خیمے نما ہال میں منعقد ہو رہا تھا۔ چھت قالینوں سے سجی دیواریں قالینوں سے ڈھنپی، فرش قالینوں سے منڈھے۔ رنگ اور نظاروں کا جہاں آباد کیا ہوا تھا۔ ہال کے عین درمیان میں چبوترہ نما سٹیج سجی تھی۔ سازندے اللہ جانے کون کون سی دھنیں بجا رہے تھے۔ ایسی دھنیں جو سمجھ نہ آنے کے باوجود دل میں اُتری جاتی تھیں۔

رات گئے یہ محفل ختم ہوئی۔ چلو روح کی سیری ہوئی۔ دل کی سیری ہوئی۔ اور کہہ لیں آنکھوں کی بھی ہوئی۔

☆☆☆

باب نمبر 15:

30 فری سیرئین آرمی کے الفاروق کی المیہ داستان

(ڈاکٹر ہدا کی جانب سے ایک اور ای میل)

ڈیر سلمٰی

اسلام وعلیکم

اف سلمٰی میں کیا بتاؤں تمہیں۔کیا سناؤں۔میرا شام اور خاص طور پر میرا حلب تو المیہ داستانوں کا گھر بن گیا ہے۔گزشتہ دنوں میں کیسب Kessab میں تھی۔یہ شامی اور ترکی سرحد پر ایک شامی قصبہ ہے یہاں میری ملاقات ابوالفاروق سے ہوئی۔لواس کی داستان الم بھی سنو۔

شام کے بے حد خوبصورت شہر پرانے حلب میں جو شام کا شمالی حصّہ ہے اور تہذیبوں کا گھر ہونے کے ناطے پوری دنیا میں شہرت کا حامل ہے۔میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ فوڈ اسٹور چلاتا تھا۔اسٹور سے حاصل ہونے والی آمدنی تقریباً 3000 ڈالر ماہانہ تھی۔گو یہ آمدنی کچھ اتنی کم تو نہ تھی مگر عیال دار گھرانہ ہونے کے باعث پوری نہ پڑتی تھی۔گھر کے اخراجات بعض اوقات 4000 ڈالر سے بھی زیادہ جا پہنچتے۔سچی بات ہے کاروبار چلانے کے لیئے آپ کو سرکاری عملے کو رشوت دینی پڑتی تھی۔چاہے آپ قانون کے مطابق ہی کام کر رہے ہوتے تھے۔ہم ہمیشہ مقروض ہی رہتے۔

اِن حالات سے تنگ آ کر میں نے رومانیہ جانے کی ٹھان لی۔ رومانیہ میں شامیوں کی خاصی تعداد ہے۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی انداز میں حکومت کے ستائے ہوئے لوگ تھے جو ہمہ وقت اپنے وطن کے بارے سوچتے، باتیں کرتے اور عملی طور پر ایسی ہر جدوجہد میں اپنا حصّہ ڈالنے کے لیئے بہت پرعزم رہتے جو انہیں آزادی دلا سکے۔ کبھی کبھار ہم کڑھ کر سوچتے۔'' شامی لوگ آخر کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ آخر تیونس اور لیبیا کے لوگوں نے بھی تو ہمت کی نا۔''

یہ کس قدر خوش آئند بات تھی کہ حکومتی جبر تلے ڈرے اور سہمے لوگوں نے حوصلہ پکڑا۔ ایک نے دوسرے کو شہہ دی۔ یوں آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔ ہم لوگ بھی حکومت کے خلاف سرگرم ہو گئے۔

تاہم رومانیہ میں، میں اور میرے دوست زبردستی کی دربدری پر مجبور کرنے کے مسلسل خوف میں مبتلا تھے۔ ہمیں یہ خوف بھی تھا کہ حکومت ہمارے گھر والوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے جو ابھی تک شام میں تھے۔ لیکن دوسرے عرب ممالک میں (2011 کے ابتدا میں کی گئی) بغاوتوں سے حوصلہ پا کر ہم نے شام میں رابطے تیز کر دیے۔ فیس بک اور ٹویٹر کے ذریعے ان لوگوں سے رابطے کیئے جو حکومت کے خلاف مظاہرے کرتے ہوئے انقلاب کی چنگاری کو ہوا دینے میں مدد کر رہے تھے۔ ہم نے رومانیہ، آسٹریا اور جرمنی مظاہروں کا انتظام کیا۔ ہم نے میڈیا پر انقلاب کے اہداف اور شام کے لوگوں کے خلاف حکومت کی مجرمانہ کاروائیوں کے بارے بات کی۔

ہمارا مقصد پرامن انقلاب کے لیئے دباؤ ڈالنا تھا اور جو شام میں ہو رہا تھا اس کی سچائی کو منظرعام پر لانا تھا، اور یہ بتانا تھا کہ کس طرح حکومت عقوبت خانوں میں مظاہرین کو تشدد اور اذیت کا نشانہ بنا رہی تھی۔ پہلے مظاہرے کے ساتھ ہی حکومت کا خوف ختم ہو گیا۔ لیکن ہمیں عالمی برادری سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسد کو اجازت دے گی کہ وہ شام کے لوگوں کو قتل کرے۔

تین ماہ بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چار کاروں میں 3,500 کلومیٹر سے بھی زیادہ کا سفر کرتے ہوئے جرمنی سے آسٹریا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ اور ترکی سے ہوتے ہوئے آخر کار شام پہنچ

گئیے۔ اِس سامان کوخریدنے اور شام لانے کے لیئے بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ ہم اپنے ساتھ جو سامان لائے تھے ان میں ادویات، سٹیلائٹ جدید موبائیل فونز، کیمرے، خفیہ کیمرے جیسے پین، ہیٹ اور کھلونے مظاہرین کے لیئے تھے تاکہ فلم بناتے وقت خود کو حکومتی فوج سے چھپائے رکھیں۔ یہ چیزیں ہم نے بارڈر پر انتظار کرتے ہوئے کارکنوں کے حوالے کیں۔

ہم نے دو ایمبولینس ہیمبرگ سے خریدی تھیں۔ لیکن جمہوریہ چیک میں ایک بڑے برفانی طوفان کے دوران ہمیں ایک کار حادثہ پیش آیا اور ایمبولینس برف میں دھنس گئیں۔ انہیں نکالنے میں ہمیں دو دن لگے۔ پھر ایک اور مصیبت نے آ گھیرا۔ ایک پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہماری گاڑی جو کافی اونچی تھی وہاں پھنس گئی۔ کتنی پریشانی اٹھائی اور کتنا وقت ضائع ہوا۔

موبائل فونز اور انٹرنیٹ کا سامان کپڑوں میں چھپا کر کار کی سیٹوں کے نیچے رکھ گیا جوتوں اور شامی ڈبل روٹی کے ڈبوں میں بھی چیزیں چھپائی گئیں۔

جس دوران ہم نے سرحد پار کی۔ ہمیں ادویات لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن ہم کچھ ابتدائی طبی امداد کا سامان جیسے کہ سٹریچر اور وہیل چیئر آزاد شامی فوج اور مقامی کمیٹیوں کے لیئے لے جا سکتے تھے۔

کبھی کبھار یہ سامان سیکورٹی فورسز کے ہاتھ بھی لگ جاتا۔ ایک بار ایک راکٹ نے گاڑی کو نشانہ بنایا۔ نشانہ خطا ہو گیا تو پھر گھات لگا کر تعاقب کیا گیا اور بالا آخر پکڑ لیا گیا۔

بعض اوقات انٹرنیٹ وصول کرنے والے آلات، تھورائیا (سٹیلائیٹ فونز) اور ذرائع مواصلات کے آلات سے لدے ہوئے ٹرک گم کر دیئے گئے دو بار ایسے سامان کو لے جاتے ہوئے سیکورٹی فورسز والوں نے ڈرائیور قتل کر دیا۔ ایک بار گرفتار کر لیا۔

ہم اس قابل تھے کہ 50 سے زیادہ پرانی ایمبولینسیں شام بھیج دیتے۔ ہم نے کچھ ہیمبرگ سٹی کونسل سے خریدی تھیں جبکہ دوسری ہنگری میں وزارتِ صحت سے خریدی گئی تھیں۔ ان میں ہر کوئی 5,000 ڈالر مالیت کی تھی جس کی ادائیگی ہم نے اپنی بچتوں میں سے کی یا پھر ان عطیات سے جو شام

سے جلاوطن کیئے گئے لوگوں نے دیے تھے۔

میں رومانیہ میں قیام پذیر ہونے پر اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا تھا۔ خود کو ہمہ وقت لعن طعن کی کسوٹی پر کھنے لگا تھا۔ خود سے کہتا تھا۔ میرے شام کو اس وقت میری ضرورت ہے۔ گو میں کوئی توپ قسم کا انسان تو نہیں تاہم جذبوں سے تو بھرا ہوا ہوں۔ اِس قابل تو ہوں نا کہ اپنا حصّہ ڈال سکوں۔ بہر حال اس کام کو کرنے سے ہم سب دوست اتنے مطمین تو تھے کہ ہم اپنا حصّہ ڈال رہے ہیں۔

جس دوران شامی شہری حکومتی فوج کا مقابلہ کرنے پر قتل کیئے جا رہے تھے۔ فوراً ہم نے ترکی میں ایک دفتر کھولا اپنے لوگوں کے قریب تر ہونے اور امدادی سامان شام تک پہنچانے کی کوشش کو آسان بنانے کے لیئے۔

شام میں موجود جنگجوؤں کی طرف سے ہمیں پیغام ملا کہ ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں تھی ہمارے لیئے اہم ساز وسامان کی فوری فراہمی زیادہ ضروری تھی۔ وہ ہماری بھرپور حمایت چاہتے تھے۔

جب 2011 میں دمشق میں درعا میں احتجاجی مظاہرے شروع ہوئے تو ہمیں یہ اُمید تھی کہ حکومت جواب میں کچھ اصلاحات کی پیشکش کرے گی اور لوگوں کے غم وغصہ کو کم کرے گی۔ یقیناً اتنا ہی کافی ہوتا۔ لیکن حکومت کتنی گھمنڈی تھی اس کا تو ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ کس وحشیانہ طریقے سے پرامن لوگوں کے خلاف تشدد پر اتر آئی۔

حلب میں میرے بھائیوں اور دوستوں نے ساتھ ساتھ مل کر حکومت کو گرانے کی صدا بلند کرتے ہوئے احتجاجی مظاہروں میں حصّہ لیا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سیکورٹی فورسز نے آزادی اور جمہوریت کے لیئے بلند کیئے گئے ان کے نعروں کا جواب مہلک گولیوں اور پکڑ دھکڑ سے دیا۔ 150 طالب علموں کو کارکن ہونے کی بنا پر دو یا تین مہینوں کے لیئے حراست میں لے لیا گیا۔ بات چیت کے انعقاد اور بحران کے حل کے لیئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ لوگ عام لوگ حکومتی فوج کا سامنا کھلی چھاتیوں سے کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے دفاع کی خاطر بندوقیں خریدنے کے لیئے پیسہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے 15 ستمبر 2011 کو اپنی مسلح کاروائی حلب میں ایک فوجی

چیک پوائنٹ کے خلاف کی۔ چیک پوائنٹ کو بڑا بھاری نقصان ہوا لیکن اس سے پہلے وہ اُن لوگوں کو جو گذشتہ ماہ حراست میں لیئیے گئے تھے آزاد کرواتے۔ اُن کا سارا اسلحہ ختم ہو گیا۔

انہوں نے سوچا کہ حکومت کے گرنے کے بعد شام کو کنٹرول کرنے کے لیئیے ہمارے پاس فوج ہونی چاہئیے اور آزاد شامی فوج (الجیش السوری العر) فری سیرئین آرمیز (ایف ایس اے) کے نام کے تحت کئی بریگیڈ تشکیل دی گئیں۔

میرے چھوٹے بھائی نے ایف ایس اے میں شمولیت اختیار یہ سوچ کر کی کہ ہمارا مقصد ایک جمہوری آزاد شام تھا نہ کہ فرقہ پرست۔

مجھے کھل کر کہنے دیں کہ اِس انقلاب میں سیندھ لگانے والے بھی اندر کے ہی غدّار تھے خواہ یہ ایف ایس اے (فری سیرین آرمی) ہی کیوں نہ ہو۔

پہلی ایف ایس اے بریگیڈ میں حلب سے 25 نوجوان شامل کیئیے گئے لیکن اور زیادہ رضا کار آتے گئے حتیٰ کہ وہاں سے 400 سے زیادہ جنگجو ہو گئے۔ یہ لوگ ایک ریکارڈ مدت میں حلب کا 90% حصّہ آزاد کرانے کے قابل تھے۔ لیکن جب وہ ایک بڑی فتح حاصل کرنے کے قریب ہوتے تو ایف ایس اے حکام انہیں روک دینے کا کہتے یا گھمسان کی جنگ کے عین بیچ میں وہ رضا کاروں کو ہتھیار بھیجنا بند کر دیتے۔ ایف ایس اے حکام نے ہمارے معاملے میں ایک مشکوک کردار ادا کیا۔

آئی ایس آئی ایس ISIS (داعش) کے ساتھ ہماری جنگ ہماری بقا کا معاملہ ہے۔ پھر (داعش) اور جباہ النصری کے ظہور نے حلب میں ہماری کمر توڑ دی۔ النصریٰ نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ایف ایس اے کی حمایت میں آئے تھے۔ اور شام پر حکمرانی کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن کچھ ایف ایس اے بریگیڈ کے کمانڈرز غائب ہونا شروع ہو گئے اور ان کی لاشیں ہمیں حلب کے صحرائی علاقے سے ملیں۔ ہمارے گروپوں کا تو وہ حال تھا کہ وہ بیک وقت آئس ISIS (داعش)، جباہ النصری، کُرد اور حکومت کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ کتنے محاذ کھل گئے تھے۔ ہمارے لوگ سوچتے کہ اگر ہم نے خود کو آئس ISIS (داعش) اور جباہ النصریٰ کے ساتھ لڑنے کے لیئیے وقف کر دیا تو حکومت اُن حصّوں پر دوبارہ قبضہ

کر لے گی جو ہم نے آزاد کرائے تھے۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیئے آئس ISIS (داعش) کے ساتھ یہ بات طے پائی تھی کہ آئس ISIS (داعش) کے آزاد کرائے گئے علاقوں سے ایف ایس اے کو دور رکھا جائے گا۔اور آئس ISIS ہمارے علاقوں پر پیش قدمی نہیں کریں گے۔لیکن آئس ISIS والوں نے لوگوں کو مذہبی تقریروں اور پیسہ کے ذریعے اپنی طرف مائل کرنا شروع کر دیا اور ایف ایس اے کے 10,000 سے زیادہ لوگ ISIS (داعش) سے لڑنے کے لیئے چلے گئے۔ بہت سے لوگوں کو یا تو ISIS کے ساتھ لڑنا تھا اور روزی کمانا تھا یا پھر ایف ایس اے کے ساتھ لڑنا تھا اور بھوک سے مرنا تھا۔

ہمارے درمیان کے وہ جنگجو جو ہمارے خلاف ہو گئے تھے، کے نقصان کو پورا کرنے کے لیئے ہم نے نئے بھرتی مراکز قائم کیئے۔ نئے بھرتی شدہ افراد کی تعداد صحیح ہے۔لیکن ہمیں ابھی بھی پیسے اور ہتھیاروں کی کمی کا سامنا ہے۔ ہماری فوج حلب کے دیہاتی علاقے میں 40,000 سے زیادہ جنگجوؤں کے ساتھ بن رہی تھی۔ ہماری ISIS کے ساتھ جنگ ایک بقا کا معاملہ ہے۔حکومت کے ساتھ کوئی بھی معاہدہ ناقابلِ قبول ہے کیونکہ ہم نے قربانیاں دی ہیں۔پچھلے چار سالوں میں 150 سے زیادہ جنگجو جنہیں میں جانتا تھا کھو دیے ہیں۔حلب کے مقامی لوگ ابھی بھی ہماری حمایت کرتے ہیں اور نئے بھرتی شدہ افراد کی ایک بڑی تعداد نے ہمیں ایک اچھا حوصلہ دیا ہے کہ ہم حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں۔لوگ اس بات کے لیئے تیار ہیں کہ آزادی حاصل کرنے میں مزید چار سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

میرا یہ خود سے عہد ہے کہ میں اس وقت تک لڑائی جاری رکھوں گا جب تک میرے جسم میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 16:

مشرقی حلب کے کھنڈرات سے جنم لینے والے

کرداراور کہانیاں

(رقیہ الحاجی اور علی النصر کی داستان الم)

- O تبدیلی مذہب ایک ایسا گھمبیر مسئلہ ہے۔ جومشرق وسطیٰ میں نئے خطرات اور مشکلات کو جنم دے گا۔
- O بپتسمہ دربدر اور بھوکے ننگے لوگوں پر روٹی اور روزگار کے دروازے وا کر رہا ہے۔
- O لبنانی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں بوجھ سمجھتے ہیں۔

یہ کیسے دن ہیں؟ بے حد عجیب سے۔ جذبات واحساسات کی مختلف سمتوں میں متحرک۔ کہیں اُداسیوں کے کہرے میں لپٹے، کہیں سلگتی آنچ میں دھیرے دھیرے جلتے، کہیں موت جیسے سناٹے میں ڈوبے اور کہیں چیختی چلّاتی آوازوں میں بمشکل سانس لیتے۔

میں اِن دنوں اپنے گھر اپنے شہر لاہور میں ضرور ہوں۔ مگر کیسے؟ بظاہر وجود تو یہاں ہے مگر روح حلب کے اُن کوچہ و بازاروں میں ہے جہاں 2008ء کی گرم سی دوپہروں اور میٹھی سی خنکی میں لُتھڑی شاموں اور صبحوں میں اس کے خوبصورت نظاروں سے آنکھیں اور دل سیراب کرتی تھی۔

سچی بات ہے حلب میں گزرے ہوئے ہر دن پر مجھے خواب کا سا گمان گزرتا تھا۔ میں نے اسے

جی بھر کر دیکھا ہے۔اوپر والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہ تھکتی تھی۔

آج میں ملول ہوں۔دل گرفتہ ہوں۔حلب جل رہا ہے۔کھنڈر بن رہا ہے۔ڈاکٹر ہدا مجھے وہ تصاویر دکھا رہی ہے جو خوفناک ہی نہیں حیات کے دکھوں اور المیوں سے لبالب بھری ہیں۔

اُس کی اِس میل نے تو عجیب سے اضطراب اور دُکھ میں دھکیل دیا ہے۔بہت پرانی کہاوتیں یاد آئی ہیں۔سیانے لوگوں کی باتوں اور اُن کے تجربات کی سچائیوں کی ہمہ گیریت کا ایک دفعہ پھر قائل ہونا پڑا ہے۔

واقعی غربت سے بڑا کوئی روگ نہیں اور روٹی سے بڑا کوئی مذہب نہیں۔

لکھتی ہیں۔

رقیہ الحاجی کو میں نے برج الحماد کے علاقے میں دیکھا تھا۔اپنے دو بچوں کے ساتھ۔وہ علی اناجیلی چرچ آف گاڈ کے سامنے دیوار کے سائے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ایک لاغر سا بچہ گود میں لئے، ویران آنکھوں میں ایسا خوفناک سناٹا تھا کہ جس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔میری ساتھی ڈاکٹر حنانیا اُسے پہچان کر اس کی طرف لپکی تھی۔رقیہ کی چھوٹی بہن حنانیا کے گھر کام کرتی رہی تھی۔

ہم دونوں اس کے پاس بیٹھ گئیں۔زردیوں میں نہاتا اس کا چہرہ، زندگی سے بیزار اِس پر بکھرے رنگوں کے سائے لبنان میں بھاگ کر آنے والے لوگوں ہی کی طرح نظر آتے تھے۔

گود میں سوتا بچہ بیمار تھا۔دوائی کے لئے پیسے نہیں تھے۔شوہر کے پاس کام نہیں تھا۔مہاجر کیمپوں میں کوئی پرسان حال نہیں۔

ہم نے عیسائی بننے کے لئے درخواست دی ہے۔میں پتہ کرنے آئی تھی کہ ہماری درخواست کو پذیرائی کب ملے گی؟ راشن بھی لینا ہے۔اس کی آواز شکستہ مدھم اور گہرے دکھ کی غماز تھی۔

آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ کہتی ہے۔چلو بندہ خود تو بھوک ننگ برداشت کر ہی لیتا ہے مگر یہ چھوٹے چھوٹے بچے۔انہیں تو روٹی کے لُقمے چاہئیں نا۔

اپنے تین بچوں میں سے بڑے بارہ سالہ بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں ہمیں بتاتی

ہے کہ اس نے حج کیا ہوا ہے۔ مگر اب کیا کریں؟ مر جائیں۔ بپتسمہ لے کر وہ پناہ کے لئے کینیڈا یا جرمنی جانے کی درخواست دے گی۔

پھر یاس بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

وہ اپنے خون کے اُن رشتوں کے لئے بھی پریشان ہے جنہیں وہ شام میں چھوڑ آئی ہے۔ اُس کی ماں باپ بہنیں بھائی وہ سب جن کے بغیر زندگی بڑی ادھوری ہے۔ کل اُن کا ردِعمل کیا ہوگا؟ کیا وہ ہمیں اپنائیں گے؟ ہمیں اِس نئے مذہب کے ساتھ قبول کریں گے؟ یا دھتکار دیں گے؟

علی النصر کی کہانی بھی اِس سے کم دردانگیز نہیں۔ النصر پرانے حلب میں میرے بھائی کے محلے میں رہتا تھا۔ بھائی کے مطابق وہ رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والا اُدھیڑ عمر کا صحت مند آدمی تھا۔ چھ بچوں کا باپ جس کے سب بچے تعلیم کے مختلف مدارج میں زیرِ تعلیم تھے۔ جنگ سے کاروبار تباہ ہو گیا۔ روٹی کے لالے پڑے تو بچوں کو حلب کے مضافاتی گاؤں میں بوڑھے والدین کے پاس چھوڑ کر لبنان آ گیا۔

غریب آدمی جانتا ہی نہ تھا کہ آسمان سے گرے گا تو سیدھا کھجور کی شاخوں میں جا اٹکے گا۔ لبنان اس کے لئے ایسے دکھ لئے کھڑا ہوگا کہ جو کہیں اس کے گمان میں بھی نہ تھے۔

ڈاکٹر ہدا لکھتی ہیں کہ دراصل میرے بھائی اپنے ایک عزیز سے ملنے اشبیلہ کے علاقے میں گئے تھے جو مرکزی بیروت سے کوئی چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہیں النصر انہیں ملا۔ پریشان خستہ حال۔ انہیں دیکھتے ہی پھوٹ پڑا۔

میرے ساتھ کیا ہوا؟ پورے دو سال ایک ادارے میں چپڑاسی کا کام کرتا رہا۔ تنخواہ مالک کے پاس جمع کرواتا رہا۔ سوچا تھا کہ چلو اکٹھی رقم ملے گی تو مستقبل کی کچھ منصوبہ بندی کروں گا۔ مگر دو سال بعد جب میں نے مالک سے اپنی رقم مانگی تو وہ منکر ہو گیا۔ میرے سر پر تو جیسے ایک بار پھر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ روتا رہا۔ بلکتا رہا۔ روٹی کو محتاج، پیچھے بیوی بچے بوڑھے والدین۔ کیا بتاؤں انہیں؟ کس کے پاس جاؤں۔ کسے سناؤں۔ کون دادرسی کرے گا؟

ہم نے اپنے وطن شام میں کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ کسی نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کی ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور کبھی، کہیں سننے میں آتا تھا کہ کوئی عیسائی اپنے مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ چرچ ہماری روز مرہ زندگی میں کہیں آتے، کسی راہ، راستے میں کسی مسجد، کسی شینی گاگ کی طرح نظر آنے والی ایک مذہبی عمارت کے ایک منظر کی حد تک تو محفوظ تھا۔ مگر اس کے اندر کیا ہوتا ہے اِس سے تو کبھی آگاہی نہ تھی۔

ہاں مگر جب آپ کی محنت سے جوڑی ہوئی پونجی دن دہاڑے لٹ جائے اور کہیں کوئی شنوائی نہ ہو۔ زندگی آپ کا جینا دوبھر کر دے۔ تب پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے آپ چرچ سے بٹتا راشن لینے جاتے ہیں اور ترغیب کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

بپتسمہ آپ پر روٹی اور باہر جانے کے دروازے کھولتا ہے۔ تاہم موم بتیوں کی مخصوص بوزدہ ماحول میں سانس لیتے، لکڑی کی سستی سی بنچوں پر بیٹھ کر مذہبی گیت پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔

یہ سب کتنا عجیب اور اجنبی اجنبی سا ہے۔ اِن سب کے لئے نہ کوئی جاذبیت، کوئی مانوسیت، کوئی جذبہ، کوئی لگاؤ، کوئی للک کچھ بھی تو نہ تھا۔ کانوں میں ایک آواز گونجتی ہے۔

''حی علی الفلاح، حی علی الفلاح''۔ ہمارے کان تو اِن رسیلے بولوں سے مانوس تھے۔

پریشان سا میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا ہے۔ گھبراہٹ، بے چینی، کرب، دکھ اور درد جیسے جذبات اور کیفیات کی ایک اُتھل پتھل سی تھی۔ میری طرح وہ سب بھی ایسے ہی جذبات ومحسوسات کا شکار تھے جنہوں نے علی انا جیل چرچ آف گاڈ میں بپتسمہ لیا تھا۔

میرے ہم وطن شامی جو امن کے لئے ترسے ہوئے ٹھوکریں کھاتے یہاں آئے تھے۔ اور بیروت کی اُن مضافاتی غریب بستیوں میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ اچھی ملازمتوں کے دروازے ہم پر بند ہیں۔ کہ لبنانی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ رتّی برابر ہمدردی نہیں انہیں ہم سے۔ یہ ہمارے ہمسائے جن کے لئے کہا جاتا ہے ماں جائے ہیں جس کی آدھی آبادی ہماری ہم مذہب ہے۔ کہیں اُن کا صدر بیان دیتا ہے کہ لبنان اب مزید مہاجرین کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ کہیں لوگوں کا واویلا ہے۔

اب سچی بات ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لئے کچھ بھی کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ چرچ میں جا کر

گڑگڑاتے ہیں کہ ہمیں عیسائی بنالو۔ ہمیں بپتسمہ دے دو۔ ہمیں باہر جانے کے لئے ویزہ دلا دو۔

مگر ایک تلخ امتحان بھی سامنے کھڑا ہے کہ اُن کے وہ رشتے جو شام میں رہ گئے ہیں ان کا کیا بنے گا؟ کیا وہ ہمیں قبول کریں گے؟ نہیں ہرگز نہیں کریں گے تو پھر مستقبل کیا ہوگا؟ کتنا بھیانک سوال ہے جو منہ کھولے کھڑا ہے۔

تبدیلی مذہب ایک ایسا گھمبیر مسئلہ ہے جو مشرق وسطیٰ میں نئے خطرات اور مشکلات کو جنم دے گا۔

☆☆☆

باب نمبر 17:

آواز دو کہ حلب جل رہا ہے

سولہ 16 دسمبر 2014ء کے دن کا گو آغاز ہو گیا تھا۔مگر وقت تین بجے صبح کا تھا جب میری آنکھ کھل گئی تھی۔دوبارہ سونے کی کوشش کی۔دائیں بائیں بہتیرے پلسٹے مارے۔مگر نیند پلاّ پکڑانے میں نہ آرہی تھی۔میں اِس کی وجہ بخوبی سمجھتی تھی۔اِن دنوں ''حلب'' زیرِتحریر تھا۔ملکی اخبارات تو کہیں موٹی موٹی خبروں سے ہی بے سکونی کا باعث تھے۔مگر وہاں سے آنے والی ای میلیں ذہنی انتشار کا زیادہ باعث تھیں۔

فجر کی نماز کے بعد سونے کی ایک بار پھر کوشش کامیاب ہوگئی۔کوئی ساڑھے دس تک سوتی رہی۔اٹھی چہل قدمی کے لئے باہر لان میں آگئی۔

صبح تو کہیں سے بھی اداسی اور افسردگی میں ڈوبی ہوئی نہ تھی۔چمکدار بھی تھی۔روشن بھی۔سرد ضرور تھی مگر اداس ہرگز نہ تھی۔ناشتے کے لئے اندر آئی تو گویا جیسے ایک چیختی چنگھاڑتی خبر نے منجمد کر دیا۔میں نے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔میرے پشاور کے آرمی پبلک سکول میں انتہا پسندوں نے جس طرح میرے دیس کے پھول سے بچوں کو لہولہان کیا اُس نے جیسے میرے وجود کو برف کے کسی گلیشئر تلے دفن کر دیا تھا۔لگتا تھا میرے اندر زندگی سے بھری کسی امنگ کا کہیں دور دور تک کوئی احساس نہیں۔خالی خالی ہوں۔امن کو ترسی ہوئی۔تفکرات میں ڈوبی ہوئی۔

کوئی ہفتہ بھر بعد یونہی ذہن کو اِدھر اُدھر کرنے، ذرا اپنی دل گرفتگی کو کم کرنے کے لئے انٹرنیٹ کھولا ہے۔بہت دنوں سے ڈاکٹر ہدا کی میل میری منتظر ہے۔پڑھتی چلی جاتی ہوں۔کہیں ڈوب رہی

ہوں، کہیں اُبھر رہی ہوں۔ میرے بہتے آنسو میرا گھائل ہوتا دل سب ایک بار پھر اضطراب میں ہیں۔ دیکھو ابھی ڈاکٹر حاتم مجھے بتا رہے تھے۔

شام کا شہر رقا اِس داعش کا اب انتظامی اور تعلیمی مرکز بن گیا ہے۔ مزے کی بات دیکھو۔ نصاب سے آرٹ، موسیقی، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، سائنس اور حتیٰ کہ دینیات تک نکال دیا ہے۔ کوئی پوچھے باقی کیا بچا؟ کس اسلام اور اسلامی ریاست کی کون سی اصلاحات کا نفاذ کرنا ہے اُنہیں۔ طالبات کے لئے نئے لباس کا ضابطہ بھی جاری کر دیا گیا ہے۔

اب احمد میرے کزن نے لکھا ہے کہ میں بچوں کو اسکول نہیں بھیج رہا ہوں۔ مگر گھروں پر چھاپے پڑ رہے ہیں کہ بچوں کو اسکول بھیجا جائے۔ سکولوں پر چھاپے پڑ رہے ہیں کہ اساتذہ اُن کے منظور کردہ طریق سے ہی تعلیم دے رہے ہیں یا نہیں؟

اِس خانہ جنگی نے بچوں کی ایک نسل کو عام زندگی کے نارمل رویوں سے محروم کر دیا ہے۔ ہر طرف پھیلا ہوا خوف، ڈر اور دہشت نے نفسیاتی طور پر اُنہیں اگر ہراساں اور خوف زدہ کر دیا ہے تو انہیں تشدد پسند بھی کر دیا ہے۔ اُن کی سوچیں مثبت رہی ہی نہیں۔ شام میں جو بچے ہیں وہ آدھے سے زیادہ سکول نہیں جا رہے۔ ہمسایہ ملکوں میں پناہ لینے والے کیمپوں میں کوئی لگ بھگ 20 لاکھ کے قریب ہیں۔ جو سارا دن آوارہ پھرتے ہیں۔ اب اِن بچوں کی سوچیں منفی نہ ہوں گی تو اور کیا ہوگا؟ قانونی شناخت کیسے ملے گی؟ سرحد سے تو نکل آئے مگر آگے کے خوفناک مسائل۔

القائدہ ہی کیا کم تھی کہ اب داعش نے اِن بچوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ شدت پسند اور انتہا پسند یہی دھتکارے ہوئے بچے ہوں گے جو دنیا کے امن کو چیلنج کریں گے۔ یہ بڑے ملک اپنی سیاستوں اور مفادات کی دکانیں چمکاتے رہیں۔ وہ دن آئے گا جب یہی بچے ان کی آل اولادوں کو خون میں نہلائیں گے یہی ہوتا ہے۔ اسی کا نام مکافاتِ عمل ہے۔

یہ 1906ء کا بڑا گرم دن تھا۔ مئی کا پہلا ہفتہ اور پہلی ریاستی ڈوما (ملک کے مختلف حصّوں کی نمائندہ لوگوں پر مُشتمل پارلیمانی کونسل) کا پہلا اجلاس سٹیٹ ہال میں منعقد ہو رہا تھا۔ سٹیٹ ہال کی

چھت کے نیچے ایک عجیب سا منظر تھا۔ سامنے مرصّع صوفوں پر مادر زارینہ ماریا فیدورونا اس کی بہو الیگزینڈرہ اور دیگر معزز خواتین، ہال کے دونوں اطراف پر کھڑے ڈیوک اور کورٹ ایلیٹ اپنے سینوں پر شاہی امتیازی تمغے سجائے شاندار ملبوسات پہنے کھڑی تھی۔ کُرسیوں پر بیٹھے رُوس کے مختلف حصّوں سے آنے والے عوامی لوگ اپنے عجیب وغریب حُلیوں اور لباسوں سے ایک ایسا منظر تخلیق کر رہے تھے جو رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اس تناظر میں بے محل سا نظر آتا تھا۔ لمبے لمبے کالے کوٹ پہنے کسان تھے۔ فراک نما کوٹ پہننے والے بوڑھے تھے۔ شانوں پر لہراتے لمبے بالوں والے انٹیلکچوئل تھے جنہوں نے مونوکل لگا رکھے تھے۔ پولینڈ کا پادری گہرے پرپل کپڑوں میں تھا۔ مڈل کلاسیے جن کی ڈھیلی ڈھالی قمیصیں اور کچھ ایسے جو بغیر کالروں کے، چند لوگ Poole کے لباس میں تھے۔ دوصدی قبل کے ڈیزائنوں والے ڈریس پہنے لوگ بھی نظر آتے تھے۔ پولینڈ کے ایک ممبر نے ہلکے نیلے رنگ کا ڈانسرز کا ڈریس زیب تن کر رکھا تھا اور ہیس (جرمنی کا ایک شہر) کے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

یہ کس قدر خوش آئند بات تھی کہ رُوسی سوسائٹی کے تمام طبقے اپنی اپنی کلاس اور علاقے کی نمائندگی کے لئے موجود تھے۔

پرنہیں حکمران زار کی ماں زارینہ ماریا کے لئے اُن گھٹیا لوگوں کو برداشت کرنا مُشکل ہو رہا تھا۔

سونے اور میلاچی سے آراستہ جب وہ اپنے اِن کمروں میں آئی اُس کی طبعیت متلا رہی تھی۔ اُس کے سر میں درد تھا۔

تین دن اس کی طبعیت خراب رہی۔ چوتھے دن اُس نے اپنے وزیر مالیات سے کہا۔

''یہ کیسی ڈوما ہے۔ اتنے گھٹیا لوگ۔ میرے لئے انہیں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا''

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے پل بھر کے لئے آنکھیں بند کیں۔ پھر اُنہیں کھولا اور اپنے آپ سے کہا۔

''زارینہ ماریا فیدورونا تمہارا اور تمہاری سوچوں کا بھی کچھ قصُور نہیں۔ اس تناظر میں وہ بھی

ٹھیک. پر جب تمہارے اِس ونٹر پیلس میں انہی خوبصورت کمروں میں جن پر چڑھا سونا اور آرائش آنکھوں کو چُندھیاتی ہے۔خالتوران نے اسے بم دھماکے سے اُڑانے کو ایک مُقدّس فرض سمجھا تھا۔نادرن یُونین آف رشین کا ایک معمولی کارکن جو عام رُوسی کی حالت زار پر کُڑھا کرتا تھا۔جو جیالا تھا۔دلیر تھا۔ایک اعلیٰ بڑھئی کی حیثیت سے ونٹر پیلس میں مرمت کے کام پر معمُور رہوا۔اِس درجہ معاشرتی تفاوّت کو ہضم ہی نہ کرسکا۔خود پھانسی پر چڑھ گیا پرتم جیسے شیشے کے گھروں میں رہنے والوں کو عدم تحفّظ کے احساس میں مبتلا کرگیا۔اور ہاں زارینہ ماریا فیدورونا اُنہی گھٹیا لوگوں جنہیں دیکھ کرتمہاری طبیعت متلائی تھی نے صرف بارہ سال بعدتمہاری ساری آل اولاد کو تہ تیغ کردیا تھا۔

اِس ظلم اِس تشدد پر مجھے بھی افسوس ہے پر معاشروں کی اِس درجہ اُونچ نیچ ہمیشہ ایسے ہی المیوں کو جنم دیتی ہے اور یہی تاریخ ہے۔

چار سال ہوگئے ہیں اِس عذاب کو جھیل رہے ہیں۔پچھلے دنوں عارضی سا وقفہ ہوا تو سوچا کہ چلو بچے سکول جانا شروع ہوں گے۔مگر یہ تو خام خیالی تھی۔بمباری میں ایسی شدت آگئی کہ لگتا تھا کہ اگلی پچھلی ساری کسریں نکالنی ہیں۔سو بم تو سکولوں پر ہی گرائے گئے ہوں گے۔

حلب کے تمام سکول زیرزمین منتقل ہوگئے ہیں۔مونا بدر کا گھرانہ غسل خانے میں سونے پر مجبور ہے کیونکہ یہ سارے گھر میں محفوظ ہے۔

حلب میں بچوں کے اسپتال کا کیا احوال سناؤں۔بہت سارے ڈاکٹرز تو چلے گئے ہیں۔چند ہی تو باقی ہیں۔ڈاکٹر حاتم جیسا مسیحا بھی اُنہیں میں سے ایک ہے۔جو ایک بایان چلڈرن اسپتال کے میڈیکل ڈائریکٹر بھی ہیں۔ابھی صبح ہی تھی کہ اسپتال کے نزدیک بم گرا۔بیرل بم۔عملے اور مریضوں کو فوراً تہہ خانے میں منتقل کیا گیا۔باہر بموں کی بارش اور اندر بچوں اور والدین کی چیخ وپکار۔یہ قیامت تھی۔

حلب میں کتنے بچے زندہ رہ گئے ہیں؟ صرف 90 ہزار۔اسی طرح کے بیرل بم اگر ایسی تعداد میں ایک دوبار اور گرائے گئے تو ان کا بھی صفایا ہوجائے گا۔

بنکر شکن بم گرائے جا رہے ہیں۔پوری عمارت کا نام ونشان ختم۔بس ایک گڑھا باقی۔

امریکہ، روس، ترکی، ایران، سعودی عرب، لبنان، ملیشیا، حزب اللہ۔ سب زندہ باد۔ ہم کمزور ناتواں لوگ مردہ باد۔

امریکہ ہمارے لئے بس پریشانی کا اظہار کرتا ہے۔ زبانی جمع خرچ اور کچھ نہیں۔ ہم امریکہ سے بدظن ہو چکے ہیں۔ متنفر ہو گئے ہیں۔ امریکہ سے بڑا العنتی بھی شاید ہی کوئی ہوگا۔ روس ذلیل اور امریکہ ذلیل تر۔ دونوں کے درمیان پارٹنرشپ کا کوئی سلسلہ ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا ہے۔ دونوں ذلیل کھلاڑی خون اور آگ کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ مگر کن کے سروں پر؟ نہتے معصوم لوگوں پر۔ یہ اقوام متحدہ بھی کیا چیز ہے؟ ہر دوسرے دن بیان داغنے پر زور دیتی ہے۔

مہینوں پہلے ایک سفارت کار نے کہا تھا۔

''مشرقی حلب پر قبضے کا واحد راستہ یہی ہے کہ بشار چنگیز خان کی طرح اپنے مددگاروں سے کہے کہ اتنے انسانیت سوز ظالمانہ اور سفاکانہ انداز میں دھاوا بولا جائے کہ پھر مشرقی حلب کی گلیاں خون سے نہا جائیں اور اِن مین بشار کے مخالفوں کی لاشیں تیرتی نظر آئیں۔''

تو یہی ہو رہا ہے اور زور وشور سے ہو رہا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 18:

حلب کے کھنڈرات میں پھول اُگانے والا ابوال ورد

- ابوال ورد (پھولوں کا باپ) کو بمباری کی آوازیں بیتھو ون موسیقی جیسی لگتی ہیں۔
- اس کا کہنا ہے کہ میری کچی پکی دیواروں والی نرسری بلین ڈالروں سے زیادہ قیمتی ہے۔
- حلب کی عورتیں دو دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ بشار اور ISIS

ڈاکٹر ہدا کی جانب سے ملنے والی اُس ای میل کو میں نے دنوں بعد کھولا ہے۔ دراصل میں ان دنوں دہرا کشٹ کاٹتی ہوں۔ بلاد الشام پر اپنے سفرنامے کو لکھنے کے تخلیقی لمحوں میں شام کے گلی کوچوں میں پھرتی ہوں۔ اس کے دکھ اور عذابوں کے بوجھ وہاں سے آنے والے پیغامات سے اٹھاتی ہوں۔ پھر اپنے ملک پر نگاہ ڈالتی ہوں۔

خود ہم بھی تو اِسی منجدھار میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سر پر تنا آسمان ہر نئے دن نئے رنگ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ دھرتی کتنی بے وفا ہے؟ اتنا خون پیتی ہے۔ اتنے لعل و گہر نگلتی ہے۔ مگر نہ اس کی پیاس بجھتی ہے اور نہ اس کا پیٹ بھرتا ہے۔

ابھی کل رات ڈاکٹر ہدا کی میل ملی ہے۔ پڑھتی ہوں۔ پڑھتی چلی جاتی ہوں۔ آنکھیں گیلی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

''پروردگار تیری کائنات میں کیسے کیسے لوگ ہیں؟ کہیں اگر ظالم، زندگی ختم کرنے والے، اس کا حُسن گہنانے والے ہیں تو وہیں زندگی کا حُسن بڑھانے اوراسے بچانے والے بھی ہیں۔''

یہ کیسی دکھ بھری بات ہے کہ میں جو تمہیں گزشتہ بہت سارے مہینوں سے کتنے ہی المناک اور دکھ بھرے واقعات جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے حامل میرے اِس شہر حلب کے قلب وجگر سے پھوٹ رہے ہیں سنا سنا کر تمہاری محبت کا پتہ پانی کر رہی ہوں۔ خود تو روتی ہوں مگر تمہیں بھی رُلا رہی ہوں۔

مگر دیکھو آج میں اِن سب تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ایک ایسا رُخ بھی دکھانے لگی ہوں جو بہت ہی اُمید افزاء ہے۔ یہ اُمید کی وہ کرنیں ہیں جو گھُپ اندھیروں میں کہیں کہیں چمک کر حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ جو انسانیت کے زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ جب تک کرہ ارض پر ایسے لوگ موجود ہیں اُس وقت تک مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ نئی نسل کے وہ نوجوان ہیں جو شب وروز اپنے ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ کہیں ٹینٹ، کہیں تباہ شدہ عمارتوں، کہیں درختوں کے نیچے، کہیں کھُلے میدانوں میں تنبوقناتوں میں اسکولوں میں بچوں کو پڑھاتے اور کہیں انہیں قطرے پلاتے کہیں ان میں زندگی کا حوصلہ اور جینے کی اُمنگ پیدا کرتے ہیں۔

حلب کا وہ ابوال ورد (پھولوں کا باپ) بھی ایسا ہی کردار ہے۔ مشرقی حلب کے عین مرکزی حصّے میں جو تہذیبوں کا مرکز ہے۔ جہاں سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں جہاں چوراہے ہیں وہیں گذشتہ پانچ سالوں سے وہ بشار حکومت کے خلاف کھڑا ہے۔

کلسٹر اور بیرل بموں کی آگ اور خون، موت اور تباہی کے ریگستان پر زندگی کی، روشنی کی، آس امید کی بھینی بھینی خوشبوئیں دیتے پھولوں کے نخلستان کی آبیاری میں مصروف ہے۔ اگر بشار حکومت اپنی کرسی، اپنا اقتدار بچانے کے لئے شہر کی خوبصورت عمارتوں کو کھنڈر بنانے، سکولوں میں شام کا مستقبل ختم کرنے، اسپتالوں میں بیماروں کو قبریں دینے اور بستے رستے شہر کو اپنے مہلک ساز وسامان کے ساتھ تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے تو وہیں ایک عام سا معمولی آدمی بھی اپنے اِن چھوٹے چھوٹے معمولی

سازوسامان سے مقابلہ کرنے پر کمر بستہ ہے۔

اس کا کہنا ہے میری یہ کچی پکی دیواروں میں گھری، مٹی کی سوندھی خوشبو میں بسی پھولوں اور پودوں سے سجی جگہ بلین ڈالروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

اس کا تیرہ سالہ بیٹا ابراھیم اس کے ساتھ ہے۔ وہ پھول اُگاتا ہے، سبزیاں، سلاد کے پتے، زیتون Nuts پیدا کرتا ہے۔ پھر انہیں بہت معمولی قیمت پر اُن لوگوں کو فراہم کرتا ہے جو گھروں میں محصور ہیں۔ جن کے مرد باہر چلے گئے ہیں یا مارے گئے ہیں۔

پانی کی کمی ہے۔ خوراک کی کمی ہے۔ بمباری کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایسے میں اس کا وجود ایک معجزہ لگتا ہے۔ روشنی کی ایک کرن دِکھتا ہے۔ زندگی کے حسن کا ایک ستارہ محسوس ہوتا ہے۔

وہ حیران ہوتا ہے۔ آخر انسان اتنا وحشی کیوں ہوجاتا ہے؟ اپنے اقتدار کے لئیے اتنی دیوانگی۔ وہ بشار کے خلاف ہے۔ وہ انقلاب چاہتا ہے۔ ایسا انقلاب جہاں عام آدمی اپنے بل بوتے پر اوپر جا سکے۔

وہ بمباری کے دوران پناہ لیتا ہے۔ ختم ہونے پر نکلتا ہے اور کہتا ہے ہم جو آمریت کے خلاف کھڑے ہیں ہمیں یہ آوازیں بیتھوون کی موسیقی لگتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ دنیا خاص لوگوں کے لئے نہیں عام لوگوں کے لئے بنی ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اِسے دوبارہ بنانا ہے خواہ یہ کتنی ہی تباہ کیوں نہ ہوجائے۔ شعروں سے، پھولوں سے، موسیقی سے، محبت سے اور یقین سے۔

جنگ شروع ہوئی تھی تب ابراھیم آٹھ سال کا تھا۔ سکول جاتا تھا۔ سکول کھنڈر بننے لگے تو وہ باپ کے ساتھ پھول اگانے لگ گیا۔ دونوں باپ بیٹا گلاب کے سُرخ پھولوں کے ساتھ چوک میں کھڑے ہوتے تو پانچ لاکھ آبادی والا شہر جہاں اب صرف ڈھائی لاکھ لوگ رہ گئے تھے جو گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، پیدل چلتے ہوئے اِن خوشنما پھولوں کو دیکھ کر جیسے جی اُٹھتے انہیں محسوس ہوتا کہ زندگی ابھی باقی ہے اور اُس کا حُسن بھی باقی ہے۔ اُس کی مسحور کن خوشبو زندگی کی پیامبر ہے۔

پر سلمٰی میں کیا بتاؤں۔ کیا لکھوں کہ وہ جو سارے شہر میں امیدیں بانٹتا پھرتا تھا۔ وہ جو حلب کی

امید تھا۔ بیرل بم نے اُسے شکار کرلیا۔اس کے باغ کے قریب پھٹا اور وہ ختم ہوگیا۔معصوم سے ابراھیم نے میرے گلے لگ کرا تنے آنسو بہائے کہ میرے پاس تسلی بھرے لفظوں کا کال پڑ گیا۔ میں تو اُس عظیم انسان کے لئے کھل کر پُرسہ بھی نہ دے سکی۔اس کی ہنستی مسکراتی تصویر میرے دل میں آویزاں ہے۔ مجھے حوصلہ دیتی ہے۔

اُن سب شامی عورتوں کی طرح جوابوال ورد کی طرح استقامت سے کھڑی ہیں۔اب یہ بھی کیسا ستم ہے کہ ہم دو دھاری تلوار پر چل رہی ہیں۔ایک بشار حکومت کی دھمکیاں دوسرے ISIS کی جانب سے اڑا دینے والے پیغامات۔

آغاز میں تو بمباری کی صورت پھر کچھ بہتر تھی کہ بشار کی فورسز کے پائلٹ موسم کے ابرآلود اور خراب ہونے کی صورت میں بمباری نہ کر سکتے تھے۔ہم خوش ہوتے اور دعائیں مانگتے۔ پروردگار دھواں دھار قسم کی بارش ہوتی رہے۔لیکن یہ جب سے روسی طیاروں نے دوستی کا حق ادا کرنا شروع کیا ہے۔اُن کے کہنہ مشق پائلٹوں کے لئے ایسی سب چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔اب کیا کہوں؟ ہمہ وقت آسمان سے موت اترتی رہتی ہے۔

ہم بشار حکومت کے بہت خلاف ہیں۔اس نے انسانیت کو جیسے تباہ کیا ہے اس کی مثال مشکل ہے۔اب مرد ہی نہیں عورتیں بھی سربکف ہیں۔دو دشمنوں کے خلاف بشار اور ISIS کے۔

☆☆☆

باب نمبر 19:

حلب سے روانگی مرۃ النعمان میں چند گھنٹے

- ابوالعلا المعری دسویں، گیارھویں صدی کا شاعر نہیں تھا وہ موجودہ عہد کا شاعر ہے۔
- 2013ء میں النصرہ فرنٹ کے جہادیوں نے شاعر کے آبائی شہر میں جابجا نصب اس کے مجسموں کے سر قلم کر دیئے۔
- دانتے نے ڈیوائن کومیڈی المعریٰ کی رسالتہ الغفر ان سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔
- یورپ کی تحریک احیائے علوم میں ایک بڑا کردار مسلم مفکرین کا بھی ہے جن کی پذیرائی اسلامی دنیا سے کہیں زیادہ عیسائی دنیا نے کی۔

خدا بھی کیسا مہربان اور رحیم ہے۔ علی نے صبح ناشتے پر بتا دیا تھا کہ فوراً نکلنا ہے اِس کی خواہش ہے کہ ہم راستے میں آنے والے اہم مقامات دیکھتے چلیں۔

میرا اندر تو جیسے پھول کی طرح کِھل گیا تھا۔

''ہائے علی جیتے رہو۔ کتنا بڑا احسان کر رہے ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ پر تھوڑا لیکن خود پر زیادہ۔''

پر جب اُس نے ادلیب Adleb، صلاح الدین سٹیڈیل، لاطاکیا Lattakia، پھر

حماHama ،حمص Homs ،ابوالعلا المعریٰ اورعمر بن عبدالعزیز کے مزارات پر جانے کا ذکر کیا۔فاطمہ کوتو جیسے پتنگے سے لگ گئے۔ بولنے کی تو اُسے یوں بھی بیماری تھی۔ بات ابھی علی کے منہ سے بس ختم ہی ہوئی تھی جب اس نے اپنا مشوروں والا پٹارہ کھول دیا۔

''اِن چھوٹے موٹے شہروں کو چھوڑو۔ وقت ضائع کیوں کریں؟ حمص میں پڑاؤ کرتے ہیں۔خالد بن ولید کے مزار پر کچھ وقت گزاریں گے۔''

''تمھیں اگر کسی بات کا پتہ نہیں تو چپ رہو۔ میری مینجر سے رات تفصیلی بات ہوئی ہے۔ یہ سب راستے میں ہی تو ہیں۔کوئی ایک آدھ جگہ بس تھوڑا سا مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر ہے۔''

فاطمہ نے جواباً ٹرٹر کرنے کی کوشش نہ کی۔شوہر کی۔مزاج آشنا تھی۔ہاں البتہ تھوبڑا سا منہ ضرور بنالیا۔

جی چاہا کہوں فاطمہ تیرا چہرہ بڑا پیارا سا ہے۔یونہی تو نے غصہ بھرلیا ہے اِس میں۔ذرا اچھا نہیں لگ رہا۔اورتم کیا عمر بن عبدالعزیز کے مزار پر حاضری دینا نہ چاہو گی؟اتنی بڑی ہستی۔ عمرابن خطاب کا پڑپوتا۔ان کے اوصاف کا کچھ حصہ لئے ہوئے۔اور ہاں ابوالعلا المعریٰ،حلب کا کلاسیکل انقلابی شاعر۔یہ تو سچی بات ہے تحفہ دیکھنے کو ملے گا۔ چلوتھوکو غصے کو۔ایسا پیار کرنے والا شوہر ساتھ ہے۔ماں جیسی ایک عورت جو سیر سپاٹوں کی حد سے زیادہ شوقین ہے،جس کی من کی مراد بن کہے پوری ہورہی ہے۔دعائیں لو اس کی اور سیر سپاٹے کی اِس نعمت سے لطف اٹھاؤ۔

نسرین کی طرف دیکھا۔وہاں نہ خوشگواری تھی اور نہ ہی بیزاری کا کوئی عنصر تھا۔ وہ تو جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ میں نے چہرہ باہر کی طرف کرلیا۔ سچی بات ہے میں تو ٹھنڈی ٹھار مزے میں تھی۔ مجھے کیا چاہیے تھا۔میرا تو حال پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں جیسا تھا۔

دفعتاً نسرین کی تجسس و حیرت میں ڈوبی آواز نے گاڑی کے ماحول میں ارتعاش سا پیدا

کیا۔

''ارے بھئی یہ وہی المعریٰ تو نہیں جس کا علامہ اقبال نے بال جبرائیل میں ذکر کیا ہے؟ مجھے یاد آئی ہے ابوالعلا المعریٰ کے عنوان سے اس کی نظم۔ساتھ ہی نسرین نے پڑھنی بھی شروع کردی تھی۔

کہتے ہیں گوشت نہ کھاتا تھا معریٰ
پھل پھول پر کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اِک دوست نے بھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ تیتر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تروتازہ معریٰ نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب ِ غفران ولزومات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتاتو
تیر ا وہ گناہ کیا تھا جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

سچی بات ہے مجھے تو نظم کا قطعی علم نہ تھا۔المعریٰ کا یوں نام سن رکھا تھا۔جانتی وانتی کچھ نہیں تھی۔ہم تینوں تو اِس معاملے میں کورے ہی تھے۔اقبالیات کی عاشق اگر کسی چیز کے بارے میں کچھ کہتی تھی تو یقیناً درست ہی ہوگا۔

بہرحال کوئی ساٹھ کلومیٹر پر مرکزی شاہراہ سے کچھ ہٹ کر پہاڑیوں میں گھرا ابھرا

بحیرہ روم کی ہواؤں میں لپٹا ادلیب Adleb دیکھنے کو ملا۔ کھیتوں اور باغوں میں جا بجا کہیں پلاسٹک کہیں پولیتھین کی چادریں اور کہیں اس کے شیڈ موسمی سبزیوں اور پھلوں کو بچانے کے لئے چھاؤں کرتے نظر آتے تھے۔ کیا بات تھی شہر کی۔ اتنا خوبصورت کہ جتنا جھوٹ بول لو۔ ہری کچور فصلوں میں لہلہلاتا، مسکراتا، سارے شام کو دانہ دنکا دینے کا اعزاز سمیٹے بہت ہی اچھا لگا تھا۔ داڑھیوں اور برقعوں کی بہتات نظر آئی تھی۔ گائیں بھی نظر پڑیں۔

گاڑی روک کر شبیر نے راہگیر سے ابوالعلیٰ المعریٰ اور عمر بن عبدالعزیز کے مزارات کا پوچھا۔

راہگیر نوجوان سا لڑکا تھا۔ اس نے معرۃ النعمان جگہ کے بارے بتایا۔ المعریٰ کا مزار وہاں سے کچھ ہی دور تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کے روضے کے علاوہ وہاں ایک میوزیم بھی ہے جانا تھا۔

المعریٰ کے بارے ہمیں علی سے پتہ چلا تھا کہ ملحد شاعر تھا۔ عمر بن عبدالعزیز امیہ خاندان سے تھے۔ یہاں مجھے علی کے لب و لہجے میں خفیف سا بھی مسلکی اختلاف محسوس نہیں ہوا تھا۔ علی بڑی لبرل سوچ کا حامل اور مزے کا بندہ تھا۔ اس نے ہوٹل کے مینجر سے المعریٰ کے بارے کافی کچھ سنا تھا۔ یہی تھوڑا بہت اُس نے ہمارے ساتھ بھی شیئر کیا۔

میں نے بند شیشے سے باہر دیکھا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے مٹیالے آسمان سے سیال سونے کی آبشار سبک خرامی سے بہتی ہوئی اُن جگہوں کو نہال کر رہی تھی جس کا مضافاتی قصبہ معرۃ النعمان کے نام کا بورڈ اٹھائے ہوئے تھا۔ سڑک کے کنارے نصب بورڈ دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کر کے اُسے اندر جانے والے راستے پر موڑ دیا تھا۔

راستے کے دونوں اطراف دور تک پھیلے ویرانوں میں زیتون کے پیڑوں، جنگلی درختوں، خاکستری چٹانوں اور کہیں کہیں کھنڈرات کو دیکھتے ہوئے میں سوچے چلی جاتی تھی کہ شام

تاریخی اور ثقافتی لحاظ سے کس قدر امیر ہے۔ دورافتادہ جگہیں بھی خزانے چھپائے بیٹھی ہیں۔

معرۃ النعمان کچھ جدید اور کچھ قدامت کا رنگ وروپ لئے مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر قصبہ نما شہر تھا۔ بازار میں زندگی کی رونقیں پورے عروج پر تھیں۔ عورتیں آزادانہ گھومتی پھرتی تھیں ۔تاہم اکثریت سیاہ میکسی نما گاؤن اور حجاب میں ملبوس تھیں۔ داڑھیوں اور کلین شیو مرد پتلون قمیضوں میں اور کہیں توپ پہنے گھومتے پھرتے تھے۔ سرخ وسفید پھولی پھولی گالوں والے من موہنے سے بچے ماؤں کے ساتھ چلتے پھرتے پیارے لگے تھے۔ سبزی، پھلوں، کھلونوں اور کپڑ ے کی دکانیں رنگوں کی برسات میں لتھڑی پڑی تھیں۔ کچھ پھلوں سبزیوں کے مانوس چہرے اور کچھ نامانوس سے تھے۔ جی چاہتا تھا یہاں رکیں۔ کچھ خریدیں ،نامانوس چہروں کے نام پوچھیں۔ مگر سچی بات ہے علی سے ڈر لگتا تھا۔

شہر شاعر سے محبت کرتا محسوس ہوتا تھا۔ کئی خوبصورت جگہوں اور پارکوں میں رومن آرٹ کے شاہکار پیڈسٹل پر سجے اُس کے مجسمے نظر آئے تھے۔ پھر گاڑی مختلف گلیوں کے موڑ کاٹتی ایک عمارت کے سامنے رُک گئی۔ محرابی صورت لمبا سا برآمدہ جس کے سامنے آنگن میں پتھر کے پیڈسٹل پر اپنے وقت کا عظیم فلسفی شاعر اپنے دونوں بازو لپیٹے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ گھنی داڑھی اور بےنور آنکھوں والا جس کا دماغ ذہانت سے مالا مال تھا۔

فاتحہ پڑھی۔ دعائے خیر کی۔ شاعر کے بارے کچھ مزید جان کاری ہوئی کہ دانتے نے ڈیوائن کومیڈی اسی شاعر سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ عمر خیام بھی شاعر سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ دعائے خیر مانگنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی تھی۔

پچیس جولائی 2008ء کی مرۃ النعمان کی روشن سی صبح جو میری یادوں کی پٹلیوں میں میری ڈائری کے صفحات پر اپنی تفصیلات کے ساتھ قید تھیں۔ اور اِس وقت دھیرے دھیرے وہاں سے نکل کر میرے سامنے بکھرے سفید کاغذوں پر تصویریں بنا رہی تھیں۔

دفعتاً میں نے لکھتے لکھتے سر اٹھایا۔ مرۃالنعمان کی اُس دنیا سے اپنے گھر اور اپنے کمرے کی دنیا میں آئی کہ مارچ 2013ء کی کچھ قدرے ٹھنڈی کچھ قدرے گرم سی سہ پہر کو خادمہ نے چائے کی چھوٹی سی ٹرے میرے سامنے رکھ دی ہے۔ مہکتی خوشبو سے بے حال کرتی چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اپنے مزاج کے برعکس کہ چائے کو بس ہمیشہ لطف وسکون سے پینے کی کوشش کرتی ہوں یونہی کمپیوٹر آن کر لیا۔ میل باکس کو چیک کیا۔ ڈاکٹر ہدا کی میل منتظر تھی۔

''اُف''۔

جیسے میری چائے میں زہر گھل گیا تھا۔ میں پڑھتی تھی اور دیکھتی تھی اُس عظیم شاعر کو اُسی خوبصورت پارک میں اُسی پیڈسٹل پر بیٹھے ہوئے مگر کیسے؟ بغیر سر کے۔

وہ جو علم و آگہی کا پیکر تھا۔ جس کی سوچ اور فکر اپنے وقت سے صدیوں آگے کی تھی۔ وہ گیارھویں صدی کا شاعر کب تھا؟ وہ تو بیسوی اکیسیویں صدی کا شاعر ہے۔ جو انسان کو آزاد دیکھنے کا متمنی تھا۔ سٹرانڈ مارتے روایتی معاشروں سے کہیں بالا اپنی سوچوں میں خودمختار اور اپنے اظہار میں بے باک۔

ڈاکٹر ہدا لکھتی ہے۔

''تنگ نظری اور تعصب کے زہر نے انسان کے اندر کی معصومانہ انسانیت کو نگل لیا ہے۔ انہیں وحشی بنا دیا ہے۔ ہاتھ میں بندوقیں اور ہتھوڑے پکڑا دیئے ہیں۔ اُن کے چھوٹے ذہنوں نے اس کا بڑا ذہن توڑ دیا ہے۔

سلمیٰ آپ کے الفاظ مجھے یاد آتے ہیں۔ آپ کی شاعر کے لئے مرعوبیت۔ شام کتنا خوش قسمت ہے۔ اس کی ذات کے کتنے حوالے ہیں۔ ٹھوس اور جاندار۔ اب یہ رُخ بھی دیکھ لیں۔

میں نے نصرہ الفرنٹ کے لوگوں سے پوچھا ہے۔ سر توڑ کر تم خود کو طرّم خان سمجھتے ہو۔

بڑا معرکہ مارا ہے تم جاہلوں نے ۔مگر اس کا سر صدیوں پہلے جو لوگوں کو دے گیا تھا۔ اس کا کیا کرو گے؟ افسوس کہ اس تک تو تمہاری رسائی نہیں۔

ہاں تم لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اسد فیملی کے آباؤ اجداد میں سے ہے جو خاندان صدیوں سے بدعتی چلا آرہا ہے۔ چلو شکر تم نے سر توڑ کر بنیاد پرست مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خود پر جنت کے دروازے کھولنے کا سر ٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہے۔

ڈاکٹر ہدا نے تو اپنے پھپھولے پھوڑ لئے تھے پر میں کیا کرتی؟ میرا ملک بھی تو ایسے ہی ننگ انسانیت لوگوں کے ہاتھوں یرغمال ہوا پڑا ہے۔

مگر چند دنوں بعد عرب رائٹرز یونین کے احمد علی ال سیگا کی ای میل نے واقعے کی دوسرے رنگ میں تصویر کشی کی۔

اگر میں اپنے خیالات واحساسات اور سوچ کا تجزیہ کروں تو کہنا پڑے گا کہ بت شکنی کا یہ انداز اور طریقہ کار ماڈرن سیریا کے ثقافتی وتہذیبی ورثے کی تباہی سے کہیں زیادہ اُس فکر ونظر سے متصادم ہے جہاں ماڈرن عرب دنیا جدّت اور قدامت کی نظریاتی کشمکش میں گھری نظر آتی ہے۔ یہ منظر مجھے دھکیل کر انقلاب فرانس کے اُن دنوں میں لے گیا ہے۔ جہاں عوام نے مذہبی شخصیات کے مجسموں کے سر توڑ دیئے تھے۔

مجھے لگتا ہے کہ اسی طرح کی ایک اور سٹیج سیٹ ہوگئی ہے۔ ایک جانب انتہا پسندی کی حامل قوتیں میانہ روی اور اعتدال کے راستوں پر چلنے سے انکاری ہیں اور مسلسل شکاری کتوں جیسے طرز عمل سے اس کا تیاپانچہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ دوسری جانب قرون وسطیٰ کی سی سوچ رکھنے والے ایک معتدل آزاد خیال معاشرے کے متمنی ہیں۔ تیسری جانب ماڈرن انتہا پسند اپنے راگ الاپ رہے ہیں۔

اس کی موت کے ایک ہزار سال کے بعد اس کی جس انداز میں گردن زنی ہوئی اس نے

سوال اٹھایا ہے کہ یہ کیا بیسویں صدی کے ادبی حلقوں کے آپس کے تنازعات کا کہیں شاخسانہ تو نہیں۔

میں نے لکھنا بند کر دیا تھا۔ دل بڑا بوجھل سا تھا۔ شب کے کسی پہر اٹھی اور دوبارہ معرۃ النعمان پہنچی۔ کہ جب اُس کی تربت گاہ پر کسی جذب کے سے عالم میں بیٹھی تھی۔

آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ پھر بہت ساری ذاتی دعائیں اوپر والے کے حضور بھیج کر فارغ ہوئی تو جانی کہ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں۔ باہر آ کر دیکھا ڈرائیور کچھ ملتجی سی صورت بنائے کھڑا تھا۔ پتہ چلا تھا کہ اُس نے علی سے ایک گھنٹے کی اجازت طلب کی ہے۔

''کیوں بھئی خیریت؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''میری بہن یہاں رہتی ہے۔ بس کھڑے کھڑے اُسے دیکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

فاطمہ کو ایسا موقع اللہ دے۔

''تو اب سمجھ آئی یہ معرۃ النعمان کے لئے کیوں مرا جا رہا تھا؟''

''اگر آپ چاہیں تو یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں بہت شاندار الما آرا میوزیم ہے۔ آپ کو لئے چلتا ہوں۔ بڑی تاریخی حیثیت ہے اس کی۔ آپ اُسے دیکھ لیں۔ اس دوران میں بھی بہن سے مل آؤں گا۔''

ڈرائیور لڑکے نے فاطمہ کے لال پیلے چہرے کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پیش کش کی۔ تاہم علی نے نرمی سے کہا۔

''چلو چھوڑو۔ ہم لائبریری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کتابیں دیکھتے ہیں۔ کوئی بات چیت کرنے والا ملا تو شاید ہمارے علم میں کچھ اضافہ ہی ہو۔ مگر ہاں گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لینا۔''

لائبریری کتابوں سے بھری ہوئی تھی اور مزے کی بات کہ لائبریرین سلمان سکور بھی اظہار خیال میں منہ پھٹ ہتھ چھٹ ٹائپ کا تھا۔ شاعر بارے ابھی کچھ جاننے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اُس نے جیسے رٹو طوطے کی طرح بولنا شروع کر دیا تھا۔

''بہت منفرد اور بڑا شاعر ہی نہ تھا، فلاسفر تھا، لکھاری تھا۔ مگر سب سے بڑھ کر لادینیت کی دنیا کا وہ ایک ایسا شہسوار تھا کہ جس نے قدم قدم پر متنازعہ امور پر بحث ومباحثے کے دروازے کھولے۔ اُس نے مذہبی عقائد کو لتاڑا۔ اسلام کو رد کیا نہ صرف اسلام بلکہ عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت سبھوں کو رگید ڈالا۔ اپنے وقت کا سماجی انصاف کا بڑا داعی تھا۔ مگر ان سب کے باوجود وہ عرب کے عظیم کلاسیکل شعراء میں اہم نام کے طور پر جانا جاتا ہے۔''

فاطمہ کا تو مانو جیسے کسی نے نرخرہ دبا دیا ہو۔ تڑخ کر بولی۔

''ایک تو جس کے پاس کچھ علم آجائے وہ سب سے پہلے مذہب کا تیا پانچہ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی پوچھے رب بیوقوف تھا جس نے اتنی بڑی دنیا کا سیاپا سہیڑا۔ تو بھئی جب اس نے کائنات بنائی تو مرضی تو اسی کی چلنی تھی نا۔ سوذہنی، جسمانی اور معاشی فرق سب اس نے اپنی دنیا کا حُسن اور رونق بڑھانے کے لئے اپنی تخلیق میں بانٹ دیئے۔ یہ اُس کی مخلوق کے کچھ سر پھرے بھی اول درجے کے نمک حرام اُسی کے لتّے لینے لگ جاتے ہیں۔''

علی نے تیکھی آنکھ کا پہلا وار فاطمہ پر کیا۔ دوسری معذرت خواہانہ نظر لائبریرین پر ڈالی جو ادھیڑ عمر کا گورنمنٹ ملازم تھا اور جس نے اپنی ملازمت کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کیا تھا۔

''میری بیوی کو بولنے کی بیماری ہے۔ یہ ٹر ٹر نہ کرے تو اِسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ آپ نے محسوس نہیں کرنا۔ ہم تو زیارت کے لئے آئے تھے۔ ہماری خوش قسمتی کہ آپ جیسے صاحب علم سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کا کام بھی حرف اور کتاب سے ہے۔ تو شاعر کے بارے میں کچھ بتایئے۔

سچی بات ہے لگتا تھا۔ بیچارہ جیسے ترسا بیٹھا ہے کہ کوئی بولنے کو کہے تو سہی ۔شروع ہو گیا۔

پورا نام عرب روایت کے مطابق بڑا لمبا چوڑا ہے۔ ابوالعلیٰ احمد ابن عبد اللہ المعریٰAbul.AlaAl-Maari۔ پیدائش یہی کوئی لگ بھگ وسط دسمبر 973ء اِسی معرۃ النعمان Marrat al Numan میں ہوئی۔ بنوسلیمان مرا کے معزز خاندان کی شاخ تنوخ سے تعلق تھا۔ پیدائشی اندھا نہ تھا۔ چار سال کی عمر میں چیچک جیسی بیماری کا شکار ہوا اور دونوں آنکھوں کے نور سے محروم ہو گیا۔

دیکھ لیجیے صدیوں پہلے بھی یہ قصبہ ایسے ہی آباد تھا۔ یہیں معرۃ النعمان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہاں البتہ تعلیمی سلسلے میں کچھ وقت تریپولی اور انطاکیہ Anitoch اور شام کے دیگر شہروں میں گزارا، جہاں اُس نے قدیم مسودات اور کتابوں کو زبانی یاد کیا جو وہاں محفوظ تھیں۔

یہیں اُسے اپنے باپ کی وفات کا علم ہوا۔ اپنے دکھ کا اظہار اُس نے ایک مرثیے میں کیا۔ والد سے محبت اور اُس کی شخصی خوبیوں کا اعتراف اُس نے جس انداز میں کیا اُس نے اُسے ایک شہ پارہ بنا دیا۔ بغداد میں بھی کچھ وقت گزارا جو اُس وقت علم وادب اور شعروفن کا گہوارہ تھا کہ زمانہ عباسیوں کا تھا جو اسلام کا روشن اور سنہری دور خیال کیا جاتا ہے۔

یوں شاعری کا آغاز تو بچپن سے ہی ہو چکا تھا۔ لگ بھگ 1010ء میں سیر یا واپسی کی کہ ماں کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اُس وقت تک وہ شاعری کے ذریعے خاصی شہرت اور عزت حاصل کر چکا تھا۔

اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یاس کا مارا ہوا، قنوطی اور آزادانہ سوچ رکھنے والا مفکر تھا۔ معریٰ اپنے عہد کی ایک متنازعہ عقلیت پسند شخصیت تھی۔ جس کے ہاں سچائی کی دلیل کا سب سے بڑا حوالہ تھا۔ تاہم وہ زندگی اور اُس کے رویوں بابت بہت قنوطی تھا۔

اور ساتھ ہی نسرین نے اپنی زبان کھولی۔

''تو بھئی قدرتی بات ہے۔ایسا ہونا تو فطری ہے۔میرے خیال میں تو اُس پر یہ تنہائی پسندی اور قنوطیت کا اعتراض لگانا قطعی مناسب نہیں۔چار سال کی عمر میں ایک بچہ شدید بیماری کے ہاتھوں اپنی آنکھیں کھو بیٹھتا ہے۔رنگ وحُسن سے بھری دنیا سے محروم ہو جاتا ہے۔غربت کے ہاتھوں پروان چڑھتا ہے۔ماں وہ بھی بیمار۔اب بھلا وہ قنوطی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟''

نسرین نے شاعر کے دفاع میں تقریر کر ڈالی تھی۔

سلمان سکور نے نسرین کی بات کو سراہتے ہوئے اس میں اضافہ کیا۔

''آپ نے بالکل درست کہا۔خود اُس نے بھی اپنے بارے میں کچھ ایسا ہی کہا ہے کہ وہ دوہرا قیدی ہے۔ایک اندھے پن کا، دوسرے تنہائی کا۔سبزی خور تھا۔ایک جگہ لکھتا ہے۔

''ذبح کئے جانور کے گوشت کو کھانے کی کبھی خواہش نہ کرو۔''

''لو یہ نئی بات۔نرا ہندوؤں کا فلسفہ۔یہ بوٹی تین دن نہ ملے تو طلب تڑپنے لگتی ہے۔بے حال کر ڈالتی ہے۔'' فاطمہ نے دھیمی آواز میں ٹکڑا لگایا۔

شادی کرنے اور اولاد پیدا کرنے کے بھی وہ سخت خلاف تھا۔

''بچوں کو دنیا کے مصائب اور آلام بھوگنے کے لئے چھوڑ دو یہ کہاں کا انصاف ہے؟'' وہ کہتا تھا۔

''ہائے زندگی سے مسرتیں کشید کرنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا نا۔ہائے زندگی کی نعمتوں سے محرومی۔کتنا بدقسمت تھا؟'' فاطمہ جملے بازی اور چٹکلے چھوڑنے سے باز آ ہی نہیں سکتی تھی۔

اُف میں نے کوفت سے سوچا ایک تو میری اِن ساتھیوں کو بولنے کی بیماری ہے۔

''تو کچھ کام کے بارے بھی بتا دیں۔''

میں نے سوچا کچھ اِس بارے بھی تھوڑا بہت پتہ چل جائے ۔ دمشق سے کتابیں

ڈھونڈنے کی بھی کوشش کروں گی۔ایک تسلی انٹرنیٹ کی بھی تھی۔

سقط الزندSayat.Zand۔آغاز کی شاعری اِس مجموعے کی بہت سی نظمیں حلب کے معروف لوگوں کی ستائش میں ہیں۔دراصل یہ وہ مجموعہ تھا جس نے اُسے بطور شاعر متعارف کروایا۔اِس مجموعے نے اُس کی شہرت دورنزدیک پہنچائی۔

دوسرا مجموعہ۔لزوم مالا یلزم (غیرضروری ضرورت) اسے عام طورلزومیات بھی کہتے ہیں۔یعنی زندگی کو،اس کے طورطریقوں،اس کے چلن اور کاروبار کوالمعریٰ نے کیسے دیکھا،محسوس کیااور برتا؟

اُس کا تیسرا شہرت پانے والا کام نثر کی کتاب رسالتہ الغفر انRisalat-al-ghufran کی صورت میں ہے۔یہ بھی اُس کی ایک اہم کتاب ہے۔کہاجاتا ہے کہ اُس کا یہ کام عربی کے شاعر ابن ال کراQarih کے مذہبی نظریات کا براہ راست جواب ہے۔یہاں شاعر جنت کی سیر کرتا ہے۔اُس کی ملاقات اپنے آباؤاجداداور زمانہ جاہلیت کے شعراء سے ہوتی ہے۔اسلام کےعقیدہ کے برخلاف جس کے مطابق کہ صرف وہ لوگ جوخداکو مانتے ہیں وہی نجات کے مستحق ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اُس کا کام ابن شہدIbn Shuhayd کے رسالہ ال توابی وال جوابی کی طرح کا ہے۔ہاں البتہ یہ بھی ایک خیال ہے کہ دانتے نے ڈیوائن کومیڈی المعریٰ سے متاثر ہوکر لکھی ہے۔یہ المعریٰ کے سوسال بعد کی کتاب ہے۔تاہم یہ صرف خیال ہی ہیں۔کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام اِس ضمن میں سامنے نہیں آیا جوثابت کرے کہ المعریٰ ابن شہد کے نام سے متاثر تھا۔بعینہ جیسے دانتے المعریٰ سے۔

یہاں اگر میں کچھ تفصیلاً لزومیاتLuzumiyyat کے بارے بات کروں تو شاعر کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

یہ اُس کی شاعری کا وہ مجموعہ تھا جس میں اُس نے شاعری کے روایتی اور مروجہ روش سے احتراز کیا۔

اپنے اِس مجموعے لزومیات میں جب اُس نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے اندھے یقین واعتقاد کے مقدس اظہاریئے پر تنقید اور نقطہ چینی کی تو وہ کفر کا مرتکب ٹھہرا۔ معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی بجائے اُس نے اپنا کام پیش کر دیا۔ ٹھوس اور دلیل سے بھری آواز میں کہا۔

''میں نے اپنی شاعری کو تصوراتی رعنائیوں سے نہیں سجایا۔ میں نے اپنے احساسات وجذبات سے سیاہ کئے صفحات کو فضول محبت کی یاوہ گوئیوں، جنگ وجدل کے مناظر، شراب اور مے خانوں کے تذکروں اور اِدھر اُدھر کی فضولیات کے گل بوٹوں سے آراستہ نہیں کیا۔ میں نے اُسے جھوٹ اور منافقت کے زیور نہیں پہنائے۔ میرا کام تو سچ بولنا ہے۔

میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ بات کہنا چاہوں گا کہ شاعری کو سچائی کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا گیا بلکہ اُسے جھوٹ پر کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ اپنے وجود، اپنی ماہیت میں جب تشکیل پاتی ہے تو بے حد کمزور ہوتی ہے۔ اِس لئے میری تمنا ہے کہ اپنے قارئین کو اپنی کھری اور سچی شاعری میں شامل کروں۔''

اپنے بارے میں المعریٰ کہتا ہے۔

''ایک نابالغ ذہن کا مالک مجھے ملحد کہتا ہے۔ لیکن وہ اپنی پہچان میں درست نہیں۔ اگر چہ میں نے اپنی خواہشات کو ضبط اور کنٹرول کے دائروں میں مقید کر لیا ہے۔ مجھے دنیاوی خواہشوں کے حصول کے لئے بھاگنے سے ہمیشہ نفرت رہی۔ بغداد میں اپنی شاعری کو بیچنے پر میں نے پابندی لگا دی تھی۔ اور اب تو میرا وہ حال ہے کہ دنیا کی اِن آرزوؤں نے بذاتِ خود ہی مجھ سے کنارہ کشی کر لی ہے۔''

تاہم اُس کی مردم بیزار فطرت ایک دوسرے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''میں بنی نوع انسانوں میں سے ایک منکر کے طور پر بنا دیا گیا ہوں کیونکہ میں انہیں گہرائی سے جانتا ہوں۔مگر میرا علم جو اُن کے لئے تخلیق ہوا ہے محض ایک گرد ہے۔''

ظاہر ہے روایتی معاشرے اِس درجہ ننگی سچائیوں کو ہضم نہیں کرتے۔المعریٰ کی حد درجہ بے باکی اور صاف گوئی سے اظہار خیال نے بھی اُس وقت کی سوسائٹی کے سرکردہ اور معزز افراد کو ناراض کر دیا۔

رونالڈ نکولس Reynold Nicholos کے الفاظ میں۔

''انسانی المیوں پر اپنی سوچوں اور خیالات میں وہ معاشرے میں رائج نا انصافی، ہپو کریسی، توہمات اور ظالمانہ سلوک پر بے حد مشتعل ہو جاتا ہے۔ وہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ زندگی کے بارے۔ ریت، روایت، رواج اور عقیدے کے خلاف دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ مذہب اُسکے نزدیک بے سروپا حکایتوں کا مرقع ہے جو پرانے لوگوں نے ایجاد کیں۔ بے وقعت اور بے مایہ۔

پیغمبروں کی باتیں سب فضول۔ انسان تو مزے میں تھا۔ مذہب کے شوشوں نے سارے فساد کھڑے کئے۔ ہر مذہب پر اُس نے تنقید کی۔ راہب، پادری اور مولوی آنکھیں بند کر کے اندھے اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں۔ سوچ نہیں۔ زمین کے باسی دو طرح کے ہیں۔ ایک جو دماغ رکھتے ہیں مگر مذہب نہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب رکھتے ہیں مگر دماغ نہیں۔

''بھئی یہ تو سولہ آنے سچ بات ہے۔'' دونوں خواتین پھر بول اٹھیں۔

علامہ اقبال نے بھی تو یہی کہا ہے۔ دین ملا فی سبیل اللہ فساد۔ بھلا ہم سے زیادہ اِس اندھے تعصب کا شکار اور کون ہوگا؟

ڈرائیور آ چکا تھا۔ سلمان سکور نے گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

یہ حقیقت ہے کہ مفکرین جیسا کہ ابن سینا، ابن رُشد اور المعریٰ جیسے جتنے یورپ میں ہر

دل عزیز ہوئے اتنے اسلامی دنیا میں نہ ہو سکے۔ یورپ کی عیسائی دنیا نے اُن کی فلاسفی اور نظریات کو زیادہ کھلے طریقے سے اپنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم میں ایک بڑا کردار مسلم مفکرین کا بھی ہے۔

☆☆☆

باب نمبر20:

ابوالعلی المعریٰ کی قربت میں

- ہر خطہ زمین پر وقت قبریں تیار کرتا ہے مگر کوئی وقت کی قبر نہیں بنا سکا۔
- ایک ماضی ایک مستقبل ہم اِن دو پیکروں کی آغوش میں ہیں۔
- گفتگو کی تلوار سے زخمی کرنے والے کا وار صبر سے کاٹو۔

رُخصت ہونے سے قبل سب نے اُس کا لمبا چوڑا شکریہ ادا کیا کہ کس خوبصورتی سے اُس نے اپنے دیس کے ایک شاعر بارے ہمیں معلومات دیں۔ بیچ بیچ میں ایک اجنبی زبان میں ہماری بکواس کو بھی نظر انداز کیا۔ چلتے ہوئے اُس کی منتخب شاعری کا تحفہ بھی دیا۔ یہ اُس کی اپنے پیشے کے ساتھ محبت اور وفاداری کا بین ثبوت تھا۔

اِس ضمن میں مَیں نے اپنے ملک کی ایک بڑی لائبریری کی منتظمہ اعلیٰ کا قصہ بھی اُسے سنایا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ جسے سن کر وہ خوب ہنسا۔ مزے کا یہ واقعہ آپ بھی سن لیجیے۔

پاکستان کی ایک مشہور لکھنے والی رشیدہ رضویہ کے ایک ناول کی مجھے تلاش تھی۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری کی سینئر لائبریرین کے پاس جا کر ناول بارے پوچھا۔ کرسی پر بیٹھنے سے قبل میں نے اُس کی بڑی سی بے ترتیب میز کو دیکھا۔ جس پر اتوار کا ڈان اور Books & Authors کا چار صفحاتی میگزین پڑا تھا۔ جس کے آخری صفحے پر اُس وقت میری کوئی اٹھارہ کتابوں پر مشتمل اشتہار تھا۔ دل میں تھوڑی سی خوشی نے لپکا مارا کہ یقیناً فاضل لائبریرین غائبانہ طور پر ضرور متعارف ہوں گی۔ کیونکہ ڈان میں اکثر میری کتابوں کا اشتہار چھپتا رہتا ہے۔ سوچا کہ جاننے پر خوشی، محبت وعقیدت کا اظہار ہوگا۔ یقیناً

کہیں گی۔

''ارے تو آپ ہیں سلمیٰ اعوان۔بھئی بڑی فین ہوں میں آپ کی۔''

کچھ ایسے یا اس سے ملتے جلتے محبت بھرے جملے سننے کو ملیں گے۔ایسی ہی خوش فہمیوں کے خمار میں ڈوبی یہ دیکھ ہی نہ پائی کہ خیر سے محترمہ بڑے لئے دیئے سے انداز میں دیکھتی ہیں۔اِس اتنے لاتعلقی جیسے طور طریقے نے ذرا سا پریشان کیا۔تاہم جی کڑا کر مدعا گوش گزار کیا۔محترمہ کتاب کی سخت ضرورت ہے۔پنجاب پبلک لائبریری،قائداعظم پبلک لائبریری اور جم خانہ لائبریری سبھوں کو چھان مارا۔کہیں سے خیرات نہیں ملی۔آخری امید میں یہاں چلی آئی ہوں۔

عاجزانہ سی درخواست نے تھوڑی سی برف پگھلائی۔کتاب لانے کا حکم دیا۔دیر بعد پتہ چلا کہ کسی اسلم نامی بندے نے ایشو کروائی تھی۔واپس نہیں ہوئی۔چلئے قصہ ختم۔اتنی خجل خواری کے بعد جو میری قسمت۔صبر شکر۔

تاہم اُٹھنے سے قبل میں نے سوچا جس کام کے لئے آئی تھی وہ تو ہوا نہیں۔چلو اب سب سے آ ہی گئی ہوں تو کچھ اپنی اوقات کا بھی علم ہو جائے۔

دیکھوں تو سہی۔کہیں کسی خانے میں میں پڑی بھی ہوں یا یونہی فضول لکھ لکھ مارے کاغذوں کے پلندے والی بات ہے۔ذرا مسکینی سے کہا۔

''تکلیف کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔سلمیٰ اعوان کی کوئی کتاب ہے؟''

کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ شاید ایک یا دو ہیں۔بیس کتابوں کی مصنفہ کا سارا جوش وخروش موت کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔اُس موٹو لائبریرین کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے عدم توجہگی تو عیاں ہی تھی کہ اس نے نظر بھر کر بھی یقیناً کتابوں کے اشتہاروں کو نہیں دیکھا ہوگا۔

چلو اُس یارِ غار کا بھی جائزہ لے لوں کہ وہ کس سنگھاسن پر بیٹھی ہے۔

''نیلم احمد بشیر کی کوئی کتاب ہے؟''

اُس کی بھی شاید دو تھیں۔پتہ چلا۔

دفعتاً اُس نے پوچھا۔ ''یہ نیلم احمد بشیر بشریٰ انصاری کی بہن ہے کیا؟''

ہاں وہ تا کے کی آئے گی بارات فیم سنبل بھی شاید اُن کی بہن ہے۔ جونیئر نے لقمہ دیا۔

میں نے کہا۔ ''جی آپ درست فرماتی ہیں۔ وہ اِن دونوں کی بڑی بہن ہے۔ اور یہ احمد بشیر کی بیٹیاں ہیں۔''

لیجیے اب سنبل مرکز گفتگو بن گئی۔ اس کے مزاحیہ جملے۔ اس کی مزاحیہ اداکاری اس پر قہقہے اور باتیں۔

نہ کہیں میں تھی اور نہ نیلم احمد بشیر جنہوں نے لکھ لکھ کر مارے کاغذ۔ گھر آ کر میں نے اُسے فون کیا اور اس کی اور اپنی اوقات کی کہانی سنائی۔

فاطمہ اور میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی چھ سات صفحے کا بروشر ٹائپ بک لٹ جس میں شاعر کا کچھ چیدہ چیدہ کلام انگریزی میں ترجمہ شدہ تھا کھول لیا۔ علی کا خیال تھا کہ بشار چونکہ علوی فرقے سے تعلق رکھتا ہے، مذہب کے معاملے میں لبرل ہے۔ اِسی لئے ایسے شاعروں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

اِس رائے پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے فاطمہ نے با آواز بلند پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

میں ہر دن کو وداع کرتے ہوئے خدا حافظ کہتا ہوں
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ یہ کبھی واپس نہ آئے گا
پیچیدہ راستے جن پر سادہ لوح چہل قدمی کرتے ہیں
اور اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں
میرے لئے یہ ایسے ہیں
جیسے میں کسی عمر رسیدہ اور تھکے ہوئے درندے پر سواری کروں

....

ہمارے سامنے ایک اور نظم تھی۔ نسرین نے کہا۔ ذرا یہ سنیے۔

جب شاخ پر لپٹی ہوی چھپکلی

سورج کی حدت میں آرام محسوس کرتی ہے

جب دوست اور دشمن سوتے ہیں

موت رات پر حاوی ہوتی ہے

تقدیر منصوبہ سازی میں مصروف ہے

اور ہم اپنے آپ میں مگن ہیں

''واہ کیا خیال آفرینی ہے۔'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

''لیں اور سنیں۔'' میں اُس وقت کوئی اور نظم دیکھ رہی تھی جب فاطمہ نے متوجہ کیا۔

''سلمٰی آپا سُنیے سُنیے''

''عنوان بولو۔ میں اپنا صفحہ کھولتی ہوں پھر پڑھنا۔''

صدیوں سے سورج کے پھیلے ہوئے جال نے

نہ کبھی اپنے موتیوں کو بکھیرا

اور نہ ہی اُنہیں کسی دھاگے میں پرویا

یہ خوفناک سی دنیا ہمیں خوش کردیتی ہے

ہم سب کو جن کو وہ پالتی ہے

اپنے فانی کپ سے

دو خرابیوں میں سے ایک چن لو

جو تمہیں زیادہ پسند ہے

یا گل سڑ جاؤ

یا اذیتوں میں زندگی گزارو

کیا گہرائی ہے؟ اندر نے بے اختیار کہا تھا۔ نظریں اشعار کو ایک بار پھر دیکھ رہی تھیں۔ کاغذ

سے نیچے اُترے اُترتے ایک اور نظم نے متوجہ کیا۔ ''فاطمہ ذرا سنو۔''

شیشے کی طرح پاش پاش ہونا

ہم ہنستے ہیں
لیکن ہماری ہنسی کیسی احمقانہ سی ہے
ہمیں رونا چاہیے اور گہرے درد سے رونا چاہیے
ہم جو کانچ کے گلاس کی طرح پاش پاش ہو جاتے ہیں
اُس کے بعد کبھی دوبارہ بن نہیں پاتے

نسرین نے اُس پر سخت اعتراض کیا۔

''یہ کیا؟ زندگی اگر توڑتی ہے تو جوڑتی بھی ہے۔ اور ہنسیں کیوں نہ؟ دسویں صدی کے شاعر کے زمانے میں تب شاید طب نے یہ نہ کہا ہو کہ صحت کے لئے کھلی ڈلی ہنسی بہت ضروری ہے؟ مگر آج کا طبیب ہنسی کو غم کا علاج کہتا ہے۔ وہ تو رونا بھی آنکھوں کے لئے اچھا سمجھتا ہے۔''

ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فاطمہ بولی۔

''لو شاعر کی پہلی بات تو یہیں سچی ثابت ہوگئی۔''

ہم ہنستے ہیں
لیکن ہماری ہنسی کیسی احمقانہ سی ہے
دنیا میں میرا کام تھکا دینے جیسا ہے
کتنا عرصہ میں لوگوں سے جڑا رہوں گا
جن کے لیڈر حکم جاری کرتے ہیں
تمہارے لئے کیا اچھا نہیں ہے
وہ اپنے فرض کی نفی کرتے ہیں
خود کو مستثنیٰ کرتے ہیں

خود کو دھوکہ دیتے ہیں
اپنے مقاصد کو نظر انداز کرتے ہیں
''ارے ارے دیکھو ایک اور خوبصورت نظم۔''
فاطمہ نے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔
دنیا میں بہترین پرسکون لمحہ وہی ہے جو گزر گیا
کسی دوست کو سنتے ہوئے
جو بہت اچھی باتیں کرتا ہے
زندگی اول سے آخر تک کتنی حیرت انگیز ہے
مگر زمانوں سے، صدیوں سے
وقت ہمیشہ جوانی کے گویا دانتوں میں رہتا ہے
اس کے نوکیلے وار
قوموں کو ان کے عروج میں کاٹ پھینکتے ہیں
ہر خطہ زمین پر وقت قبریں تیار کرتا ہے
مگر کوئی وقت کی قبر نہیں بنا سکا

''واہ بھئی واہ۔ کیا بات ہے؟ چلو شکر ایک قنوطی اور یاس زدہ شاعر نے اچھے دوست کی اہمیت کو تو سمجھا۔ اور واقعی وقت کتنا ظالم ہے۔ اس کی کیسی خوبصورت تشریح ہوئی ہے۔''

میں نے ورق پلٹا۔ پانچ صفحے پر ایک نظم نے توجہ کھینچی۔ دانائی وحکمت کے موتیوں سے بھری ہوئی۔

جب بھی آدمی زیادہ بولنے سے احتراز کرتا ہے
اس کے دشمن کم ہوتے ہیں
بے شک قسمت اس پر زیادہ مہربان نہ ہو

اور وہ and falls low

خاموشی سے،ہی پُسو انسان کے خون سے اپنا منہ بھرتا ہے

اپنے گناہ کی شدت کو کم کرتے ہوئے

یہ مچھر کے طریقہ پر نہیں چلتے

جو بلند آواز میں بگل بجاتے ہوئے گزرتے ہیں

....

اگر ایک منہ پھٹ آدمی

گفتگو کی تلوار سے تمہیں زخمی کر دے

صبر سے اُس کے وار کو کاٹو

تاکہ تم اُس......................

....

ایک ٹاؤن میں رہنے سے مجھے کون بچائے گا؟

جہاں میرے بارے موزوں بات نہیں کی جاتی

امیر، پرہیزگار، صاحب علم یہ میری صفات ہیں

لیکن میرے اور اُن کے درمیان

بہت سی رکاوٹیں ہیں

مجھے اعتراف ہے

جہالت کو ابھی بھی نعمت خیال کیا گیا ہے

تاہم ہمارے لئے یہ حیرت انگیز بات نہیں

سچ تو یہ ہے،ہم سب صفر کی طرح ہیں

نہ میں معزز و محترم نہ ہی وہ کم مایہ و کم تر

میرا وجود زندگی کی مشکلات میں گھرا
کم کم ہی اس دباؤ کو برداشت کرتا ہے
میں اِسے گلنے سڑنے کی گرفت سے کیسے بچا سکتا ہوں
اوہو یہ موت کا کتنا بڑا انعام
جیسے درد کے بعد آرام
جو ہمیں ملتا ہے
جیسے شور کے بعد خاموشی

....

دلیل نے مجھے بہت سی باتوں سے روکا
جن کی طرف میری فطرت مائل تھی
اور یہ تو مستقل ایک عذاب ہے
اگر میں سچائی کو ماننے سے انکار کروں

....

انسان کے پاس کیا اختیار؟

اگر لوگ میری پیروی کرتے
تو میں اُن کی سچائی کی طرف رہنمائی کرتا
یا ایسے راستے کی طرف جس سے وہ سچائی پا سکتے
میں اس کے لئے زندہ رہتا یہاں تک کہ
وقت مجھ سے تھک جاتا اور میں
وقت سے
اور میرا دل بھی زندگی کی رعنائیوں سے

فاطمہ نے ایک بار پھر شور مچا دیا۔ ''دیکھو دیکھو سنو سنو۔ نظم کا عنوان ہے۔''

لوگوں کے خادم

اگر ہم چاہیں کہ چیزیں درست انداز میں ہوں
تو یقیناً اِس راز کو افشا کرنا پڑے گا
عوام کا لیڈر خادم ہوتا ہے
اُن کا جن پر وہ حکومت کرتا ہے

نسرین نے قہقہہ لگایا۔

''لو بھئی ہمارا خادم اعلیٰ تو کہے گا۔ دیکھ لو پھر میرا وژن۔ جو بات صدیوں پہلے مفکروں، فلاسفروں کے دماغ میں آئیں وہ میں نے پڑھے بغیر جان لی تھیں۔''

اِس پڑھے بغیر پر علی بھی کھل کر ہنسا تھا۔ مگر فاطمہ نے فوراً ایک اور نظم کی طرف نشان دہی کی۔

''بھئی اِسے دیکھو۔ اگر کہو گی تو خدا کی قسم میں دونوں بھائیوں کو فریم کروا کے بھیج دوں گی۔''

صدیوں، زمانوں پہلے کے تمہارے اپنے راستے
تم بادشاہ ہو،
جابر و ظالم حکمرانو!
تم ہر ہر لمحے ظلم اور ناانصافیوں کے لئے کام کرتے ہو
تمہیں آخر کیا چیز روکتی ہے؟
روشن راستوں پر اپنے نقش بنانے سے
ایک مرد کو کھیت کی ضرورت ہے
بے شک اُسے حُجلہ سے بھی پیار ہے

....

لیکن کچھ لوگ پیغمبرانہ لب و لہجہ رکھنے والے

آسمانی رہنما کی اُمید میں ہیں
جوانسانی ہجوم کے درمیان سے اُٹھے گا
ایک اعلیٰ سوچ جو رہبری نہیں کرتی
لیکن صرف دلیل جو روشن اور تاریک راستوں کی راہنما ہے

علی خاموشی سے اپنے مطالعے میں گم تھا۔ دفعتاً اُس نے ہم سب کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''ذرا یہ سنیں۔'' یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں تھیں مگر فکر و خیال سے بھری ہوئی۔

تم نے کہا
ایک عقل مند نے ہمیں تخلیق کیا
یہ سچ بھی ہو سکتا ہے
ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں
وقت اور خلا سے باہر۔
تم اعتراف کرتے ہو
تو پھر فوراً ہی کیوں نہیں کہہ دیتے
کہ تم اِس بڑے راز کو
دانشوروں کے سامنے رکھو گے
جو ہمیں ہماری کوتاہ عقلی کے بارے بتائے گا

....

وہ سب غلط ہیں
کیا مسلم، کیا یہودی
عیسائی اور مجوسی
انسانیت بھی وسیع و عریض دنیاؤں کو

دوگروہوں میں بانٹتی ہے
ذہین آدمی بغیر مذہب کے
مذہبی آدمی بغیر ذہانت کے

....

او بےوقوفو! او احمقو! جن رسومات کو تم مقدس سمجھتے ہو
وہ اُن قدیم لوگوں کا فریبوں سے بنا جال ہے
جن کو دولت کی ہوس وتمنا تھی
اور انہوں نے اپنی مراد پائی
لیکن وہ گمنامی میں مرے
اور اُن کے قانون بھی مٹی میں ملے

....

کتنے مہینے، کتنے سال بےشک میں باہر رہا
لیکن ابھی تک
میں خود کو احمق اور بھانڈ ہی سمجھتا ہوں
اور جھوٹ ایک تنہا ستارے کی طرح
ڈھٹائی سے کھڑا ہے
لیکن سچ ابھی تک اپنا چہرہ
نقاب میں چھپائے ہے
کیا ہے کوئی جہاز اور ساحل
میرے پھیلے ہاتھوں کو سنبھالنے کے لئے
اور

مجھے اِس ظالم سمندر سے بچانے کے لئے

....

بہانے مت بناؤ
نہ عذر پیش کرو
جب تم کوئی شرمناک کام کرو
کہ میرے آباؤاجداد نے بھی یہ کیا تھا
دو قسم کے مقدّر ہمارے ساتھ جڑے ہوئے ہیں
ایک مستقبل اور ایک ماضی
دو پیکر ہمیں آغوش کئے ہوئے ہیں
چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں
وقت اور فضائے بسیط
اور جب ہم سوال کرتے ہیں
کیسا انجام
جو ہمارے خالق نے چاہا ہمارے لئے
ایک جوابی آواز سنائی دیتی ہے
جو کسی بھی تسلی بھرے لفظ سے خالی ہے

....

مجھے چند اور نظموں نے بہت متاثر کیا۔

سالوں، زمانوں اور صدیوں سے
سال ہا سال، زمانہ ہا زمانہ
تاریکی بھاگتی ہے

جب روشن سورج کی ایک بھی صبح
پیامبر نہیں ہوتی
وقت گزرتا اور بدلتا رہتا ہے
دنیا لرزے بغیر قائم ہے
اپنی مغربی اور مشرقی زمینوں کے ساتھ
قلم رواں ہوا
حکم کی تعمیل ہوئی
سیاہی چرمی کاغذ پر خشک ہوئی
جیسا کہ مقدر نے چاہا
کیا بادشاہ اور اُس کے امراء وزراء
کیا سیزر اور اُس کے حالی موالی
قبر سے بچ پائے؟

....

کہا جاتا ہے روحیں آواگون کے تحت حرکت کرتی ہیں
ایک جسم سے دوسرے جسم تک
حتیٰ کہ یہ پاک ہو جاتی ہیں
لیکن کبھی یقین نہ کرو اس پر
یہ وہ غلطی ہے جو اسے ماننے پر اصرار کرتی ہے
یہاں تک کہ تمہارا دماغ اس کی سچائی پر ایمان لے آئے
گو کہ ان کے سر بام کی طرح اونچے ہیں

لیکن جسم جڑی بوٹیوں کی طرح ہیں
جو اُگتی اور مرجھا جاتی ہیں
اپنی روح کی خواہشات کو کم کرو
اور سکون سے رہو

....

انسان کے پاس تنہائی کے سوا کیا ہے؟
جب قدرت بھی اُس کی خواہشات پوری کرنے سے منکر ہے
امن اور جنگ جو انسان چاہے
وقت اپنے غیر منصفانہ ہاتھ سے
جنگجوؤں اور امن پسندوں کو دیتا ہے

....

آؤ چلیں اُن کے پاس
جنہیں قدرت نے توانا دماغ دیئے
اور جنہوں نے ہمیں حوصلہ مندی کا سبق دیا
مقدر سے ملاقات جو ہمارے تعاقب میں ہے
کہ آخر کار شاید ہم مر جائیں
زندگی کا جرعہ میرے نزدیک
جسے باہر نکالنا بے حد تلخ
اور دیکھو سچ کی یہ کڑواہٹ
کہ ہم اِسے دوبارہ باہر نکال پھینکتے ہیں

☆☆☆

باب نمبر **21**:

حما اور حمص

- دریائے اور نتس **orntes** پر بازنطینی دور کے بڑے بڑے آبپاشی کے چرخے **norias** سیاحوں کی دلچسپی کا بڑا خوبصورت سامان ہیں۔
- عظیم فاتح خالد بن ولید کا خوبصورت اور عالیشان مزار کلمہ گوؤں کے ہاتھوں لٹ پٹ گیا ہے۔
- چمکتا دمکتا حمص شہر کرسی بچانے اور کرسی چھیننے والوں کے درمیان کھنڈر بن گیا ہے۔

سچی بات ہے میرا دل عمر بن عبدالعزیز کے مزار اقدس پر حاضری کا بے حد متمنی تھا۔ مگر پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی خواہش کو سینے میں ہی دبا دیا تھا۔ بس دعائے خیر کی اور صبر و شکر کا کلمہ پڑھا کہ نصیب میں نہیں تھا کہ وہاں قدم دھرتی۔ چلو جو اللہ دکھا رہا ہے وہ اس کی عنایت۔

حما Hama میں رکنے نے لطف دیا۔ سفر ٹوٹا۔ واش روم میں منہ دھویا۔ تازہ دم ہوئے۔ کولڈ ڈرنک اور قہوہ پیا اور دنیا کے قدیم ترین نظام آبپاشی کے حیرت انگیز مظاہر دیکھے۔ دریائے اور نتس orntes پر بڑے بڑے چرخے جنہیں norias کہتے ہیں نصب تھے۔ محرابی صورت دیواروں کے ساتھ انہیں منسلک کر کے دیو ہیکل norias کے ساتھ آبپاشی کی جاتی تھی۔ دنیا کا قدیم ترین ذریعہ آبپاشی جو کہیں بازنطینی دور کی یادگار تھا۔ آج کل یہ ذریعہ اب اتنا مستعمل نہیں رہا۔ تاہم دو ابھی بھی کام کر رہے ہیں۔ شاید سیاحوں کی دلچسپی کے لئے رکھے گئے ہوں۔ بہر حال پانی کی چادر کا بہتے دیکھنا اچھا لگا تھا۔

یہاں ساتھ ہی ایک بہت خوبصورت پارک بھی تھا۔ تھوڑی سی سیر ہم نے وہاں بھی کی۔ جھولوں پر ہجوم تھا۔ داخلے پر ٹکٹ۔ جھولوں پر ٹکٹ۔

چلو ٹکٹ پر خرچ کئے پیسے بھول گئے جب وہاں آنے والی ایک فیملی سے ملاقات ہوئی۔ مسکراتے چہرے والی خاتون اور مرد نے ہمیں دیکھتے ہی ایسی پذیرائی دی کہ جی باغ باغ ہو گیا۔ مزے کی بات خاتون فرانسیسی بولنے میں طاق تھی اور مرد انگریزی اچھی بولتا تھا۔ پتہ چلا کہ لڑکی کے والدین پیرس میں زمانوں سے رہتے تھے جبکہ لڑکے کی تعلیم دمشق اور لندن کی تھی۔ جوڑا بڑا گالڑی تھا۔ جونہی میں نے ہیلو ہائے اور دمشق حلب کی خوبصورتیوں کے قصوں سے ذرا رخ پھیر کر ایوانوں میں بیٹھنے والوں کی بات کی۔ مجھے لگا جیسے میں نے مرد کی دُکھتی رگ کو دبا دیا ہو۔ سرخ وسفید چہرے پر غصے کی لہروں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔ زبان زہر اُگلنے لگی تھی۔ پتہ چلا تھا کہ 1982ء میں حما میں جب مسلم بھائی چارے کی احتجاجی تحریک نے زور پکڑا تھا۔ حافظ الاسد نے کریک ڈاؤن کروایا تھا۔ جس میں کوئی بیس پچیس ہزار لوگ مارے گئے۔ ان میں لڑکے کا دادا اور چچا بھی تھا۔

بشار کی خباثت کے قصے باپ کی ذلالت کی داستانیں۔

اُف میرے خدا اِس تیسری دنیا کے المیے۔

اب پھر سفر شروع ہوا۔ پون گھنٹہ ہی لگا تھا کہ حمص پہنچ گئے۔ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔

تو یہ حمص Homs ہے۔ پرانے وقتوں کا ایماسا Emesa۔ صدیوں پرانی تاریخ کا وارث، بے شمار قوموں اور مذاہب کا شہر۔ 636ء میں یہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور تب سے آج تک یہ اسی حیثیت میں پہچانا جاتا ہے۔

ہمارے کھانے کا پروگرام یہاں کا تھا۔ علی گاڑی کو چکر پر چکر کٹوائے جاتا تھا۔ گو بھوک ستا رہی تھی۔ دونوں جز بز ہو رہی تھیں اور میں خوش کہ شہر کی بیٹھے بٹھائے سیر ہو رہی ہے۔ نئے نئے منظر نظروں کو لُبھاتے تھے۔ منظر بھی حسین تھے۔ ہاں البتہ ماحول میں صفائی ستھرائی کچھ قابل ذکر نہ تھی۔

کاغذ،شاپر اڑتے پھرتے تھے۔ مانگنے والے بھی بہتیرے تھے۔ پل بھر کے لئے کہیں گاڑی رُکتی تو ہمارے ہاں کی طرح شیشہ بجنے لگتا۔مشکل سے پلّہ چھڑاتے۔

شہربہت زیادہ تو نہیں پر خاصا سر سبز بھی تھا۔ پھر شہر کی مرکزی شاہراہ القوتلیQuwatly سٹریٹ دیکھنے کوملی۔ بہت لمبی نہ تھی۔مگر جتنی تھی خوبصورت اورموہ لینے والی۔جس کے دونوں سرے اولڈکلاک ٹاوراور نیوکلاک ٹاور کی حدوں میں قید تھے۔

نیوکلاک ٹاور یا اسے کلاک آف فریڈیم کہہ لیجیے۔یہ سکوائر کے عین بیچوں بیچ آن بان سے بلند وبالا عمارتوں، سرو کے پیڑوں، کجھوروں کے درختوں اور صاف ستھرے ماڈرن ماحول میں گول اونچے پیڈسٹل پرکھڑا شہر کا لینڈ مارک ہونے کا حق ادا کرتا تھا۔

''اُف ایک تو اِس بشارکواللہ سمجھے۔'' کوئی جگہ اس سےمحفوظ نہیں۔کوئی جگہ اِس کے باپ سے محفوظ نہیں۔ کندھوں، کوٹھوں، بینروں، چوراہوں، رستوں، کھمبوں اور عمارتوں کے ماتھوں پر چڑھے بیٹھے تھے۔کوفت ہونے لگی تھی باپ بیٹے کی صورتوں سے۔ مجھے تو اِن شامیوں پرغصہ آرہا تھا۔ کتنے بونگے ہیں۔پینتیس(35) اڑتیں(38) سال سے ایک ہی صورت دیکھے چلے جارہے ہیں۔اکتاتے نہیں دو دن ایک سا کھانا، کھانا پڑ جائے تو طبیعت اوبھ جاتی ہے۔ یہ عجیب ہیں۔ باپ سے رجے نہیں اب بیٹےکوسر کا تاج بنالیا ہے۔

یونیورسٹی کا پتہ چلا۔شوق سے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دیکھی۔ کچھ زیادہ دورنہیں بعث پارٹی کا دفترنظر آیا۔ہوٹل بڑے عالیشان اورکئی کئی منزلہ تھے۔

کھانے سےقبل حمص کی سرزمین پرسجدہ ہی ہوجائے جیسے اظہار پرڈرائیور نےتو فوراً تکمیل دینی ضروری جانی۔

شہدا چوک اولڈ کلاک ٹاورسب کچھ بتاتے ہوئےمسجد کی طرف بھی اشارہ کیا۔ال نوری مسجد۔اندرداخل ہوتے ہی جیسے بےاختیار زبان سے''سبحان اللہ'' نکلا تھا۔اس درجہ پروقار سادگی لئے میری اب تک کی زندگی میں کوئی مسجدنہیں گزری تھی۔محرابوں کوسہارنے والے چوکورستونوں کےصرف

نچلے حصّوں پر بلا کی خوبصورت نقاشی تھی۔

جب کسری نماز سے فارغ ہوکر باہر آئے۔علی نے فلافل اور کولڈ ڈرنک خرید لئے تھے۔ساتھ ہی حکم بھی صادر کر دیا تھا کہ گاڑی میں قطعی منہ ماری نہیں کرنی۔خالد بن ولید کے مزار مبارک پر سکون سے بیٹھ کر کھائیں گے۔

فاطمہ نے شور مچایا۔ ''جان نکلی جارہی ہے۔''

وہ بھی من موجی مرد تھا۔تڑاخ سے بولا۔

''تو بھئی نکل جانے دو۔اِس کمبخت کو رکھ کر کیا کرنا ہے؟''

خالد بن ولید کا مزار اور مسجد قریب ہی تھے۔بڑی سڑک صلاحیہ سٹریٹ پر۔مسجد کی دونوں اطراف خوبصورت باغیچوں، پھولوں سے بھری کیاریوں اور تراشیدہ گھاس سے سجی تھیں۔

بھوک کا واویلا بہت زیادہ تھا۔سب سے پہلے اس پکار پر توجہ کی۔فلافل مزے کے تھے۔مجھے مصر کے فلافل بہت یاد آئے۔کھانے اور خوش گپیاں کرتے ہوئے بھی اُس عظیم شخصیت کا طلسم دل و دماغ پر تیرتا پھرتا تھا۔

''میں حمص میں ہوں اس کے پاس جس کی شجاعت اور بہادری کی داستانوں نے سارا بچپن دیوانہ بنائے رکھا۔

مسجد کے احاطے میں سکول بھی ہے۔پتہ چلا تھا کہ یہاں دینی تعلیم پر جتنا زور ہے جدید تعلیم پر اُس سے زیادہ ہے۔اس لئے حمص کے بہترین مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔اندر جاتے وقت جذبات میں ہیجان سا تھا۔خدا کی شکرگزاری آنکھوں کو بھگوئے دے رہی تھی۔

صدر دروازے پر آویزاں دو تختیوں پر دو تحریروں کا تعلق پڑھنے سے تھا۔عربی اور انگریزی کی یہ تحریر کہ یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست شمشیرزن اور عظیم مسلمان فاتح جس نے کسی جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی آرام فرمارہے ہیں۔

دوسری تحریر مسجد کے بارے کہ اسے شام کے سلطان عبدالمجید دوم نے 1900ء میں بنائی اور

شام کے حافظ الاسد نے اس میں توسیع اور آرائش کی۔

سیاہ اور سفید پتھروں والا صحن نہ صرف وسیع وعریض تھا بلکہ جاذبِ نظر بھی تھا۔ مسجد کے برآمدے سے اندر داخل ہوتے ہی بڑے ہال کے دائیں جانب وہ عظیم شخصیت عالم استراحت میں ہے۔ نقرئی دروازہ سنہری جالیاں آرائشی ساز وسامان سبھی لوازمات دل ونظر کو لبھاتے تھے۔ فاتحہ پڑھنے اور دعا مانگنے تک آنسو ٹپکتے رہے۔

ساری کہانیاں جب مسلمان نہیں ہوئے تھے جنگ اُحد کا کردار۔ مسلمان ہو کر مرتدوں، منکرین زکوٰۃ، رومیوں اور خسروان کے خلاف کامیاب جنگی معرکے۔ سبھی کچھ تو یاد آرہا تھا اور آنکھیں بھگو رہا تھا۔ ہرمز کے ساتھ جنگ کی کہانی کی یاد نے خود سے کہا تھا۔

''خدایا ہمارا ماضی کبھی لوٹ کر بھی آئے گا۔''

نفل پڑھے۔ وقت رُخصت مسجد کے سفید گنبد اور خوبصورت میناروں کو دھوپ میں چمکتے دیکھ کر ان کے لئے، شہر کے لئے دعائے خیر کی۔

ڈرائیور نے قلعہ الحصن Kark Des Chevaliers کے بارے پوچھا کہ دیکھنا ہے اب کی دفعہ میں نے کہا۔

''چھوڑو بھئی دیکھ تو لیا ہے حلب کا۔ قلعے تو کم وبیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔''

''کم وبیش ایک جیسا تو سبھی کچھ ہی ہوتا ہے۔ کیا مسجدیں، کیا گرجے، کیا معبد۔ مگر پھر بھی ہم دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔''

ڈرائیور بھی بڑا جملہ باز لگا تھا۔ بڑی تیکھی بات کہہ گیا تھا۔

ہونٹ مسکرا دیئے تھے۔

میری مسکراہٹ نے جیسے اُسے شہہ دی تھی۔ اپنی علمیت بگھارنے کا غالباً اس کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ بول اٹھا تھا۔

''قرونِ وسطیٰ طرز تعمیر کا اہم ترین قلعہ بلکہ یہ کہنا کہ سب قلعوں کا قلعہ۔''

’’چلو بیبا تو پھر دکھا ہی دو۔‘‘

حلب کے قلعے کی طرح یہ بھی بلندی پر تھا۔اسی کی طرح کے دو دروازے۔مشرقی دروازے سے اندر جا کر میں نے تو مزید قدم اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔وہی سارے منظر جو ایک دن پہلے دیکھے تھے۔بلند و بالا دیواروں کے حصار سے باہر حدّ اُفق تک بکھرے منظروں کو ایک شکستہ سی کھوٹھڑی کی اوٹ سے دیکھتی رہی۔علی کی طنزیہ بات کو شربت پی کر حلق سے اندر اُتار لیا اور ٹس سے مَس نہ ہوئی۔

مختصر سی معلومات علی نے ہی دیں جب وہ واپس آیا۔میں نے سنی ضرور مگر قطعی توجہ نہ دی۔ وہی یہاں 200 نائٹس رہتے تھے۔بعد میں سننے میں آیا 300 تھے۔تو فرق کیا پڑا؟ 200 کھلے ڈلے رہتے تھے۔300 ذرا تنگی سے رہتے ہوں گے۔

باقی کتنی بار اجڑا کتنی بار بسا۔فلاں نے اس کا تخم مارا۔فلاں نے اِسے زندگی دی۔زلزلوں نے بھی مت ماردی۔صلاح الدین ایوبی نے بھی حملہ کیا۔مگر اس کی ہیبت اور طاقت سے ڈر گیا۔کچھ کہے بغیر لوٹ گیا۔ویسے لگتا تو نہیں تھا ایسا ڈرنے والا۔

ہاں ایک بات واقعی دل کو لگی کہ حملہ آوروں کو تو میلوں دور سے دیکھا جا سکتا تھا ہے کہ قلعے کی کرسی اتنی بلندی پر ہے۔فصیل کے دائروں میں کھڑے تیر انداز ہی تیروں سے حملہ آوروں کو ناک چنے کیا چبوانا سارا وجود ہی چھلنی کر سکتے تھے۔

دھوپ تیز تھی۔فلافل کا خمار چڑھ رہا تھا۔جی چاہتا تھا یہیں لَم لیٹ ہو جاؤں۔مگر کیسے؟

ہاں یہ ضرور تھا کہ ڈرائیور نے جیسے ریس لگا دی تھی۔سچی بات ہے تھکن بھی بڑی محسوس ہو رہی تھی۔مغرب سے ذرا پہلے دمشق پہنچ گئے۔

☆☆☆

باب نمبر 22:

جنگ کی تصویریں

اپنی میز پر پڑی ہدیٰ کی میل دیکھ کر میں بیتابانہ انداز میں اُس کی طرف بڑھتی ہوں۔ کرسی پر بیٹھنا جیسے گویا میں بھول ہی گئی ہوں۔ کاغذ میرے ہاتھ میں اور نگاہیں حروف پر سرپٹ بھاگتی تھیں۔

تمہاری ذہنی پٹاری میں عرب اور دنیائے اسلام کے اُس عظیم ہیرو خالد بن ولید کا روضہ مبارک، حمص شہر اور Homs کا وہ قلعہ بھی ضرور کہیں موجود ہوگا۔ مجھے حمص شہر کے لئے تمہارا شوق واشتیاق یاد ہے۔ تاہم شہر سے کہیں زیادہ اس شوق کے عقب میں پیغمبر اسلام کے ساتھی کے روضہ مبارک اور مسجد کے لئے جس تڑپ کا اظہار تھا وہ بھی پوری طرح عیاں تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے تمہاری آتش شوق کو تاریخ کے دو حوالوں سے مزید بھڑکایا تھا۔ پہلا عثمانی سلطان عبدالحمید اور شام کے گورنر حسین پاشا کی اُس صاحب سیف اللہ سے محبت وعقیدت کے اظہار سے جو انہوں نے مقبرے اور مسجد کو عرب طرز تعمیر کا رنگ دے کر اِسے باوقار اور عالیشان بنانے کے لئے کیں۔

دوسرا وہ تیمور لنگ ہے۔ پندرھویں صدی کا جیالا جس نے شام فتح کیا تو حمص پر حملے سے گریز کیا کہ اُس ہستی کا مدفن تھا یہاں۔ اس کے نام کی مسجد تھی یہاں۔ وہ یہاں خوابیدہ تھا۔ اس کی دلیری اور شجاعت سے اُسے پیار تھا۔

ہاں مگر میں کس قدر افسردہ ہوں۔ اکیسویں صدی کے اِن کلمہ گوؤں کی حرکتوں سے۔ جولائی کے بس ایسے ہی دن تھے جب تم شام میں تھیں۔ یعنی 2008ء اور یہ بھی جولائی کے ہی

دن ہیں۔ بس درمیان میں صرف تین سال کا فاصلہ حائل ہے۔ اسی خالد مسجد سے جنازے میں شرکت کے لئے نکلنے والے احتجاجیوں پر گولی چلی۔ دس بندے مارے گئے۔

پس آگ بھڑکی اور بھڑکتی ہی چلی گئی۔ کسی نے اس پر پانی یا ریت ڈالنے کی کوشش نہ کی۔ اُس خوبصورت یادگار کو جو اسلامی تاریخ کا عظیم ورثہ سمجھی جاتی ہے۔ حکومتی فوجیوں کی اندھا دھند شیلنگ نے اس کے محراب و منبر اس کے در و دیواروں کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا کیا بیان ہو کسی ایک کلمہ گو نے پل بھر کے لئے سوچا ہی نہیں کہ وہ اس تقدس بھری جگہ جہاں اذان گونجتی اور جہاں پانچ بار سجدہ ریزی ہوتی ہے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟

میں نے کاغذ پر دوڑتی پھرتی آنکھوں کو اِک ذرا اوپر اٹھایا ہے۔ آنکھوں میں نمی اُتر آئی ہے۔ پوروں سے اُسے صاف کیا ہے۔ منظر اپنی پوری تابانیوں سے جھلملا اٹھے ہیں۔ رقص کرنے لگے ہیں۔

جولائی کے روشن گرم دنوں میں ڈوبا زندگی کی رعنائیوں سے لدا پھندا حمص شہر اُبھر کر سامنے آ گیا ہے۔ وہ خوبصورت شہدا چوک، وہ خوبصورت گلیاں روشنیوں، خوشبوؤں، حُسن و فن کی دلآویزیوں کے نمونے سب گہنائے ہی نہیں گئے بلکہ ملبے کے ڈھیروں میں بدل گئے ہیں۔ جہاں گہما گہمی چہل پہل اور رونقوں کے ڈیرے تھے وہاں اب اُداسیاں اور ویرانیاں بال کھولے بسیرا کئے بیٹھی ہیں۔ اُن کی صورتیں سب اجڑی پجڑی، آگ کے شعلوں، دھوئیں کے غبار میں لپٹی، کہیں ٹوٹے جھکے کہیں کھڑے سریا سیمنٹ کے لوتھڑوں میں ڈوبی کیسے کیسے ہیبت بھرے ڈراؤنے منظر پیش کرتی ہیں؟ شہر تو پہلے ہی ستا پڑا تھا۔ بس ایک پکار کیا پڑی، آگ میں کود گیا۔ مخالف پارٹیوں کا گڑھ بن گیا۔

وقت کے ایسے کتنے ظالم ہیں۔

بشار نے اپنی کرسی کی لرزتی ٹانگوں کو طاقت دینے کے لئے بے حد محنت کی۔ اپنے ہی

لوگوں اور اپنے ہی بچوں کو خون میں نہلا دیا۔ اِن باغیوں، اِن مخالف جماعتوں نے اپنے اپنے مفادات کے لئے انسانیت کو تہہ تیغ کر دیا۔

باغیوں کا گڑھ ہے شہر۔ بھون دو سب کچھ۔ لوگ بھی اور تاریخ کے یہ عظیم ورثے بھی۔ اس کے محراب و منبر بھی۔ ڈھیر بنا دو۔ کوڑے کے ڈھیر۔ سردیوں کی خاموش ویرانیوں میں ڈوبا اور اجڑا پجڑا شہر جس کی دیواریں جس کے گھر جس کے بازار سب لٹے پٹے رگوں میں دوڑتے خون کو منجمد کرتے ہیں۔

ہدا لکھتی ہے۔ شہر میں تو بہت تھوڑے لوگ ہیں۔ قلعہ جائے پناہ بنا ہوا ہے۔ احتجاجیوں اور باغیوں کا۔ اُف یہ وہی قلعہ ہے پرانے وقتوں کے نوابوں کا۔ لارڈز کا۔ ہاں ہاں یہ وہی ہے جس کی ہیبت، جس کے جاہ وجلال کے سامنے اُس کی سانسیں رکی تھیں اُس کی جسے تاریخ لارنس آف عریبیا کا نام دیتی ہے۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ بے اختیار کہا تھا۔ شاید یہ دنیا کا سب سے محفوظ اور بہترین قلعہ ہے۔

یہ سینکڑوں سالوں سے نہیں صدیوں سے اِس شہر کی عظمت کا نشان بنا کھڑا ہے۔ سُنی جہادیوں جن میں یہ حزب اللہ، Jabhat-al-Nusra اور القاعدہ والوں نے اس کی یوں تباہی مچائی کہ اسے اپنے قبضے میں کیا اور پھر حکومتی فوج نے اِسے چھینا۔ اِس چھینا چھپٹی میں کیا کسی نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ اِس قلعے سمیت شام اپنے اِن تاریخ اثاثوں سے دنیا بھر میں کتنا معتبر ہے؟ اور یہ قلعہ تو چھٹے نمبر پر ہے؟

آپ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ دنیا میں اگر اِسے کسی بنا پر امتیاز حاصل ہے تو آپ کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے۔ اس کے لوگ اس کے شہری جو اپنے قصبہ، دیہات، شہروں سے پیار کرتے ہیں۔ جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر کڑھتے اور بلبلاتے ہیں۔ ایسا ہی حمص کے شہریوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ حمص کا ابو حارث بابا عمر کے کیمپ میں مجھے ملا تھا۔ اسی نے جو کچھ

مجھے سنایا وہ میری آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔سوچ کا یہ بھی انداز تھا۔جو میرے لئے بہر حال حیران کن تھا۔مگر جب وہی سب کچھ ٹوٹی پھوٹی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔در بدری مقدر بنتی ہے۔

تب دل درد کرتا ہے اور آنکھیں روتی ہیں۔

اور میں بھی رو رہی تھی زار زار۔

☆☆☆

باب نمبر 23:

حمص کا ابو حارث کیا سُناتا ہے

شام میں اقتصادی بحران نے اپنا منحوس سایہ حمص کے متوسط طبقے کے لوگوں پر ڈالا۔ جو کہ آسمان کو چھوتی قیمتوں، ٹیکسوں کی بلند شرح اور کم آمدنی کی صورت میں زندہ رہنے کے لیئے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ نوجوان جب تک 30 سال کے نہ ہو جاتے وہ شادی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے خاندان کا آغاز نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بھی بڑی کربناک بات تھی کہ ملازمتیں دینے میں امتیازی سلوک نے مقامی لوگوں میں اسد حکومت کے خلاف غصے میں اضافہ کر دیا تھا۔ایک مخصوص مسلکی لوگوں نے سرکاری ملازمتوں پر غلبہ ہی حاصل نہ کیا تھا۔ دوسری مسلکی اکثریت کو نظر انداز کر کے مراعات اور فائدے بھی حاصل کرنا شروع کر دیئے تھے۔ عام لوگوں نے نے خود کو غلاموں کی طرح محسوس کیا۔ یہ صورت ایک طویل عرصے سے جاری تھی۔

ہمارے گھر والوں میں شامی فرقہ پرست حکومت کے خلاف نفرت میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جب میں بچہ تھا تو میرے والد نے حکومت کے خلاف لعن طعن کرنا سکھا دیا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ جب وہ لوگوں میں اپنی حکومت مخالف آواز بلند کر پائے۔

تو آخر وہ وقت آ گیا جب مظاہرین اپریل 2011 میں حمص کے مرکز میں اکٹھے ہوتے ہیں یہ وہ دن تھے جب شام کے شہری اُن ڈگمگاتی ہوئی عرب ظالم حکومتوں کو دیکھ کر خوش

ہورہے تھے جو کہ تیونس ،لیبیا،مصر اور یمن میں انقلابی تحریکوں کے پھیلنے کے بعد ڈگمگا رہی تھیں ۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ یہ انقلابی بخار شام تک بھی ایک نہ ایک دن پہنچ جانا تھا۔لیکن ہمیں یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ درعا کے بچوں نے شہر کی دیواروں پر اشتعال انگیز تحریریں لکھ کر بغاوت کی آگ کو اتنی جلدی ہوا دے دی ہے۔

''ڈاکٹر بشراب تمہاری باری ہے۔'' حکومتی سخت کاروائی جو درعا کے لوگوں پر کی گئی تھی وہ ہمیں اپریل 2011 کو (حمص) کی گلیوں میں لے آئی تھی ۔ جو کہ شامی انقلاب کا نقطہ آغاز تھا۔

تاریخی مسجد خالد ابن الولید وہ بنیادی جگہ تھی جہاں شامی حکومت کے خلاف نافرمانی کی پہلی لہر نے مارچ شروع کیا۔اِس احتجاج میں تقریباً 1300 آدمی تھے، کچھ حکومت کو گرانے کے نعرے لگا رہے تھے۔حکومت کی بدعنوانیوں کو گنوا رہے تھے۔سیکورٹی فورسز پر پتھراؤ کر رہے تھے۔

سیکورٹی فورسز نے احتجاج کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لیئے آنسو گیس اور پانی کا استعمال کیا اور کچھ لوگوں کو گرفتار کرلیا۔تین ہفتوں کے بعد حکومتی برداشت ختم ہونا شروع ہوئی اور اس نے براہِ راست اسلحہ استعمال کرنا شروع کر دیا جس نے پرامن احتجاج کو مسلح انقلاب میں بدل دیا۔

میں ان احتجاجیوں میں سے ایک تھا جو گرفتار کرلیا گیا کئی ساتھیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔بعض کو مار دیا گیا۔حمص میں سیکورٹی برانچ میں حراست کے دوران مجھے بجلی کے جھٹکے لگا کر اذیت دی گئی اور مارا پیٹا گیا۔جب عام معافی کا اعلان ہوا۔تب مجھے چھوڑا گیا۔اس کا بڑا مقصد لوگوں کے غصّے کو کم کرنا تھا۔قید کے دوران میں نے ایک چھوٹے جہادی گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔وہ اچھی طرح تربیت یافتہ تھے اور ہتھیاروں کی تجارت کرتے تھے۔میں نے ان پر تشدد واقعات کی اپنے موبائل میں فلم بھی بنائی اور اسے یوٹیوب پر چلانے کے لیئے اپنے ان

دوستوں کو بھیج دی جو باہر مما لک میں رہتے تھے۔

گلف ریاستوں سے مخیّر حضرات کے فنڈ سے میں نے ایک میڈیا گروپ تشکیل دیا اس میں کوئی اکیس 21 مسلح آدمی تھے۔ہم حکومتی جرائم کو فلماتے تھے۔

عطیات کی صورت ہمیں انسانی مدد کی شکل میں بھیجی گئی تھیں جنہیں ہم نے میڈیا کے ساز وسامان اور ہتھیار خریدنے کے لیئے بیچ دیا۔میں نے کئی معرکوں میں حصّہ لیا جب تک کہ (باباعمر) جو کہ (حمص) کا ایک ضلع ہے۔اُسے حکومتی فوج نے محاصرے میں نہ لے لیا۔تب بہت سے مقامی لوگوں کو فرار ہونا پڑا۔

میں نے سلافی حزب الطاہر میں شمولیت اختیار کر لی جو کہ ایک اسلامی ریاست کے لیئے آواز بلند کر رہی تھی۔ان کے ساتھ میں نے بہت سی جنگی مہارتیں سیکھیں۔لیکن میں (جباہتہ النصرہ) کے عروج کو بڑی تحسین کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ان کے شہادت کے کارناموں سے مکمل طور پر متاثر تھا۔اب ہماری لڑائی عالمی برادری سے،امریکہ اور صلیبی جنگجوؤں سے ہے۔

محاصرہ دو سال تک جاری رہا اور یہ ہمارے لیئے بڑی سخت آزمائش تھی، اور ہمیں کیڑے مکوڑوں، گائے کی چمڑی اور پتے کھانے پر مجبور ہونا پڑا۔میں نے مارچ 2014 میں آئی ایس آئی ایس (داعش) سنی مجاہدین کی تحریک سے وفاداری کا عہد لیا۔میں نے ایک ماہ کا شریعتہ کورس مکمل کیا جس میں قرآن سیکھنے کے لیئے فی دن پانچ اسباق شامل تھے۔اسلام کی شرائط، آئس کا نظم وضبط اور اسلامی شریعت بھی اس کورس میں شامل تھے۔پھر موصل اور رراقہ آزاد کرالیئے گئے ہم اصل اسلامی ریاست بن گئے۔

میری زندگی مکمل طور پر تب سے تبدیل ہوئی ہے جب سے میں نے آئس ISIS (داعش) میں شمولیت اختیار کی۔میں ایک جاہل آدمی تھا جو کئی لڑکیوں سے دوستی رکھتا تھا لیکن اس کے بعد نہیں جب میں نے جان لیا کہ اصل اسلام نہیں کہ کسی لڑکی سے شادی کیئے

بغیر اس سے محبت کی جائے۔ مجھے فٹ بال کھیلنے کی بجائے شریعت سیکھنی تھی اور بے دین لوگوں سے لڑنا سیکھنا تھا۔ گانوں کی بھی اجازت نہیں۔اب میری زندگی کا ایک مقصد ہے اور ایک ریاست ہے جس کا مجھے دفاع کرنا ہے۔

چند دنوں میں تیونس کی ایک جہادی ڈاکٹر سے شادی کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی مدد کی اور بہت سے لوگوں کی برطانیہ، فن لینڈ اور پاکستان سے یہاں آنے میں آئسISIS (داعش) جہادیوں کو خوراک، رہائش اور خرچنے کے لئیے پیسہ دیتی ہے۔ اگر ایک جہادی شادی کرنا چاہتا ہے تو آئسISIS (داعش) اُسے پیسہ دیتی ہے اور اس کے گھر کا کرایہ ادا کرتی ہے۔

شامی حکومت کمزور ہے۔ اس کے پاس ٹینک اور طیارے ہیں لیکن لڑنے والے ناکافی۔ ہماری جنگ اب عالمی برادری ،امریکہ اور صلیبی جنگجوؤں سے ہے۔ہم جانتے ہیں کہ امریکہ نہیں چاہتا کہ اسد جائے ورنہ اس کو پہلے ہی ہفتے ہٹا دیا گیا ہوتا۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ شام کے لوگ کہیں: ''ہم بس ہوگئے ہیں۔حکومت نے ہمیں شکست دے دی ہے۔ براہِ مہربانی آئیں اور ہماری مدد کریں۔'' وہ کہیں گے کہ حل مذاکرات اور مخلوط حکومت ہیں جس سے تمام شہیدوں کو خون رائیگاں جائے گا۔

میں اب الفرقان میڈیا سنٹر کے لئیے کام کرتا ہوں ہم نے اُردن کے ہواباز کے قتل کے لئیے رائے شماری کرائی۔شام میں بہت سے لوگ اس بات سے متفق تھے۔شام کے لوگ جانتے ہیں کہ یہ صلیبی جنگ، یہ بے دین اور بدخواہ اتحاد مسلمانوں کے خلاف ہے۔آئس ISIS (داعش) کے نہیں۔

☆☆☆

باب نمبر 24:

مروہ ال ثوبانی

اُس گرم سہ پہر جب ہماری ٹیکسی پرانے حمص شہر کے مرکزی سکوائر کے چکر پر چکر کاٹ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ میری ساتھی خواتین کی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔ تب کہیں یہ میرے گمان کے کسی کونے کھدرے میں بھی نہ ہوگا کہ یہیں کہیں نزدیک ہی ان ہی بلند و پست عمارتوں اور انہی ملحقہ گلی کوچوں کے سلسلوں میں سے کسی ایک میں شام کی وہ مایہ ناز مروہ ال ثوبانی اپنے دو بچوں اور شوہر کے ساتھ ایک پرانے گھر کے ایک کمرے میں گولہ بارود کی بارش کو برستے دیکھ کر بھی اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں اِس قیامت کے ماہ و سال میں عزم حوصلے کی ایک نئی قندیل روشن کرے گی۔ ہر بمباری پر شام کے گھر کیسے ہونے چاہئیں پر غور و فکر کرتے ہوئے کتاب لکھے گی جسے دنیا کے ماہر تعمیرات دانتوں میں انگلی دبا کر پڑھیں گے اور سوچیں گے کہ آخر انہوں نے اِن پہلوؤں پر کبھی غور کیوں نہیں کیا۔

شام میں ایک کہاوت رائج ہے کہ وہ جس کے پاس کچھ پرانا نہیں اس کے پاس نیا بھی نہیں۔ خانہ جنگی کے تاریک دنوں سے پہلے یہ کہاوت بڑے شد و مدّ سے نوجوان اور ماڈرن لوگوں کو طنزیہ سنائی جاتی تھی کہ جنہیں ماضی کی چیزوں سے کوئی لگاؤ دلچسپی اور وابستگی نہیں تھی۔ شہر کی چھوٹی چھوٹی گلیاں ساتھ ساتھ جڑے مکان اور ہجوم سے بھرے بازار۔ بس اسی کائنات کے گرد زندگی گھومتی ہے۔

لیکن 2011ء میں جب مصائب کا آغاز ہوا تو یہ سب عذاب بن گیا۔ ملک تباہ ہو گیا۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ لوگ غم کی شدت سے آنکھیں بند کر لیتے اور خود سے کہتے۔ اِس قیامت کا کبھی سوچا تھا؟

مروہ ال ثوبانی اکتیس سالہ دلکش خاتون، دو بچوں کی ماں جو حمص میں ڈاکٹر والد کے گھر پیدا ہوئی۔ اِسی حمص میں ہی بڑھی پلی اور ماہر تعمیرات بنی۔ یوں فیملی تو اُسے میڈیکل میں ہی بھیجنا چاہتی تھی۔ شام میں پڑھائی اور مستقبل میں پیشہ کا فیصلہ اُن کے امتحانی گریڈز کرتے ہیں۔ میڈیکل کے لئے گریڈز کا

بہت زیادہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن وہ بہت مطمئن تھی کہ اس کا شوق اس میں تھا۔

دمشق میں چار سالہ قیام نے اُسے سمجھا دیا کہ وہ جو بے حد تخلیقی ذہن کی مالک ہے اور چیزوں کو ایک دوسرے رخ اور زاویوں سے دیکھتی ہے۔ روایتوں اور طرز کہن سے جڑے لوگوں کو اس کا قطعی شعور نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے ہر جگہ رڈ کیا گیا۔ تاہم اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ امید اندھی ہوتی ہے اور یہ ہمیشہ انسانی دل میں اپنا راستہ بنا کر ایک شمع جلانے کا اہتمام کر لیتی ہے۔ چار سال کی جگل خواری کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ حمص آ گئی۔ جہاں ان کا آبائی گھر اور سٹوڈیو تھا۔ اُن کے سارے خواب بھی اُن کے ساتھ تھے۔

جنگ کے دوران وہ حمص کے اسی گھر میں رہی جو پرانے حمص کے قریب تھا اور جو جنگ کے دوران نو گو ایریا بن گیا تھا۔

یہ خوش قسمتی تھی کہ اِس کا گھر محفوظ رہا۔ بچے، شوہر اور وہ خود محفوظ رہی۔ مگر دو سال تک زندگی تو جیسے قیدیوں کی سی تھی۔ دو سال تک چاند نہیں دیکھا۔ گھر سے باہر بموں کی بارش ہوتی، تڑ تڑ گولیاں چلتیں۔ کھڑکیاں بجتیں اور شیشے ٹوٹتے۔ بچے سہم جاتے۔ مگر وہ انہیں حوصلہ دیتے۔ خود اپنا حوصلہ بڑھاتی۔ مروہ کہتی ہے۔

''میں اپنے شوہر کی ممنون ہوں کہ حمص نہ چھوڑنے کے میرے فیصلے کو اُس نے پسند کیا۔ اپنا میرا اور بچوں کا حوصلہ قائم رکھنے میں معاون بنا۔''

تو انہوں نے اس کا مقابلہ کیسے کیا؟ سالوں پر پھیلے ہوئے اِس خوفناک وقت کے بہت سے مرحلے تھے۔ ہر مرحلے پر نئے اور جان لیوا واقعات کا سامنا تھا۔ آغاز میں تو اس جنگ کا انداز جیسے کچھ نمائشی، کچھ تنبیہی کا سا تھا۔ لڑائی جھگڑے کی زوردار آوازیں سنائی دیتیں جو بہت پریشان کن ہوتیں۔ پھر باقاعدہ لڑائیاں تھیں۔ گلیوں میں گولیاں چلنے کی آوازیں آتیں اور آپ کو کچھ پتہ نہ ہوتا کہ باہر ہو کیا رہا ہے۔ دہشت اور خوف پر دھیرے دھیرے قابو پاتے صبح جب باہر نکلتے تو گلیوں میں کچھ نہ ہوتا۔

دھیرے دھیرے بمباری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہازوں اور ٹینکوں نے چڑھائیاں شروع

کر دیں۔ اس وقت اندر بیٹھے کسی بلڈنگ کے گرنے کی آواز زور دار گونج کے ساتھ اُبھرتی۔ یہ بہت خوفناک وقت تھا۔ سنپرز Snipers کے جتھوں نے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ شکاری کی گولیوں سے جیسے پرندے گرتے ہیں اسی طرح انسان مر رہے تھے۔

علی الصبح آپ گلی میں چل رہے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کے ایک طرف کوئی مرا پڑا ہے۔ ایسا بھی ہوتا۔ میں یا میرا شوہر باہر نکلتے۔ تو مجھ سے آگے چلنے والا اوندھے منہ گر پڑتا۔ کہیں گھات سے آنے والی گولی اُسے مار جاتی، یہ کیسے لرزا دینے والے لمحے ہوتے۔ لگتا جیسے ہم جان بوجھ کر شیر کی کچھار میں گھسے ہوئے ہیں۔ ہر شہر اس اذیت سے نہیں گزرا جو ہمارے شہر کو نصیب ہوئی۔

ہم خود سے سوال کرتے کیا ہم احمق ہیں جو اِس برستی آگ میں بیٹھے اپنا اور اوپر والے کا امتحان لے رہے ہیں۔ دو سال تک تو ہم نے کوئی کام بھی نہیں کیا۔

مروہ اپنے شدید دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ

''جب میں اپنے تباہ و برباد شہر پر نظر ڈالتی ہوں تو بے اختیار ایک سوال میرے لبوں پر آجاتا ہے۔ اِس بے کار اور فضول جنگ کا فائدہ؟ شام اپنے تاریخی اثاثوں کے ساتھ مختلف النوع مذاہب وعقائد رکھنے والے لوگوں کا ایک روادار اور افہام و تفہیم رکھنے والا ملک تھا۔ یہ کیسے خانہ جنگی کی اِس آگ میں گر گیا؟

ہمارے پاس جو تھوڑی بہت بچت کی پونجی تھی۔ کچھ گہنے پات کی صورت میں تھا۔ وہی سب آلام وابتلا کے دنوں میں خرچ کر ڈالا۔ بچوں کی سکولنگ گھر پر میں نے اور شوہر نے مل کر کی۔ پھر وہ سکول جانے لگے۔ اور اب میں نے خود پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ حما کی یونیورسٹی میں۔ تیس کلومیٹر کا یہ فاصلہ تقریباً بیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔

خطرات ابھی بھی ہیں۔ مگر ہم پر عزم ہیں۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ شامی زندہ قوم ہے۔ گورنمنٹ کا کنٹرول اب آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ کچھ حصہ ابھی بھی اسلامک سٹیٹ کے پاس ہے۔ تاہم 2015ء کے سیز فائر میں اہم باغی قوتوں نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔

حمص کتنا بھرپور رونق والا شہر تھا۔ یہ اب خاموش ہے۔ مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ پرانا شہر جہاں مارکیٹیں تھیں، گلیاں تھیں، پرانے طرز کے گھر تھے سب ختم ہو گئے ہیں۔ اتنی تباہی ہوئی ہے کہ جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

مگر زندگی نے ہر رنگ میں جینا ہے چلنا ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔ لوگوں نے دکانیں اُن رہائشی علاقوں میں کھول لی ہیں جو تباہ ہونے سے بچ گئے ہیں۔ شیڈوں کے نیچے ریڑھیوں پر، زمین پر، تختوں پر سامان خورد ونوش بکھرا ہوا ہے۔

نائی بال کاٹ رہے ہیں۔ گاڑیاں دھل رہی ہیں۔ مٹھائیاں بن رہی ہیں۔ لوگ ہر قسم کا کام کر رہے ہیں۔ میرے شوہر چار پانچ گھنٹے اکاؤنٹ کا کام کرتے ہیں۔ مکینیکل انجنیئر ٹیکسی ڈرائیور بن گئے ہیں۔ حمص سالوں سے بہت سے معاملات میں شام کے کچھ شہروں کے لئے باعث تقلید تھا کہ یہاں بے گھر لوگ نہیں تھے۔ مگر اِن اسلامی گروپوں کی فیاضیوں اور خیراتوں نے اب گلیاں ان سے بھر دی ہیں۔

حالات سے ناواقف لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے لئے اب سب سے بڑا چیلنج ہتھیاروں کی فراہمی ہے۔ لیکن حقیقتاً سچائی یہ ہے کہ اسپتالوں کے حالات اتنے مخدوش ہیں کہ جہاں نہ دوائیں ہیں اور نہ موزوں آلات۔ لوگ اتنے گولیوں سے نہیں مرے جتنے اب مر رہے ہیں۔

اب ذرا شہر کے ورثے کی کہانی بھی سن لیں۔ حمص اپنے دو لینڈ مارک کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل رہا۔ خالد بن ولید کی مسجد جس کے لکڑی کے منبر کی کارونگ جسے صلاح الدین ایوبی نے خود بنوایا تھا۔

دوسرے دنیا کا قدیم ترین چرچ آف سینٹ میری آف دی ہولی بیلٹ، دونوں کا بہت نقصان ہوا۔ منبر تو لوٹا گیا۔ تاہم ورجن کی بیلٹ محفوظ رہی۔ ایسا ہی قلعہ Krakdes Chevaliers کے ساتھ ہوا۔ حکومتی انتظامیہ دعویٰ کرتی ہے کہ اِسے ٹھیک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میرے شوہر اسے دیکھ کر آئے ہیں اُن کا کہنا ہے کام اتنی عجلت میں کئے گئے ہیں کہ ان کا بودا پن صاف ظاہر ہو رہا

ہے۔

کوئی میرے جذبات کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اپنے ملک کے اِن اثاثوں کی دوبارہ بحالی اوران سب کی تعمیرنو جو باقی بچ گئیں کیسے اور کیوں کرہو؟

ہم نے بہر حال اِس خبر کو سنا کہ جب حکومت نے اعلان کیا کہ پلمیرا Palmyra کا قدیم شہر حکومت نے واپس لے لیا ہے۔

ہدا آپ کو تو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ شام کے صحرا کا کس قدر قیمتی موتی ہے۔ اس کا اُن ہاتھوں سے واپس حکومت کے پاس آنا کس قدر مسرت کی بات تھی کہ اُن کے نزدیک تو اِن اثاثوں کی تباہی ہی اُن کی نجات اور بخشش کا راستہ ہے۔ مجھے مامون عبدالکریم سیریا کے انٹیک کا مسرت بھرا لہجہ کہ جب وہ مجھے فون پر بتاتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کا دوسرا بڑا خوشی کا دن ہے۔ لیکن یہ سب اپنی جگہ تاہم مجھے تو پلمیرا کے مایوس اور پریشان لوگوں کا خیال ہے جو گرفتار ہیں۔ زخمی ہیں۔ پریشان حال ہیں۔ جہاں نہ ڈاکٹر نہ دوائیں۔ اتنی خوفناک باتیں ہیں جو دل دہلاتی ہیں۔

اب اگر میں سچائی سے کچھ کہوں۔ بعض اوقات مجھے سمجھ نہیں آتی میں کیسے اپنے آپ کا اظہار کروں۔ پلمیرا کو میں نے تب دیکھا تھا جب میں سکول میں پڑھتی تھی۔ تب میں نے اِن کالموں کے گرد برقی وائرنگ دیکھی تھی۔ پرانے پتھروں پر کھدائی کئے نئے نام، غیر منظّم سی شہری آبادی کا پھیلاؤ۔ سیاحت اور Restoration کو اِس درجہ نظرانداز کیا گیا کہ حیرت ہوتی تھی۔ صحرا میں نہ حفاظتی اقدامات۔ تم اس پر چھلانگیں مارو۔ اُچھلو کودو۔ So called میوزیم کی تصویریں کھینچو۔ ناقص چھت۔ سچ تو یہی ہے کہ جو تباہ ہو گیا وہ تو بہت بہتر تھا۔

میں خوب سمجھتی ہوں۔ مغرب اس کے لئے اتنا جذباتی کیوں ہے؟ لیکن جب آپ یہاں رہتے ہیں تو آپ کی سوچ کے زاویے مختلف ہوتے ہیں۔

وہ اپنے خونخوار قسم کے طرزِ عمل کا بڑے ناقدانہ انداز میں اپنی کتاب The Battle of Home میں جائزہ لیتی ہے۔

اوراس کی اس The Battle of Home کو کوئی سنجیدگی سے دیکھے گا کہ تباہ شدہ حمص آنے والے دنوں میں اس کی بیٹی کی خواہش کے مطابق تعمیر ہو۔

اُسے کے خیال میں بہت ساری دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک اہم شامیوں کی شناخت اور اُن کی عزت نفس کی پامالی تھی۔شہری آبادکاریوں کے بے رحمانہ اور غیر منصفانہ تعمیرات اسی کا ایک پہلو ہیں۔ جہاں اقلیتی اور نسلی گروہوں نے اپنے اپنے باڑے بنالئے۔ وقت کے ساتھ شہر ایک ایسی آبادکاری میں بدل گئے جہاں مربوط ومضبوط آبادکاروں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سماجی فرقوں نے لے لی۔ جن کا آپس میں اور مرکز سے مربوط تعلق نہیں تھا۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق ایک بنیادی مرکز سے تعلق اور باہمی رواداری کا نہ ہونا وہ بنیادی چیزیں ہیں جنہوں نے تباہی میں مرکزی کردار ادا کیا۔

جب اس کے اردگرد بم گرتے تھے تب وہ سوچتی تھی کہ گھر کیسے ہونے چاہئیں کہ جو ایسے حالات میں انسانی زندگیوں کا تحفظ کرسکیں۔ وہ کاغذوں پر ڈرائنگ بناتی۔ شوہر سے بحث کرتی۔ حمص کے کوچہ وبازار اور گلیاں کیسی ہوں؟

وہ مستقبل کے شام کے تعمیری خدوخال پر بے حد جذباتی ہے۔ اور یہیں اس نے جی داری سے اِس قیامت کو سہا۔

جنگ کبھی کسی ایک سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بے شمار عوامل کا ایک ڈھیر لگ جاتا ہے تو چنگاریاں بھڑک کر آگ کا طوفان اٹھاتی ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر25:

ال نوری بیمارستان، مکتب انبار

- مشرق کا پہلا طبّی سکول بارھویں صدی کا پبلک اسپتال مسلمان سائنس دانوں اور طبّی ماہرین کی ذہانت وفطانت کی کہانیاں سناتا ہے۔
- مکتب انبار کی بیرونی صورت فقیرانہ مگر اندرونی شکل رئیسانہ ہے۔
- خواتین کے حمام بھی دمشق کی معاشرتی زندگی کا ایک حسن ہیں۔
- مدحت پاشا بازار کا باب توما سے باب کیسان تک کا حصّہ عیسائی اکثریت کا علاقہ ہے۔
- قرب قیامت سے متعلق بائبل کی پشین گوئیوں میں سے ایک شام اور اسرائیل کی مکمل تباہی ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ جونہی ماڈرن کواٹرز کے انتظامی اور کمرشل حصوں سے جدا ہوکر بندہ پرانے دمشق کے اندر داخل ہوتا ہے۔اور چاہے وہ جتنی بار بھی داخل ہو اس پر اس طلسمی دنیا کے دروازے ہر بار ایک نئے رنگ سے وا ہوتے ہیں جو کہیں خوابوں میں خیالوں میں بستی ہے۔ یہ حصّہ دمشق کا ہی نہیں بلکہ پورے ملک کا دل ہے۔ بلادشام کی انگوٹھی میں جڑا وہ نگینہ ہے جو دنیا بھر کی عظیم شخصیات کے مقبروں، مختلف مذاہب کے عبادت خانوں سے بجی نظر آتی ہے۔

داخلہ فصیل کے اندر کسی بھی حصے اور کہیں سے بھی ہو۔خوبصورت کلاسیکل قسم کے منظر خوش آمدید کہتے ہیں۔مشرقی جانب کا بیشتر حصہ غائب ہے۔ مدحت پاشا بازار جوال تاوارہ Al Tawra

سٹریٹ سے شروع ہوتا کسی بنگالی حسینہ کی سیدھی لمبی مانگ کی طرح دائیں بائیں نظارے کرواتا باب شرقی پر آکر آگے پھیلی آبادی کے ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔

یہ مرکزی مانگ ہر دو قدم پر چھوٹی مانگوں کا راستہ کھولتی ہے جن کی تنگ تنگ گلیوں کی بھول بھلیاں جہاں سکون، خاموشی اور گرم موسم میں ارد گرد پھیلی ایک لطیف سی خنکی کا احساس دفعتاً آپ کے رگ و پے میں لطیف سا ارتعاش اور مسرت آگیں کا احساس اُتارتا ہے۔

چلتے چلتے کسی گھر سے، کسی خان سرائے سے، باہر آتی موسیقی یا کسی گیت کے بول آپ کو انوکھے جہانوں میں لے جاتے ہیں۔ اُس جہان میں جسے آپ نے نہیں دیکھا۔ جسے کہیں پڑھا یا سنا ہے۔ جس کا اسرار جس کے بارے جاننے کا شوق دور دراز کے خطوں سے آپ کو یہاں کھینچ لاتا ہے۔

اس کی تنگ تنگ گلیوں میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے دروازوں کو دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ ایسے ایسے نادر محلوں اور حویلیوں کو کسی فقیر کی گدڑی میں چھپے لال کی طرح چھپائے ہوئے ہیں جن کے حیرت انگیز طرز تعمیر کو دیکھتے ہوئے بندہ حیرتوں کے جہان میں گر پڑتا ہے۔

اچانک کہیں ایسے شاندار محلات کے دروازے کھلتے ہیں کہ بعینہ یوں لگتا ہے جیسے ایلس کسی ونڈر لینڈ میں داخل ہو گئی ہے۔ خان سراؤں، کتب خانوں، گرجاؤں، مسجدوں کی دنیا واقعات، حقائق اور طلسمی کہانیوں کا ایک جہان وا کرتی ہیں۔

اس کے اندر گھومتے پھرتے کسی قریبی مسجد سے اذان کی مسحور کن آواز آپ کو اگر ایک لطیف سی سرشاری میں ڈبوتی ہے تو وہیں کسی خوبصورت چرچ میں بجتی گھنٹیاں بھی کسی آرتھوڈوکس عیسائی کے قدموں کو روک لیتی ہیں اور کچھ ایسا ہی حال کسی شینی گاگ کا بھی ہے۔

سچی بات ہے میں اس کی محبت اور اس کے سحر میں گرفتار تھی اُس وقت سے جب سے میرے بڑے بیٹے غضنفر نے ایک بار کیا کئی بار کہا تھا۔ اپنی ترجیحات میں سیریا کو شامل کیجیے۔ شیریں مسعود نے بھی مجھے اس کی داستانیں سنا کر میری اس آتش شوق کو مزید بھڑکایا تھا۔

دمشق میں ہمارے صرف اب چار دن باقی ہیں۔ اور یہ چاروں دن ہم نے اسی کے کوچہ

وبازار میں گزارنے ہیں۔دمشق کے بازار بھی تواپنی نوعیت کے ورسٹائل قسم کے بازار ہیں۔ حلب کے پرانے بازاروں کا بھی یہی رنگ ڈھنگ ہے۔ہمارے بازاروں کی طرح کہیں سوہا بازار یعنی طلائی بازار، کہیں اکبری منڈی جیسا مرچ مصالحوں والا بازار، کہیں گمٹی جیسا کپڑے کا کہیں کسیرا۔یعنی پیتل تانبے والا جہاں چھینیوں، ہتھوڑیوں کی ٹھک ٹھک، پٹ پٹ، سٹ سٹ والے منظر آپ کو روکتے اور دیس کے کی یاددلاتے ہیں۔

تو چار دنوں کوہم نے تقسیم کردیا ہے۔ آج میں اکیلی ہوں۔علی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔نسرین کا بھی کچھ موڈ نہیں بن رہا تھا۔ال نوری بیمارستان جیسے ماضی کے پہلے میڈیکل سکول کو دیکھنے ال حریقہ Al-hariqa یا سعدی عمود کواٹر میں داخل ہوتی ہوں۔بیرونی دروازے کی شان وشوکت کے کیا قصیدے پڑھوں کہ ایسا نظر آیا تھا کہ جس پر پڑتی ہر ہر نظر عظمتوں کی گواہی دیتی تھی۔داخلی گزرگاہ البتہ متناسب قامت والی تھی۔پیشانی اور اندر باہر کا سارا بدن سلجوق طرز تعمیر کے مخصوص انداز اور خوب صورتیوں کا عکاس تھا۔

سچی بات ہے اس کا بیرونی چہرہ دیکھ کر کوئی تاریخ سے ناواقف اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ اس بند سیپ کے اندر کتنا قیمتی موتی بند ہے۔یہ حال تقریباً دمشق کے اکثر محل باڑیوں کا ہے۔اندر داخل ہو کر گویا گل وگلزار اور طلسم کا ایک جہاں کھلتا تھا۔فوارہ گو خشک تھا مگر کبھی تو موتی بکھیرتا ہوگا تب کیا سماں باندھتا ہوگا۔آگے پھر محرابی کشادہ برآمدہ جس کے آگے کمرے، کہیں لمبی لمبی راہداریاں۔

مشرق کا یہ پہلا طبی سکول اور بارھویں صدی کا پبلک اسپتال، 549 میں اسے سلطان نور الدین نے بنایا تھا۔تقریباً اُنیسویں صدی تک یہ لوگوں کی خدمت کرتا رہا تا آنکہ دمشق کے مرکز میں ایک بڑا اسپتال نہ بن گیا۔

اس کا میوزیم بھی کمال کا ہے۔اسلامی فن تعمیر کا ایک لاجواب شاہکار وسطی عہد کے طبی آلات جرّاحی جو مسلمان سائنس دانوں اور طبی ماہرین کی ذہانت وفطانت کی کہانیاں سناتے تھے۔کچھ تو ایسے تھے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔شوکیسوں میں دھری کتابوں اور مسودات پر لکھے گئے نوٹس بتاتے تھے

کہ اس وقت کے عرب ڈاکٹر اور کیمیا دان اپنے مریضوں کا علاج صرف دوائیوں اور ان آلات سے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ نفسیاتی طریقے بھی استعمال کرتے تھے جن میں موسیقی، بات چیت اور آج کے بہت سے ماڈرن طریقے شامل ہیں۔

محبتوں اور عقیدتوں سے لبالب نذرانہ دعا کی صورت ابنِ ال نفیس کے حضور پیش کیا کہ وہ اِسی عظیم طبی درس گاہ کا طالب علم تھا۔

دمشق کا بیٹا 1213 عیسوی میں پیدا ہونے والا جس نے زمانوں پہلے دل کے دوران خون کا نظریہ پیش کیا تھا۔ انگریز سرجن ولیم ہاروے سے بھی صدیوں پہلے۔ میں نے رک کر گہری سانس بھری تھی اور حسرت لئے لہجے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔

''فکرو دانش کے سوتے پتہ نہیں اب کیوں خشک ہوئے پڑے ہیں؟''

میوزیم کے تین ہال بہت اہم ہیں اور ان کا فی الواقع دیکھنے سے تعلق ہے۔ اُن میں ایک سائنس ہال ہے اس میں آلات جراحی اور فلکیاتی آلات ہیں۔ زاویہ پیما، جہاز رانوں کے لئے سمتیں معلوم کرنے کے آلات۔ ابونصر ال فارابی کے مجسمے سے کتنی دیر باتیں کیں۔

اس کے کشادہ ایوان بھی قابل دید تھے۔ مشرقی سمت کا تو ہنگامی کیسز کو نپٹا تا تھا اور مغربی سمت کا نماز کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ دیگر حصے مریضوں کے لئے تھے کہ جہاں انہیں دنوں اور کبھی مہینوں ٹھہرایا جاتا اور ان کا علاج ہوتا تھا۔

میڈسن کے ہال میں نہ صرف آلات ہیں بلکہ طب کے مسودے، انسانی جسم اور آنکھ کی ڈرائنگ، نفسیاتی علاج کے لئے قرآنی آیات کا استعمال کیوں اور کیسے کیا جاتا تھا۔ ختنوں میں استعمال ہونے والی خاص قینچیاں اور آلات۔

تیسرا ہال جہاں پودے اور نباتات تھیں۔ دوائیں کیسے بنتی تھیں۔ یہاں لائبریری تھی۔ کتابوں کی اہمیت عربوں کی زندگی میں ہمیشہ سے تھی۔ اگر نہیں ہے تو بس آج کی دنیا کچھ اس سے محروم ہے۔

میں ایک پرسحری کیفیت میں باہر نکلی تھی۔ اپنے ماضی پرفخر کرتی اور حال پر کڑھتی۔ قریب ہی جریقہ بازار تھا۔ اس کی بھی بڑی دلچسپ داستان ہے۔ جب آئس کریم بار پر بیٹھی آئس کریم کھاتی تھی تو ایک نوجوان لڑکے سے سنتی تھی جس کی کرسی کے پاس میں نے اس لئے بیٹھنے کی کوشش کی تھی کہ حالات حاضرہ پر کچھ جان سکوں مگر اُس نے مجھے اس جگہ کے متعلق بتانا شروع کر دیا جو بہر حال کسی طور بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ پہلے یہ سارا علاقہ سیّدی عمود کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مشہور ومعروف عالم دین اور فلاسفر تھے۔

پورا علاقہ فرانسیسی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں زبردست بمباری کے نتیجے میں اس آگ کا شکار ہوا جو اِس حصّے میں ایسی بھڑکی کہ یہاں کے خوبصورت محل، خان سرائیں، حمام سب جل گئے۔ ایک تہذیبی ورثہ تباہ ہو گیا۔ سیّدی عمود کا مزار جل گیا۔ جرمن قونصلیٹ اور جرمن کونسلر کی رہائش گاہ سب جل بھن گئیں۔

باروق اور رکوکوسٹائل کا شاندار ورثہ تباہ ہو گیا۔ بے شمار تاریخی یادگاریں برباد ہو گئیں۔

اب یہاں پھیلے کاروباری مراکز کو دیکھتے ہوئے میں سوچتی تھی کہ دمشق کے حمام بھی دیکھنے کی چیز تھے۔ گو میں نے اُن سے عملی استفادہ نہیں کیا مگر اُن کے حسن وخوبصورتی، آرائش وزیبائش سے دل ضرور شاد کیا۔ ان میں قدیم ترین نورالدین کے وقتوں کا بنایا ہوا نورالدین حمام بھی ہے جو مجھے مدرسہ نوریہ کے قریب نظر آیا تھا۔ دو تین اور بھی حماموں میں جھانکی تھی۔

کہاں کسی نے دیکھا ہوگا ایسا خوبصورت بوڑھا گھر اُس حسینہ عالم جیسا جو اپنی جوانی میں کیا تہلکہ خیز شے ہوگی۔ بڑھاپا ماند پڑا ہوا مگر عظمت رفتہ کی داستان سناتا ہوا۔ بیرونی دروازہ عام سا مگر اندر حیران کرنے والی حیرتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ حیرتیں رنگوں کی صورت میں تھیں۔ پچی اور چوب کاری، رنگین پتھروں سے آراستہ دیواروں اور تین سو سال پرانے فرش کی صورت میں آنکھیں پھاڑتی تھیں۔ برطانوی کونسل جنرل کا گھر بعدازاں بہت سے دیگر بڑے لوگوں کا گھر رہا۔ دمشق کے ابتر دنوں کی طرح گھر بھی صنعتی لیٹروں کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے رنڈی بازوں کی طرح اس کا حسن لوٹنے کی پوری

کوشش کی۔ بہرحال حکومت نے 1974 میں اسے آراستہ پیراستہ کر کے محفوظ کیا۔ اب اللہ جانے کس حال میں ہو۔

مکتب انبار بھی کیا چیز تھی۔ بیرونی صورت تو نری فقیرانہ سی پر اندر سے انتہائی امیرانہ۔ آغاز میں تو گھر کا ہی نام لے لیں۔ تعمیری حسن کی محبت جوش مارے تو محل کا نام دے لیں۔ نہیں جانتی اُن شاہی لوگوں کی کیا نفسیات تھی۔ محمود الکواتلی نے اسے 1867 میں بڑے ارمانوں سے بنایا۔ تاہم یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس نے بعدازاں اسے یونس انبار ایک امیر یہودی تاجر کے پاس کیوں بیچ دیا۔ عثمانی سلاطین نے اسے ایک قرضے کے عوض بحق سرکار ضبط کر کے سکول بنا دیا۔ سکول کہہ لیں یا یونیورسٹی کہ دمشق کے امراء کے بچوں نے تعلیم حاصل کی اور بہت بڑی شخصیات یہاں سے میڈیسن، لٹریچر اور قانون وغیرہ کی تعلیم میں نمایاں ہوئیں۔

عرب قومیت کا راگ اسی کی فضاؤں سے بلند ہوا۔ پروان چڑھا اور اس کا جھنڈا اسی گھر سے لہرایا گیا۔ پھر فرانسیسیوں کے غلبے میں قوم پرستوں کی مدافعتی سرگرمیوں کا گڑھ رہا۔ اس کی شاندار لائبریری دیکھی۔ سمپوزیم ہال دیکھے۔ اور آرٹ گیلری سے لطف اندوز ہوئی۔ یہ اندلس کے الحمراء کی یاد دلاتا ہے۔

میں نے لان میں کھڑے بالکونیوں کو دیکھا تھا۔ پتہ نہیں ٹیرس اور بالکونیاں کیوں ہمیشہ بہت مسحور کرتی ہیں۔ وہاں بیٹھ کر چائے پینے کا تصور ہمیشہ بڑا ہی رومانوی نظر آیا۔ اب ذرا تاریخ سے بھی شناسا ہو جائیں۔

قہوہ اور کافی عرب دنیا کے دو پسندیدہ ترین مشروبات، قہوہ وہی ہمارے ہاں کے چائے کی پتی کا دم شدہ۔ ہمارے قہوے سے مختلف۔ ہماری چائے دودھ کے ساتھ۔ قہوہ خانے اور کافی گھر بھرے پُرے، موسیقی اور گانوں سے آباد شاد۔ یہی وہ قہوہ اور کافی گھر تھے جو ماضی میں داستان گوئی کا مرکز تھے۔ داستان گوئی کی داستان بھی بڑی دلچسپ۔ داستان گو ہمیشہ پڑھا لکھا آدمی ہوتا تھا۔ سارے دن کی مشقت کے بعد جیسے ہمارے ہاں چوپال جمتی اور کبھی ہیر رانجھا سنی جاتی اور کبھی کوئی فوک داستان۔

کچھ ایسا ہی حال دمشق کا تھا کہ یہاں کہانی پڑھی جاتی اور ساتھ ساتھ چہرہ اور بدنی اعضاء اس کی ڈرامائی تشکیل کرتے۔ اب ذرا اس سارے حصے کا تفصیلی اظہار بھی سن لیں۔

قہوہ خانے کے وسط میں ایک بڑا سا پلیٹ فارم بنا ہوتا جس پر روایتی شلوار سرخ طر بوش پہنے ایک خوبصورت شامی داستان گو آغاز کرتا۔ کہانی عام طور پر کسی ایسے ہیرو کی ہوتی جس نے ماضی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔ پرانی جنگوں، فیاضی، وفاداریوں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی کہانیاں۔

مدحت پاشا بازار کا وہ حصہ جو باب توما Tomal سے باب کیسان Kissan تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرح عیسائی اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں دیوار دمشق کا کچھ حصہ غائب ہے۔ ٹیکسی نے مجھے حنانینہ سٹریٹ کے پاس اُتارا جہاں سے میں حانینہ Hananaya چرچ میں آ گئی۔ سیڑھیاں بہت نیچے لے گئی تھیں۔ اب یہ معلوم نہیں ہوا کہ تعمیر ہی ایسے انداز میں ہوئی یا سڑکوں اور شاہراہوں کی مسلسل بلندی کا عمل اس کا باعث ہے۔ یہی وہ چرچ ہے جہاں حنانینا نے سینٹ پال کا بپتسمہ انجام دیا تھا۔

بادشاہ چاہے ہندسندھ کے ہوں چاہے روم ایتھنز کے ہوں۔ اول درجے کے کمینے اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں سے پھڈے بازیاں کرتے رہتے تھے۔ روم کے شہنشاہ Aretas نے بھی سینٹ پال کی گرفتاری لئے بندے متعین کئے جو مار دھاڑ کرتے یہاں پہنچے۔ مگر سینٹ پال ایک سرنگ کے راستے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔

گرجے میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ خوبصورتی کے ساتھ پرانا پن بھی تھا۔ ٹرے میں بچھی ریت پر چند موم بتیاں جلتی تھیں۔

اور کونے میں ایک گہیواں رنگ کا اُدھیڑ عمر مرد بیٹھا اِس سارے منظر کو مزید پراسرار بنا رہا تھا۔ میں قریب گئی۔ اپنا تعارف کروایا۔ شکر کہ اُس کے قدرے عجیب سے چہرے پر مدھم سے نرمی اور ملائمت کے نشان اُبھرے۔ بولا تو مزید شکراً کہا کہ انگریزی جانتا تھا۔ باتیں ہونے لگیں۔ میں تو حیرت زدہ رہ گئی تھی جب کسی لمبی چوڑی تمہید کے اُس نے کہا تھا۔

''سیریا میں بڑی تباہی آنے والی ہے۔ بائبل میں اس کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ قریب

قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شام شہر نہیں رہے گا۔ بس کھنڈرات کا ڈھیر ہوگا۔ کچھ ایسا ہی حال اسرائیل کا بھی ہوگا۔''

تب شام کے پرامن حالات کے تناظر میں یہ بات بڑی عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جاننے کی کوشش کی۔ برادرر ابرٹ کی باتوں میں کہیں ابہام نہ تھا۔

وہ بڑا واضح تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بائبل کے عالم مسلسل غور وفکر کی دنیا میں رہتے ہیں۔ قیامت کی نشانیوں کے اظہار میں سے ایک بڑا اظہار یہ ہے۔

آج جب میں اس کی باتیں یاد کرتی ہوں تو خود سے پوچھتی ہوں تو کیا اُس پادری کی باتیں سچ کی کسوٹی پر پوری اترنے والی ہیں۔

ال مریم چرچ کو دیکھنے کا مزہ آیا۔ مدحت پاشا بازار کی رونقیں لوٹتے لوٹتے جب آپ اس سے باہر نکلیں تو ساتھ ہی چرچ سٹریٹ ہے اور یہیں وہ دمشق کا پہلا چرچ ہے جو خلیفہ ال ولید نے سینٹ جان چرچ کے عوض جگہ اور پیسہ دے کر بنا کر دیا تھا۔ ساتھ میں یہ لفظ بھی کہے تھے جو تاریخ میں محفوظ ہیں۔

''ہم آپ کو چرچ جان کی جگہ چرچ مریم بنا کر دے رہے ہیں۔''

عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اس کی تعمیر نو ہوئی۔ ہاں البتہ بعد میں توجہ نہیں ملی۔

شامیوں کی زندگیوں میں حمام کا گھروں میں بھی بڑا دخل ہے۔ حماموں میں غسل کی روایات کا تعلق تو یونانی اور رومن ادوار سے ہے۔ تاہم اس میں کچھ نئے اضافوں کا حسن اسلامی دور میں بھی ہوا۔ اب تو یہ عرب اور ترکی کلچر کا اہم حصّہ بن چکا ہے۔ بزوریا Bzouriyah مارکیٹ میں جب نورالدین حمام میں داخل ہوئی تو گویا جیسے حیرتوں کے دریا میں گر پڑی۔ یہاں تو رنگوں اور خوبصورتیوں کا ایک جہاں امنڈا پڑا تھا۔

محرابی دیواروں کے شگاف اور گنبد والی چھت میں چوبی شیشوں والی کھڑکیاں اور ان کے درمیان نقش ونگاری کا کام چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت بکھرا ہوا تھا۔ خوبصورت چوبی ڈیزائن کی حد

بندیوں نے کمرے کوتقسیم کررکھا تھا۔درمیان میں فوارہ تھا۔دیواروں کی پشت سے لگےصوفوں پر بیٹھے لوگ ۔خوبصورت مرضع صوفے پر بیٹھے ہوئے میں نے سوچا۔اورعقب میں کمروں کے سلسلے ۔ یہاں کاروبارہورہا تھا۔

یہ بھی ایک دنیا تھی ۔رنگ رنگیلی سی ۔خواتین کے حمام دمشق کی معاشرتی زندگی میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ اکثر رشتوں ناطوں کے لئے بھی موزوں جگہ سمجھی جاتی ہے۔

میری یادوں کے دریچے کھلتے ہیں
اورایک کے بعدایک چہرہ سامنے آتا ہے
مجھے یاد ہیں رنگین تولیے جو
حمام الخیاتن کےدروازوں پرلہراتے تھے
جیسےاپناقومی دن منارہےہوں
مجھےزنگی چٹخنیوں والادمشقی گھریاد ہے
جومجھے جنت کی یاددلاتاتھا

☆☆☆

باب نمبر 26:

ابوصلاح

؎ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ابو صلاح عمر پنتالیس 45 سال، 22 سال رومانیہ میں گزرے۔شام کسی معشوق کی طرح ہمیشہ بڑا محبوب رہا۔کسی جگمگاتے فانوس کی طرح نہاں خانہ دل میں جگمگاتا رہا۔اس وقت سے جب میں دمشق یونیورسٹی میں قانون کا طالب علم تھا۔

بہت سے دیگر حساس اور جذباتی نوجوانوں کی طرح میں بھی شامی حکومت کے تحت زندگی گزارنے پر اور عام لوگوں کے خلاف خفیہ اداروں اور سیکورٹی فورسز کی کاروائیوں پر بڑا کڑھا کرتا تھا۔ کون حکومت کا وفادار ہے؟ کس نے اسد حکومت کے خلاف کوئی تقریر کی؟ بحث مباحثوں میں کون زور وشور سے باتیں کرتا تھا۔ ہر جگہ خفیہ کے آدمی عام کپڑوں میں ملبوس موجود ہوتے۔

شاید میرے نزدیک تب اس کا واحد حل شام سے فرار ہو جانا تھا۔لیکن اس کے لیئے ویزا حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں نے اپنے ان دوستوں سے رابطہ کیا۔انہیں درخواست کی جو رومانیہ میں قیام پذیر تھے۔انہوں نے مجھے وہاں آنے اور ان کے ساتھ ہی رہنے کی پیش کش کی۔

شامی قانون کے مطابق گریجوایشن کے فوراً بعد فوج میں خدمات سرانجام دینی ضروری ہوتی ہیں۔اس صورت سے بچنے کے لیئے میں نے سالانہ امتحان نہیں دیا۔سیاحت والا پاسپورٹ بنوانے کے لیئے پیسوں کا بندوبست کیا۔دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد جس کے تحت میں نے ان

سے تین ماہ میں واپسی کا وعدہ کیا تھا رومانیہ روانہ ہو گیا۔ سچ تو ہے کہ میں انقلاب کے بعد ابھی تک واپس نہیں گیا۔

میری اور میرے دوستوں کی سب سے پہلی اور اہم تشویش شام میں خون بہا کو روکنا تھا۔ کیونکہ حکومت بڑی وحشیانہ ہوتی جا رہی تھی۔ بغاوت یا انقلاب صحیح تھا یہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر ظلم کے آگے آپ کتنی دیر بند باندھ سکتے ہیں؟ کہہ لیجیئے ہمیں حکومت کے خلاف احتجاج کرنے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ یہ نا کام ہوا اس کا دکھ ہے مگر ہمارا ابھی عزم ہے کہ ہم کبھی ہار نہیں مانیں گے۔ ہم ابھی تک سوگوار خاندانوں کو خوراک کی ٹوکریاں پہنچاتے ہیں۔ قید کیئے گئے لوگوں اور شہید کیئے گئے افراد کے خاندانوں کی دیکھ بھال اور ان کے ساتھ ہر طرح کی معاونت کر رہے ہیں۔

ہم ان حساس جگہوں پر موجود لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملتا ہوں جو اس انقلاب کے بارے میں منفی سوچ کے حامل ہیں۔ لیکن میں ایک باپ سے ملا جس نے تین بیٹے کھو دیئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تمہیں افسوس ہے کہ تمہارے تین بیٹے مارے گئے اور حکومت اب بھی اقتدار میں ہے؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔ میں تو اس بات پر رو رہا ہوں کہ شام پر قربان کرنے کے لیئے میرے پاس مزید کچھ نہیں ہے۔''

انقلاب کے چار سال بعد وہ لوگ جو ایک ہزار ڈالر امداد دیتے تھے وہ اب صرف 200 ڈالر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں حکومت تین یا چار ماہ میں گر جائے گی۔ اسی لیئے ہم نے وہ تمام جو ہمارے پاس تھا دیوانہ وار بغیر منصوبہ بندی کیئے خرچ ڈالا۔

لیکن اب ہم نے مزید منظّم ہونا سیکھ لیا ہے۔ عطیات کم ہیں لیکن بہتر استعمال کیئے جاتے ہیں اور صحیح ضرورت مندوں تک جاتے ہیں۔ ہم شام کے اندر ہی سے ایسے منصوبے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے ہم اپنی سرگرمیوں کے لیئے رقم مہیا کر سکیں۔ اور بیرونی امداد پر

انحصار کو روکا جائے۔ہم بھکاریوں کی طرح پیسے مانگتے نہیں رہ سکتے۔

ہم نے بے گھر افراد کے لیئے عطانا اندرون شام میں پہلا کیمپ تعمیر کیا ہے۔

ہم 2012 میں ادلیب میں تھے۔اس عارضی ہسپتال کے لئے ادویات وغیرہ کا سامان جسے ہمارے چھوڑنے کے فوراً بعد راکٹ نے ملیا میٹ کر دیا۔کافر سجناہ میں ہماری گاڑیوں پر ایک گولہ آ کر لگا۔میں نہیں جانتا کہ ہم کیسے بچ گئے۔

افسوس کہ وہ مہربان شامی ڈاکٹر جو ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا۔ایک سنیپر کی گولی لگنے سے شہید ہو گیا۔

ہم ناامید نہیں۔بے شک انقلاب ناکام ہو گیا۔بہت تباہی آئی۔لوگوں کی ایک کثیر تعداد گھروں سے بے گھر ہوئی۔بہت لوگ شہید ہوئے۔ظلم وستم کے نئے باب کھلے۔ہمارا ایمان ہے کہ آزادی خراج مانگتی ہے۔خون کا،دربدری کا،دکھوں کا۔آزادی کے بارے ایسے تو نہیں کہا گیا کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ہماری آزادی کی وہ سحر بھی ایک دن طلوع ہوگی۔ہم نے اس کا مطالبہ کرتے رہنا ہے۔جدوجہد جاری رکھنی ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 27:

مونا عمیدی

- مونا عمیدی نے امریکن ماں کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی دمشق نہیں چھوڑا۔
- شام جیسے تہذیبی وثقافتی ورثے سے لبالب بھرے ملک کو اب کھنڈر بنتے دیکھنا بڑا کٹھن کام ہے مگر مونا عمیدی لفظوں کے سہارے یہ کام کر رہی ہے۔
- جنگوں کے المیے انسانی جذبات واحساسات کی پوشیدہ پرتوں کو بھی بیدار کر دیتے ہیں۔
- حافظ الاسد نے بنیادی مسائل کے حل کی طرف توجہ نہیں کی۔

دمشق میں چم cham پیلس ہوٹل کے بالمقابل نوبل بک شاپ پر دھری مونا عمیدی کی نظموں کے مجموعے کی پھولا پھرولی میں اِس نظم نے پل بھر میں ہی گرفت میں لے لیا تھا۔

آہ بغداد کے سٹور بند ہیں
تریپولی کی گلیاں ویران ہیں
غزہ پر بمباری ہے
فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے
دنیا سو رہی ہے
اور عرب دنیا
بحث میں اُلجھی ہوئی ہے کہ
ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے؟

یہ چونکا دینے والی نظم تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے پانچ چھ مزید نظموں کے مطالعہ نے بتایا کہ شاعرہ نے بشار الاسد کے آغاز اقتدار سے جس سیاسی تبدیلی کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے بہت سی امیدیں وابستہ کیں۔فکری انقلاب مشرق وسطیٰ کے درودیوار پر دستک دیتا محسوس کیا۔2000 سے 2001 کے مختصر وقت کو "دمشق بہار" کے نام سے موسوم کیا تھا۔آنے والے وقتوں میں اس نے مایوس کیا۔

نثر اور کورس کی کتابیں لکھتے لکھتے دلی جذبات شعروں میں ڈھلنے لگے تھے۔

کھلتی رنگت والے سیلز مین نے صاحب کتاب سے مزید تعارف کی غرض سے ایک اور خوبصورت کتاب سیرین فوک ٹیلز Syrian Folk tales ہاتھ میں پکڑا دی اور ساتھ ہی بڑے میٹھے سے لہجے میں بیٹھ کر کتاب کو تفصیلی دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔

دیدہ زیب طباعت و کتابت اور ٹائیٹل نے توجہ فوراً کھینچی۔صفحات الٹنے پلٹنے اور کہیں کہیں پڑھنے سے احساس ہوا کہ بلادالشام کے مختلف علاقوں کی یہ کہانیاں ایک انتہائی شاندار پیش کش تھی۔گرفت میں لینے والی عام فہم زبان جو حقیقت اور طلسم ،معلوم اور نامعلوم کے درمیان سفر کرتی تھیں۔مصنفہ شاعرہ بھی کمال درجے کی تھی۔دونوں کتابیں خرید لیں۔میری درخواست پر بک شاپ کے مالک نے مصنفہ کا فون نمبر اور پتہ بھی کاغذ پر لکھ دیا تھا۔یہ 2008 تھا۔شام پرامن تھا اور عام آدمی کب جانتا تھا کہ فضاؤں میں کہیں اس کی بربادیوں کے چرچے گردش میں ہیں۔

کہانیوں نے مجھے سحر میں جکڑ لیا تھا۔یہ تعارف تھا اِس خوبصورت ملک کے ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے۔یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں عمیدی کی دادی سے بیٹھی کہانیاں سن رہی ہوں۔شام کے شہروں کے گھروں کے پرسکون ماحول میں، شام کے مختلف دیہی علاقوں میں روایتی زندگی کے سارے رنگ اِن کہانیوں میں اڑتے پھرتے تھے۔

رات گئے نظمیں پڑھتی رہی۔اگلے دن ال فردوس سٹریٹ پر واقع گھر پر ملاقات کے لئے پہنچ

گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں پتہ پانی ہوگیا۔ٹیکسی ڈرائیور بڑا اناڑی سا تھا۔خوب خوب گھمایا۔اس پتھر کی طرح رولا جوفٹ پاتھ پر پڑے کسی شرارتی سے چلنے والے راہگیر کی ٹھوکروں پر آجائے جو پاؤں کے ٹھڈوں سے اُسے لڑھکا لڑھکا کر اس کا حشر نشر کردے۔

مونا عمیدی قدرے فربہی بدن کی سُرخ وسفید خاتون نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔دروازہ ایک معمر عورت نے کھولا۔ایک اجنبی صورت سامنے تھی۔زبان یار من ترکی والا معاملہ تھا۔تاہم مونا آگئی۔پاکستان کا جان کر اتنا خوش ہوئی کہ جتنی سفر سے کوفت ہوئی تھی سب اُڑنچھو ہوگئی۔چھوٹے سے سجے ہوئے ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہی کولڈ ڈرنک آیا، پھر قہوہ، کھجوریں اور مٹھائی آگئی۔ باتیں شروع ہوئیں اور پھیلتی چلی گئیں ۔ اپنی دونوں کتابیں میرے پاس دیکھ کر خوش ہوئی۔میں نے کہا کہ وہ اُن پر کچھ لکھ دے۔

''سکون سے بیٹھو۔لکھ دوں گی۔'' محبت بھرا اظہار تھا لہجے میں۔

''یہ شاعری''

اُس نے کتاب کی طرف اشارہ کیا شاید اس معیار کی نہ ہو جو شاعری کا ہوتا ہے۔اصل میں تو فوک ٹیلرز کی یہ کتاب ہے جسے میں نے اہتمام اور محبت سے لکھا ہے۔یہ تو بس ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔

باتیں شروع ہوئیں وہ بھی دو عورتوں کی جو دو مختلف ملکوں، دو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔عورتوں کے حوالے سے جو تصویر مونا نے مجھے دکھائی وہ ہماری تصویر سے کچھ ہی مختلف تھی۔شہری اور دیہی عورت کا جائزہ بھی تھا۔تاہم سیریا میں زیادہ آبادی شہری ہے۔ملکی قانون میں بھی مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

تاہم سیاسی طور پر جو کچھ سُننے کو ملا وہ صحت مند نہ تھا۔مونا بہت سلجھی ہوئی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والی خاتون تھی۔اس نے مختصراً شام کی سیاسی تاریخ میرے سامنے کھول دی تھی۔میری درخواست تھی کہ وہ کچھ حالات پر روشنی ڈالے کہ جانوں تو سہی۔

خادمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لائی۔جس پر ڈش میں سُرخ کٹا تربوز سجا تھا۔مونا نے پلیٹ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اُسے بھرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کانٹا بھی ہاتھوں میں تھما دیا۔

شہد جیسا میٹھا ٹھنڈا تربوز حلق سے نیچے کیا اُترا کہ روح تک سرشار کر گیا۔

عرب دنیا میں دراصل بعث پارٹی نے بہت سرعت اور جانفشانی سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا تھا۔ اِس کی واحد مثال اسلامی بھائی چارے سے ہی دی جا سکتی ہے۔حافظ الاسد ایسا ہی ایک مضطرب نوجوان تھا جو قومی کردار میں اپنا حصّہ ڈالنے کیلئے بے قرار تھا۔وہ فائٹر پائلٹ تھا۔اپنی فوجی وابستگی کو اُس نے پارٹی میں اپنے کردار کیلئے بہت سمجھداری سے استعمال کیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ، مہارت، ذہانت، فراست اُسے 1971 تک ملک کی صدارت کے عہدے تک لے گئے۔

اُس کی فتح یابی یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔وہ اگر چاہتا تو اپنے اِس اقتدار میں سیریا کو آسمان پر لے جاتا۔مگر اُس نے بنیادی مسائل جن میں سرفہرست نسلی امتیازات اور "معاشرے میں اسلام کا کردار" کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ سلسلہ جو آج سیریا میں اپنی تلخیوں اور المیوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔شاید نہ آتا اگر اس کا تدارک کر لیا جاتا۔

1973 کے نئے آئین میں درج تھا۔فرانسیسی غلبے کے دوران بھی جو آئین وضع تھا اسمیں بھی یہ درج تھا کہ صدارت پر متمکن صرف مسلمان ہوگا۔سیکولر سیاست کے ساتھ مخلص ہونے کے باوجود حافظ الاسد نے اس مسلم آرا کو دو طریقوں سے سبوتاژ کیا۔پہلے کے مروجہ آئین ایک شق داخل کرتے ہوئے اسلام کو نئے معنی پہناتے ہوئے اُسے نئی تعریف دی۔

اسلام امن، عدل، سلامتی، محبت اور مساوات کا مذہب ہے۔اُس میں علویوں Alawis کو شیعہ مسلک سے جوڑا گیا اور کافر یا بدعتوں کی فہرست سے نکال باہر کیا۔یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ جو 1982 حما Hama کے شہر میں پہلی بار فسادات کا باعث بنی۔ان کی شدت اِس درجہ تھی کہ شہر کھنڈر بن گیا۔

یہ اور بات تھی کہ اس کی بھرپور توجہ ،دلچسپی اور فراخدلانہ وسائل کے استعمال نے کیا گھروں، کیا سڑکوں، اسپتالوں، پارکوں کی تعمیر کروا کے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ جلا بھنا کھنڈر شہر کیسے ایک زندہ شہر بن سکتا ہے اور حکمران اگر چاہیں تو چیزیں کیسے ممکن ہوتی ہیں؟

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔مگر بنیادی جھگڑا تو جوں کا توں تھا۔نسلی مسائل کو حل کیسے کرنا ہے اور اسلام کا معاشرے میں کیا کردار ہو جیسے اہم مسائل پر اُس کی عدم دلچسپی آنے والے خونین حادثات کا باعث بنی۔اُس کے ہاں اسلام اور بعث پارٹی سنی اور علویوں ،شہروں اور دیہی علاقوں میں سماجی تضادات کی گھتیوں میں الجھتی رہیں اور اُس نے انہیں سلجھانے اور حل کرنے کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

2000 میں بشار کے آنے سے احساس ہوا کہ شاید تبدیلی کی کوئی خوشگوار سی لہر چلے۔اس کی برطانوی نژاد بیوی اسما الاکراس Akhras بھی بہت تیز اور ڈرامیٹک قسم کی اپروچ کی حامل نظر آئی تھی۔

دراصل اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے دمشق بہار کا نعرہ لگاتے ہوئے درجنوں سٹڈی سرکلز اور بحث مباحثوں کے مراکز قائم کیئے۔ سچی بات ہے 2001 میں دانشوروں اور وکلاء کے گروپوں نے آئین میں اصلاحات کے لیئے زوردار قسم کی مہمیں چلائیں۔جن میں سرفہرست ایمرجنسی قوانین کا ہٹانا اور مکمل شخصی آزادیوں کا حصول تھا۔مگر جابرانہ ہتھکنڈے اتنے زبردست تھے اور اندر خانے ایسی ایسی گھناؤنی سازشیں تھیں کہ بظاہر ہر سطح بہت پرسکون نظر آنے کے باوجود تہہ میں بہت طوفان مچلتے تھے۔

جب ہم شام کی چائے پیتے تھے۔ملحقہ کمرے سے مدھم سروں میں کسی گیت کی آواز نے جیسے مجھے مضطرب سا کر دیا۔آواز اتنی خوبصورت تھی کہ سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی گیت دل میں اُترا جاتا تھا۔

مونا نے پوچھا تھا۔عربی کی شدبُد ہے۔

''بس پڑھنے کی حد تک سمجھنے کی نہیں۔''

یہ نزار قبانی کی شاعری تھی۔ترجمہ بھی اُس نے کر دیا تھا۔اور گانے والے کا نام بھی۔نزار قبانی

پر بات ہوئی تو کہنے لگی۔ وہ زمانوں کا شاعر ہے۔ مخصوص وقت کا نہیں۔

عورت مرد کی امارت سے
نہ ہی اس کی خوبصورتی سے
اور نہ ہی اس کی شاعری سے
کچھ نہیں چاہتی
اس کی تمنا ایک ایسا مرد ہے
جو اس کی آنکھوں کی زبان سمجھ سکے
جب وہ اداس ہو
وہ اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرے
اور کہے
یہ ہے تمہاری جائے پناہ

پھر مونا کی ذاتی زندگی کے بارے جانا۔ امریکن ماں اور شامی باپ کے گھر پیدا ہونے والی یہ بچی 1962 میں دمشق میں پیدا ہوئی۔ انگریزی ادب میں گریجوایشن اُس نے دمشق یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے ساتھ اس نے انگلش عربی ٹرانسلیشن کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آغاز میں اس نے بچوں کے لئیے انگریزی کورسز مرتب کئیے۔ اور انگریزی زبان کیسے پڑھائی جائے پر نصابی کتب لکھیں۔ بعدازاں عربی کہانیوں کا ترجمہ شروع کردیا۔

دو بچے بیٹا اور بیٹی باپ کے ساتھ دیمس Dimas کسی عزیز کے ہاں گئے تھے۔

''دراصل اُن کی بیٹی میری بیٹی کی ہم عمر ہے۔ بہت پیار ہے دونوں میں۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔''

''آپ نہیں گئیں؟'' پوچھا۔

''کچھ طبعیت ٹھیک نہ تھی۔'' پھر ہنستے ہوئے بولیں۔

''ہاں چلی جاتی تو تم سے کیسے ملتی؟''

اور واقعی میں نے سوچا یہ جو دانے دانے پر مہر ہے ایسے تو نہیں کہا گیا۔

ہمارے درمیان اب اس کی فوک کہانیوں کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔

فوک کہانیوں کی ان سلسلہ وار کتابوں نے ایک دھوم مچا دی۔عام شامی کیا پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے ملک کی ثقافت کے اِن خوبصورت رنگوں سے ناواقف تھے۔بہت پذیرائی ہوئی۔انگریزی میں شاعری بھی چونکا دینے والی تھیں۔یہ جذبات واحساسات کا ایک جہاں کھولتی تھیں۔عراق سے متعلق نظمیں، لیبیا،مصرعرب دنیا کس بے حسی کا شکار ہے۔بڑی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں ، غلبے کی خواہشیں اور طاقت کے اندھے اظہار کیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے عام لوگوں کے خوابوں ،خواہشوں،امیدوں اوران کے بستے رستے خوش وخرّم گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں۔وہ جو کہانیاں اور محبت کے گیت لکھتے اور گاتے لوگ کیسے میٹھے جذبات سے ناطہ توڑ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔بے حد عام فہم لفظوں میں حقیقت کا چہرہ اور اپنے جذبات واحساسات کس خوبی سے اپنے اندر سے نکال کر وہ باہر صفحے پر بچھا دیتی ہے۔

جب عراق خاک وخون میں نہا رہا تھا کہیں کسی وژن رکھنے والے نے کہا تھا۔عراق سے فراغت کے بعد شام کی باری ہے۔آپ اِس بارے میں کیا کہتی ہیں؟

اِس بات پر اُس نے دکھ سے بھرئی ہوئی لمبی گہری سانس باہر نکالی تھی۔اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''حافظ الاسد غیر معمولی ذہانت والی شخصیت تھی۔سوال ہے کہ 1982 کی تباہ کن بغاوت سے اُسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کس طرح بیرونی طاقتیں اس کے لوگوں میں گھسی کام کررہی ہیں؟ جب 1500 سے سے زائد مشین گنیں پکڑی گئیں۔لوگ گرفتار ہوئے اور معلوم ہوا کہ ان کی سی آئی اے نے تربیت کی ہے تو پھر عزائم کو پڑھ لینا کوئی مشکل کام تھا۔مگر بات تو اتنی سی ہے کہ آمرانہ اقتدار کا مزہ اس نشہ آور مشروب کی طرح ہے جسے حالات کی تیز ترین ترشی جھنجھوڑتی ضرور ہے مگر ہوشیار نہیں کرتی۔''

رات کے کھانے کے بعد مونا کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ہم نے فون،ای میل کے تبادلے کیے تھے۔

پاکستان آ کر کبھی کبھی میرا اُس سے رابطہ ضرور ہوتا۔تاہم 2011 میں اخبارات نے بتانا شروع کیا کہ خانہ جنگی شام کے خوبصورت شہروں پر اپنی نحوست کے سائے پھیلانے شروع ہوگئی ہے۔

آنسووں نے آنکھیں دُھندلا دی تھیں کہ اندھی عرب دنیا اور دیگر اسلامی ملکوں کی قیادتیں سب آلہ کار بنی ذاتی اعتراض کیلئے ضمیر کے سودے کرتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیئے اپنی اپنی دنیاؤں میں گم تھیں۔کوئی بیئون منصوبہ بھی ہے۔کہیں پر عظیم تر اسرائیل کے لیئے کام ہو رہا ہے۔امریکی تھنک ٹینک اب عرب اور تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کو کس اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کیلئے سرگرم ہیں۔ انہیں کوئی غرض نہیں۔

اور یہ جنگ پھیلتی جا رہی تھی۔اپنی ایک میل میں اس نے لکھا تھا۔

اِس عقل کے اوندھے بشارکو کون سمجھائے کہ سیاسی مخالفت کا مطلب ہتھیاروں کو اٹھانا نہیں ہوتا۔سیریا کا جھگڑہ پر امن احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔اِسے لڑائی میں کیوں بدلنے دیا گیا؟ احمق مغرب کی چالوں کو نہیں سمجھتا۔جانتی ہو کتنے لوگ مارے گئے۔وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے اور دربدری کا المیہ تم دیکھتی ہی ہوں گی۔

اور یہ اِس کی نیٹ پر باتیں تھیں۔جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ عمیدی کہیں نہیں بھاگی۔دمشق میں رہی۔کیونکہ دمشق سے اُسے عشق ہے۔لینن گراڈ کے اُسے بوڑھے موسیقار کی طرح جو سمجھتا تھا کہ وہ اگر شہر سے چلا گیا تو فصیلِ شہر گر جائے گی۔اپنے خوبصورت ملک کے خوبصورت شہروں کو عراق کے شہروں کی طرح کھنڈر بنتے دیکھتی اور اپنے دکھوں کو لفظوں کے ہاروں میں پرو پرو کر اس کا اظہار کرتی رہی۔

دمشق خوبصورتیوں، پرانی اور نئی تہذیبوں کا شہر
آہ روشنیوں کا شہر مگر اب بجلی نہیں

چنبیلی جیسی کلیوں کا شہر،مگر اب پانی نہیں
محبتوں کا شہر،مگر دوستوں سے خالی
تاریخ سے بھرا شہر مگر مستقبل سے خالی

وہ ہمسائیوں کو آواز دیتی ہے اور سنتی ہے سارے شہر میں پانی نہیں۔بجلی نہیں،گیس نہیں۔تب دکھ نس نس اور رگ رگ سے پھوٹتا ہے۔پھر وہ معصومیت سے خود سے سوال کرتی ہے۔ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔دمشق میں فیجا Fijeh چشمہ سلامت رہے۔اس نے تو شہریوں کا ہمیشہ خیال رکھا تھا۔

پھر جیسے وہ ماضی کی یادوں سے حال میں آتی ہے۔میں اسلامی کیلنڈر کے صفحات الٹتی ہوں۔جو میری کچن کی دیوار پر آویزاں ہے۔دو ماہ بعد رمضان ہے۔میرے بچپن کے رمضان کی خوبصورت یادیں اپنی پوری توانائی سے میری آنکھوں سے باہر جھانکی ہیں۔کیسے دل موہ لیتے منظر تھے۔افطاری کے کھانوں کی خوشبوئیں۔اذان کی پرسوز آواز،تراویح کی رونقیں۔ٹپ ٹپ آنسو آنکھوں سے گرتے ہیں۔یہ رمضان کیسا ہوگا؟

صُبح کے منظر رلا دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں
سزا دی گئی ہے
میں کیسے بتاؤں کہ
دمشق کے رمضان کی مقدس راتیں
مگر رنگین لالٹینوں اور قمقموں کے بغیر

اب
خاموشیوں کو توڑتی ذکر کی آوازیں نہیں
دمشق میرے خوبصورت شہر
زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہوگئی ہے

جو لوگوں کے دلوں میں ڈوبتی ہے
بڑی ہی آتشیں دھمکیوں کے سگنل دیتی
اداسی اور مایوسی کی لہروں کو پھیلاتی
گھپ اندھیروں میں گم ہوتی

یہ جولائی 2014 ہے اور وہ لکھتی ہیں۔

میں شہر کا چکر لگانے کا ارادہ کرتی ہوں۔ اپنی گلی کے ہمسائیوں کے دروازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ہوا کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور بین کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ بند دروازوں پر دستک میں درد کی ایسی چیخ ہے کہ جیسے وہ اچانک کسی میٹھے مسحور کن خواب سے جاگی ہے اور اُسے یہ کربناک احساس ہوا ہے کہ اس کے مکین ہمیشہ کے لیئے کہیں چلے گئے ہیں۔ میرا یہ شہر جو کبھی لوگوں سے بھرا پُرا ہوتا تھا۔ زندگی کی گہما گہمی سے ہنستا مسکراتا جانے کہاں گم ہو گیا ہے؟ امیدوں سے بھرا میرا یہ بلاد الشام مایوسیوں اور ناامیدیوں کے پاتال میں گر پڑا ہے۔ دیکھئیے تو یہ درد مونا کے شعروں میں کیسے در آیا ہے۔

ہش ہش
قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھتی ہے
تالے کے سوراخ میں چابی گھومنے کی آواز
کہیں خوشی و مسرت کا در کھلنے کی امید
ہمیشہ رہنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی آرزو
نہیں نہیں
اردگرد صرف تاریک سائے منڈلاتے ہیں
دروازے کے سوراخوں سے ہوا سیٹیاں بجاتی ہے
خاموش دروازہ بند رہتا ہے

اپنی افسردگی کو گلے سے لگائے
کھلنے کا خواب دیکھتے ہوئے

دمشق کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے میرا دل دُکھ اور یاس سے بھر جاتا ہے۔ ہر کوئی ملک سے بھاگ رہا ہے۔ آپ باہر نکلتے ہیں خوبصورت گھروں کے دروازے بند ہیں، کھڑکیاں بند ہیں۔

میں رک جاتی ہوں۔ دروازے جیسے مجھے کہتے ہیں ہم اپنے مکینوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کب واپس آئیں گے؟

ضروریات زندگی کی چیزیں بمشکل خرید کر ایک پارک میں تھوڑا سا ستانے کیلئے آ بیٹھی ہوں۔ یہاں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ بحث ومباحثے میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ اب کس کی شیل بننے کی باری ہے۔

ان کا یہ کھیل مجھے میرے ان دنوں میں لے گیا ہے جب ہم بھی یہی کھیل کھیلتے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اب کی کس کی باری ہے۔ چڑیل، جادوگر یا سپاہی بننے کی۔ لیکن یہ شیل shell۔ میں بیک وقت اُداس اور پریشان ہوگئی ہوں۔ پھر جیسے شیل میرے تصور میں ابھرا ہے اور وہ اپنے موت کے سفر کا احوال بیان کرتا ہے۔

شیل کا سفر
جیسے شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کا سفر
انہوں نے مجھے دور اور نزدیک مارنے کے لئیے چنا
میں دہکتا گولہ سا دمشق کا چکر لگاتا ہوں
کہیں میناروں کہیں گھاٹیوں پر سے
اوپر اور نیچے
مصروف لوگوں کو ادھر اُدھر پھرتے دیکھتے
خوش وخرّم بچے یہاں وہاں پھرتے

جونہی اچانک میں نیچے اُترتا ہوں
ایک زبردست جھٹکے کے تعاقب میں چیخیں اور کراہیں
اس کے بعد کیا ہوا
میں نہیں جانتا

زارزار بہتے میرے آنسوؤں نے اُن ناموں کو دھندلا دیا ہے۔ جو میں گلیوں کی دیواروں پر لکھے دیکھتی ہوں۔ ان نوجوانوں کے نام جن کی ابھی شادیاں ہوئی تھیں۔ اُن کی دلہنیں کہاں چلی گئی ہیں؟ کتنے بیٹے اور بیٹیاں اپنے والدین کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ جب وہ لکھتی ہے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک برسات ہے۔

شیلز shells چھتوں اور فرشوں پر بارش کی صورت برس رہے ہیں
دیواروں پر مرنے والوں کے نام لکھے ہوئے ہیں
دلہنیں تو رات بھر میں ہی بیوہ ہو گئی ہیں
بچے محاذ جنگ سے باپ کی واپسی کے منتظر ہیں
جہاز طوفان کی مانند بمباری کر رہے ہیں
کہیں بچے سکول بیگوں کے ساتھ
کہیں لوگ شاپنگ بیگز کے ساتھ
خون میں لتھڑے پڑے ہیں۔

29 دسمبر 2014 کو اس نے لکھا۔
لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی شہر میں اجنبی ہوں۔
اجنبی
جس نے اپنے خوابوں کو
چوما اور شب بخیر کہا

پھر انہیں ڈھانپ دیا
اور خاموشی سے رخصت کر دیا
اپنی زندگی سے چلتے ہوئے نکل گئی ہوں
اب اور اسی وقت سے
میں تو خود سے اجنبی بن گئی ہوں۔

میری بیٹی ابھی ایک ٹرپ سے واپس آئی ہے۔غم زدہ ماحول کے باوجود وہ خوش ہے اور مسکراتی ہے۔وہ پرانے سٹیم انجن کے ساتھ اپنی دوستوں کے ہمراہ برادہ Baradaدریا کے کنارے کنارے منائے جانے والے اپنے ٹرپ کا احوال سناتی ہے۔

میں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی امید کی روشنی دیکھتی ہوں۔

میرے اِس اداس شہر کے باسیوں میں سے وہ لوگ جو موت نہیں زندگی کے دوسرے راستے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔اُس روشنی کو اِن آنکھوں سے چھلکتے محسوس کرتی ہوں۔

ہم ہیں
ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل
جو شیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقے لگاتی ہے
اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا
کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا
ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہوگئی ہیں
تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں
ہم وہ نسل جو کبھی کِسی دن کہیں گے
ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا

عمیدی کی نظمیں اور یادداشتیں حکومت شام کی سرکاری سطح پر اُن بڑھکوں یا نظم ونسق کی ابتری

کی یاوہ گوئیوں کی قلعی کھولتی ہیں جو حکومت نے اپنا طرزِ عمل بنالیا ہے۔

تاہم اس کی نظمیں اگر ایک طرف اس کے دکھوں کا اظہار ہیں تو وہیں وہ ہمارے لئے اس صبح کا بھی پیغام ہیں جو طویل اور تاریک رات کے بعد طلوع ہوگی۔اور جو ہم جیسے مایوس اور ناامید لوگوں کے لئے ایک نوید ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 28:

سارہ طلال

امید کا دامن نہیں چھوڑا ہم نے
گو رات ہے اور اندھیرا ابھی بہت ہے

شامی تاریخ میں اِس تباہ کن خانہ جنگی کی ابتدا جس شہر سے ہوئی وہ درعا ہے۔ میرا اور میرے خاندان کا تعلق اسی شہر سے ہے جو دراصل جنوبی شام کے علاقے کا ایک اہم صوبہ ہے۔ تاہم ہم اپنی ملازمت کے لیئے دمشق کے قریب رہتے تھے۔ میں اچھی تنخواہ کے ساتھ ایک پرائیوٹ کمپنی میں بطور سیکڑیری کام کرتی تھی۔

کوئی نہیں جان سکتا اسد حکومت کے خلاف میں نے اور میرے خاندان نے کتنی بھاری قیمت چکائی۔

مارچ 2011 میں عام لوگوں میں ایک اضطراب، ایک بے چینی اور غصے کا بڑھتا ہوا احساس ضرور محسوس ہوتا تھا۔ میرے لیئے بہرحال یہ بات حیران کن تھی کہ جب میں نے دیکھا لوگ دمشق کے عین دل میں اسد فیملی مخالف بینر اُٹھائے ہوئے نعرے لگاتے اور بشار کو لعن طعن کرتے نظر آتے تھے۔ سچی بات ہے جو آمرانہ اور جابرانہ طرز حکومت اسد خاندان نے اپنا رکھا تھا اس کے پیش نظر یہ بڑے دلیرانہ اقدام تھے۔

ایک باشعور اور تعلیم یافتہ شہری ہونے کے ناطے میں سمجھتی تھی۔ اُن کے مطالبات ہرگز ایسے نہ تھے کہ جن کے لیئے کہا جائے کہ وہ شر پسندی کو ہوا دینے کے لیئے تھے۔ سچی بات ہے ہم سفید پوش لوگوں پر جس طرح زندگی مشکل ہوگئی تھی وہ ایسی ہی تبدیلی کی متقضی تھی۔ کرپشن نے

زندگی کوعذاب بنا رکھا تھا۔ آپ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اِس کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی مثال سے واضح کرتی ہوں کہ ملازم پیشہ آدمی کی زندگی کتنی عذاب بنی ہوئی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ میں سیاسی اصلاحات کی طلب میں کئے گئے کچھ احتجاجی مظاہروں میں حصّہ لینے سے خود کو روک نہ سکی۔ حکومتی ردِعمل خوفناک حد تک صدمے سے دوچار کردینے والا تھا۔ ہمارے مظاہروں کا جواب گولیوں کی بوچھاڑ سے دیا گیا جو کہ سیکورٹی فورسز کی طرف سے چلائی گئیں۔

میرے خاندان والوں نے میرے اُن احتجاجی مظاہروں میں حصّہ لینے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ میرے شوہر ہی نہیں میری والدہ اور بھائی بھی بڑے جی دار تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ لوگ تو محض اصلاحات کا تقاضہ کررہے ہیں۔ اُن کا ساتھ دینا فرض بنتا ہے۔ لیکن سیکورٹی فورسز نے مظاہرین کو سختی سے مارنا شروع کردیا اور تحریک کے لیئے کام کرنے والوں کو تلاش کرنے کے لیئے گھروں پر دھاوا بول دیا۔

سارہ طلال کا کہنا ہے کہ اس نے ایسے قیدی دیکھے جنہیں بجلی کے جھٹکوں سے ایذا پہنچائی گئی تھی۔

بطور ایک خاتون کے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ شہیدوں کے خاندانوں اور بے گھر افراد کو جو ہمارے ضلع میں جوق در جوق آرہے تھے کی مدد کرنا بے حد ضروری تھا۔ مظاہرین اور حکومت مخالف لوگوں کی بڑی تعداد اپنی آمدنی کا ایک حصّہ سوگوار خاندانوں کے، بستروں، خوراک اور ادویات خریدنے کے لیئے استعمال کررہی تھی۔

مجھے یہ تب پتہ چلا جب سیکورٹی فورسز نے مجھے نشانہ بنایا۔ پانچ جوانوں نے آدھی رات کو ہمارے گھر نقب لگائی۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی۔ ہتھکڑیاں پہنائیں اور کسی کاٹھ کباڑ کی طرح گاڑی میں پھینکا۔ مجھے ایئر فورس کی سیکورٹی برانچ میں لے جایا گیا۔

یہاں صبح 6 بجے سے شام 7 بجے تک پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ مجھ سے تمام قسم کے سوالات براہِ راست پوچھے گئے۔ تم کس گروہ کے لیئے کام کرتی ہو؟ تمہیں کون اُکسا رہا ہے؟ کون تمہیں فنڈ دے رہا ہے؟ تمہارے ساتھی لوگ کون ہیں؟ میرا جواب تھا کہ میرا کِسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی محنت کش عورت اپنے اردگرد کے لوگوں کو پریشانی اور مصیبت میں دیکھ کر ان کی مدد کیئے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟ کیا کِسی کی مدد کرنا جرم کے کھاتے میں آتا ہے۔

تفتیشی افسر نے کہا:

''نہیں تم (جہادیوں) کے خاندانوں کی مدد کر رہی ہو جو تمہارے ضلع میں چھپے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا: ''اگر آپ ایک عورت کو ایک بھوکے بچے کے ساتھ دیکھتے ہو تو آپ اس کی مدد کریں گے یا نہیں کریں گے؟''

تمام خاندان تو احتجاج نہیں کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اپنی حفاظت کے لیئے اپنے شہر چھوڑ چکے تھے۔ ایک دوسرے افسر نے اعتراض کیا۔

تب ایک سیکورٹی آفیسر نے انٹرنیٹ پر دیکھا اور اسے یہ پتا چلا کہ میں نے چند ایک احتجاجی مظاہروں میں حصّہ لیا تھا۔

اب تفتیش کے طریق کار نے نئی شکل اختیار کر لی تھی اور یہ تشدد تھا۔ ہر سوال کے جواب پر میرے منہ اور سر پر گھونسے اور بوٹ مارے گئے۔ وہ مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ میں اعتراف کرلوں کہ میں ان جہادیوں کے ساتھ تھی۔

میں نے انہیں کہہ دیا: ''میں اس جرم کو تسلیم نہیں کروں گی جو میں نے کیا ہی نہیں۔''

عجیب سی بات تھی کہ ایک عورت جو کبھی تھانے کچہریوں کے چکروں میں نہیں پڑی اب

کیسے ایک ڈراؤنے ماحول میں بڑی جی داری اور متامت سے کھڑی ان کے ہر سوال کا مار پیٹ کے باوجود تر کی بہ تر کی جواب دیتی تھی۔۔اس کمرے میں چار سیکورٹی افسر تھے جو مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے اور منہ سے گالیاں بک رہے تھے۔

مجھے عورتوں کے لئیے مخصوص ایک چھوٹے کمرے میں پھینک دیا گیا۔صبح کے وقت ناشتے میں ڈبل روٹی کے سلائس ایک اُبلا ہوا انڈا یا گلاسٹرا آلو۔کھانے میں شوربہ،ٹماٹر اور کھیرا دیا جاتا۔کمرے میں ایک نلکا تھا لیکن ڈیڑھ ماہ ہو رہا تھا۔ہم نے غسل نہیں کیا تھا۔

کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا ہے اُن کربناک دنوں کا جن میں میرے شب و روز گزر رہے تھے۔سورج کب طلوع ہوتا ہے،کب رات ہوتی ہے۔میرا ملک ابتلا و آزمائش کی اِن گھڑیوں سے کیسے گزر رہا ہے؟ میری والدہ بہن بھائی کیسے ہیں؟ میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ دو ماہ سے میں نے اپنے گھر والوں کو نہیں دیکھا تھا۔

کچھ قیدی خواتین ان کی تفتیشوں کے نتیجے میں لائی گئی تھیں جنھوں نے بتایا کہ انہیں تعاوُن نہ کرنے کی صورت میں عصمت دری کی دھمکی دی گئی تھی۔کچھ قیدی عورتوں کو علیحدہ کمروں میں رکھا گیا جو کہ سیکورٹی برانچ کے تہہ خانے میں واقع تھے۔میں نے دو یا تین ایسی قیدی عورتیں بھی دیکھیں جنہیں بجلی کے جھٹکوں سے اذیت پہنچائی گئی اور پانچ ، چھ ایسی تھیں جو دوبارہ نظر ہی نہیں آئیں۔

چالیس دن بعد جیلر نے میرے ہاتھ اور پاؤں جکڑ دیئے۔تاہم میری آنکھیں کھلی چھوڑ دی گئیں۔مجھے نو قیدی مردوں کے ساتھ جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں اور انہیں شدید جسمانی اذیت دی گئی تھی۔انہوں نے صرف انڈر وئیر پہنے ہوئے تھے۔دمشق کے شمال مشرق میں واقع آدرا جیل لے جایا گیا۔اس قید خانے کے چھ شعبے تھے جن میں بڑے کمرے تھے۔مجھے 30 دوسری خواتین کے ساتھ ایک کمرے میں قید کیا گیا جہاں ایک غسل خانہ تھا۔ہم ننگے فرش پر

سوتے اور کیمروں سے ہماری نگرانی کی جاتی۔

شاید یہ بڑا بھا گوان دن تھا۔ قید کے اِس سارے دورانیے میں پہلا موقع جب میرا اپنے گھر والوں سے رابطہ کروایا گیا۔ ایک ماہ بعد مجھے ایک جج کے سامنے پیش کیا گیا اور کچھ کاغذات پر میرے دستخط کرائے گئے۔ اگر چہ میں نہیں جانتی کہ ان میں کیا لکھا تھا۔ جج نے مجھے ضمانت پر رہا کر دیا۔

میں دوسری آٹھ عورتوں کے ساتھ رہا ہوئی تھی۔ میری ماں اور میری بہن قید خانے سے باہر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ لیکن وہاں میرا بھائی عدیل نہیں تھا۔ جو کہ ایک ہائی سکول میں استاد تھا۔ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور گلے لگیں۔ عدیل کہاں ہے؟ بیتابانہ میرے سوال پر میری بہن نے مجھے بتایا کہ سیکورٹی فورسز نے اسے سوتے ہوئے اس کے بستر سے اٹھا لیا تھا۔ اس پر مجاہد ہونے کا الزام تھا۔ اگلے دن ہمارے دروازے کے سامنے عدیل کی لاش پڑی تھی۔ میرا سب سے بڑا بھائی یاسر دو سال پہلے اٹھا لیا گیا تھا۔ لیکن گھر والوں کو آج تک اس کے بارے میں کوئی اشارہ نہ ملا تھا کہ وہ زندہ ہے یا اُسے مار دیا گیا ہے۔

اس خوف کے ساتھ کہ کہیں میں دوبارہ گرفتار نہ کر لی جاؤں میں کچھ عرصہ گھر پر ہی قیام پذیر رہی۔ ہم کسی ایک جگہ پر زیادہ دیر تک قیام نہ کرتے۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں آنا جانا لگائے رکھا۔ اپنے عزیز و اقارب کے ہاں کچھ عرصہ بعد میں یو این میں رجسٹر ہونے کے لئیے لبنان غیر قانونی طور پر چلی گئی۔ لیکن میں خود کو لبنان میں بھی محفوظ محسوس نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس وہاں رہائش کا قانونی اجازت نامہ نہیں تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ گھر پر ہی رہتی تھی۔ اس کا پاسپورٹ اور رہائش کا اجازت نامہ بھی زائد المعیاد ہو چکے ہیں۔

دو ہفتے پہلے ہمیں ایک ٹیلی فون کال سے پتہ چلا کہ نیدر لینڈ نے ہمیں قبول کر لیا ہے کیوں کہ میری ہمشیرہ وہاں کئی سالوں سے رہ رہی ہے۔ میری ماں اور میری بہن میری بھابیوں

کے ساتھ اور ان کے بچوں کے ساتھ دمشق میں ہی قیام پذیر رہیں۔ میری ماں ابھی بھی امید کرتی ہے کہ اسے میرے گرفتار کیئے ہوئے بھائی کے بارے میں کچھ پتہ چلے گا۔

میرا ایمان ہے کہ ہمارا انقلاب ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ جب ہم گلیوں میں احتجاج کرتے تھے تو ہم یہ توقع نہیں کرتے تھے کہ حکومت شامی لوگوں کے خلاف اتنی شدید قوت استعمال کرے گی۔

ہم نے احتجاج شام میں ذاتی مقاصد یا انتشار پھیلانے یا دہشت پیدا کرنے کے لیئے نہیں کیا تھا۔ ہم عدل چاہتے تھے۔ ہمیں انصاف کی تمنا تھی۔ ہم اُن بنیادی سہولتوں کے متمنی ہیں جو انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ یہ حق ہمیں کب ملتا ہے؟ دیکھیں۔

☆☆☆

باب نمبر 29:

درعا

(شام کا وہ شہر جہاں اِس خانہ جنگی کی چنگاریں پھوٹیں)

- خوبصورت ملک کو تباہی کے گڑھے میں پھینکنے والی آگ کا آغاز درعا کے ایک اسکول کے بچوں کے باغیانہ نعروں سے ہوا۔
- شام کے جنوبی حصوں کا حُسن ،ان کی قدامت اور تاریخی کہانیاں اس کا حُسن ہیں۔
- پہلی اننگز میں فوج نے احتجاجیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔
- ''کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میری یہ چھوٹی سی غلطی میرے ملک اور میرے لوگوں کو بھسم کر دے گی۔'' معاویہ صیاصنہ کا دکھی اعتراف

شام کے جنوبی حصوں کے حُسن اور وہاں مختلف النوع تہذیبوں کے عروج زوال کی کہانیاں اور اُن کی پس ماندہ اور گم شدہ باقیات کے حُسن و جمال اور انوکھے پن کے قصوں کے تذکرے ایک دو سے نہیں بہتوں سے سنے۔ احمد فاضل کا کہنا تھا سیر یا جنوب کے بغیر ادھورا ہے۔ حتیٰ کہ مونا عمیدی نے بھی کہا۔

''شام کے جنوب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق کو دیکھے بغیر نہ جانا۔''

پس تو پھر لازم ٹھہرا کہ علی سے بات کی جائے۔ اور اس کا تو وہ حال کہ جسے کہیں چور نالوں پنڈ کاہلی۔ اب زینبیہ کے ٹیکسی والوں سے بھی خاصا یارانہ ہو گیا تھا۔ پر وہ جو ابوالعباس

تھا پیبا اور محبت والا ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا بھی بڑا اچھا تھا۔ ڈنڈی مارنے کی قطعی کوشش نہ کرتا تھا۔ دانت نکالتے اور ہنسی آنکھوں میں بھرتے آیا اور ساؤتھ کا جانے کا سن کر بولا تھا۔

''بہت اچھی طرح سے لے کر جاؤں گا۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کچھ دکھا دوں گا اور بتاؤں گا بھی بہت کچھ۔ آپ کو تو میرا اچھا بھلا اندازہ ہو ہی گیا ہے۔ مگر میرا خیال رکھنا ہے۔''

ہم چاروں ہنس پڑے۔

''تو پہلے نہیں رکھتے کیا؟''

فاطمہ تنک کر یوں بولی کہ کسی اور کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

تو پہلی بات یہ بڑی اہم ہے کہ بُصریٰ Bosra رومن صوبے کا دارالخلافہ ہی نہ تھا بلکہ مکہ جانے اور مکہ سے آنے والے تجارتی قافلوں کا بھی یہ پڑاؤ گھر تھا۔

مکے کے نام میں جو روحانی کشش ہے وہی شوق کو مہمیز کرنے کو کافی تھی۔ مگر معلوم ہوا تھا کہ اِس بُصریٰ کے ساتھ تو اور بھی بہت سی دل کو چھونے والی کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی جب عباس نے یونانی، رومن اور نباتین Nabatean زمانوں کے گرجا گھروں، محلوں اور گاؤں، قصبوں شہروں کا تذکرہ شروع کیا تو جیسے سکینہ دفعتاً بول اُٹھی۔

''ارے ہاں ہاں مجھے یاد آیا ہے میں نے اِن کی بابت اپنے سکول کے زمانے میں تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا۔ یاد آ رہا ہے۔''

میں نے حیرت سے فاطمہ کو دیکھا تھا۔ ہم نے اپنے سکول کی کسی تاریخ جغرافیہ کی کتاب میں یہ حال احوال نہیں پڑھا تھا۔ یہ کس سکول کی پڑھی ہوئی ہے؟

فاطمہ کو میری آنکھوں میں جو نظر آیا تھا اس نے اُسے فوراً وضاحتی بیان جاری کرنے کے لئے کہا تھا۔

تو بھئی ماننا پڑا کہ فاطمہ سرگودھا کونونٹ کی سینئر کیمرج پاس تھی۔ اس نے یقیناً پڑھا ہوگا۔ ہم ٹٹ پونجیئے ٹاٹ سکولوں کے بچوں کو اُن کے محدود اور رَٹے والے سلیبس اتنا علم کیسے دیں۔ سوچنے کی بات تو تھی۔

تاہم سوچنے کا تو وقت ہی نہیں تھا کہ گاڑی خان دانون Khan Dannoun نامی ایک مستطیل صورت کی دومنزلہ عمارت کے سامنے رُک گئی۔ پرانے وقتوں کی سرائے اپنے کشادہ صحن، خوبصورت برآمدوں، کیاریوں میں اُگے پھول پیڑوں اور اپنے قدیمی تاریخی حُسن کے ساتھ سامنے تھی۔

کیسی ظرف والی عمارت تھی کہ یہاں پورے کے پورے کاروان بمعہ ان کے مال واسباب، گھوڑوں گدھوں اور خچروں سمیت اس میں سما جاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کا زمانہ، سراؤں کا کلچر اپنے عین عروج پر۔ تاجروں کے قافلے اور اُن میں قیام کی حسین شامیں اور راتوں کے پہلے اور دوسرے پہروں کا حُسن اور بانکپن۔

تصور کی آنکھیں دیکھتی تھیں وہ منظر جب اِن کشادہ آنگنوں میں آلاؤ جلتے۔ سازندوں کی ٹولیاں سازوں سے کھیلتیں اور مغنی کی آواز کہ جیسے شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو جیسے محاورے کی عکاس لگتی تھی۔ رقاصاؤں کے پہناوے، ادائیں اور رقص کے انداز برق بن کر مسافروں کے دلوں پر یوں گرتے کہ دل می رودز دستم صاحب دلاں خدارا کسی منچلے کی پکار اِس ماحول میں گونج جاتی تھی۔ مرغن کھانے اور جام کے دور، بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ پڑھا ہوا کیا کیا نہ یاد آیا۔

سینیمن Sanamein سٹی پر رُک کر عباس نے وہ رومن مندر دکھایا جو ملحدوں کا ضرور تھا لیکن یونانیوں کی قسمت کی دیوی ٹیکا Tekke کے نام مخصوص تھا۔ خوبصورت طرز کا تھا۔ طاق و در کی ساخت کمال کی تھی۔ یہاں ہم نے چائے پی۔ بسکٹ کھائے۔ تھوڑا گھومے پھرے۔

تھوڑا آگے بازنطینی دور کی چند اور یادگاریں شیخ مسکن Miskin اور ازرا Izraa دیکھنے کو ملے۔ مار جورجئیس Georgius کا چرچ دیکھا۔ یہ یادگاریں اس وقت کی ہیں جب شہنشاہ کونسٹینن نے عیسائیت کو اپنایا تھا۔ شام کا سب سے قدیم گرجا گھر کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے چھوٹے پتھروں کی دیواروں والا صلیب کے نشانوں سے سجے اُس کے طاق و در کے ماتھے نامانوس سی تحریروں کی ماتھا پٹیوں سے سجے بہت اچھے لگے تھے۔

عباس نے لمبا چوڑا لکچر دینا چاہا۔ میں نے روکا اور کہا۔

''عباس تم نے اچھا کیا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع یہ یادگاریں ہمیں دکھادیں۔ کچھ بتا بھی دیا۔ مگر اب آگے بڑھو۔ وقت کم اور چیزیں بہت ہیں۔''

تاریخ کا یہ ورثہ یہ خزانہ ایک دوسرے سے قریب قریب واقع ہیں۔ درمیان میں کہیں چھ، کہیں بارہ اور کہیں سولہ کلومیٹر حائل ہیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد گاڑی سے اُترنا، گھومنا پھرنا ہمیں بھی لطف دے رہا تھا۔

درعا Dara سرسبز شاداب ہرے بھرے کھیتوں کے سلسلوں سے نہال، جا بجا انگوروں کی بیلوں سے لدا نظر آیا۔ پرانا نام تو ہوران (Hawran) تھا۔ شدید موسمی شدتوں کا شکار علاقہ مگر قدرت نے بھی نوازنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ اناج کا گھر بنایا ہوا ہے۔ صدیوں پہلے بھی اور آج بھی۔ تب یہ روم کی روٹی کی ٹوکری تھا اور آج شام کا اناج گھر۔ جسے اللہ یہ سعادت بخشے۔

پتہ چلا تھا کہ یادگاریں تو بے شمار تھیں۔ پر قدرت کے بے رحم عناصر کہیں زلزلے، کہیں مہیب آندھیاں، کہیں آگ، کہیں جنگیں سبھوں نے اِس کی یادگاریں مٹانے میں اہم کردار ادا کیے۔ بہر حال مکہ کو جانے والی ایک تنگ سی پٹڑی دیکھ کر ضرور آنکھیں ٹھنڈی کیں کہ یہی الحجاز ریلوے تھا جس سے بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں حجاج کے قافلے سفر کرتے تھے۔

جس کا تیا پانچہ کرنے میں لارنس آف عریبیا نے مرکزی کردار ادا کیا۔ درعا بہت خوبصورت شہر ہے۔ہم نے اس کے پرفضا ماحول میں واقع ریستوران پر گاڑی رُکوا کر چائے اور سنیکس کھائے اور عباس سے جانا کہ ایسی خوبصورت سرسبز جگہوں کو عربی میں غوطے کہتے ہیں۔

درعا اُردن کا ہمسایہ ہے۔ چھلانگ مارو اور اُردن پہنچ جاؤ۔ جی تو چاہا مگر مسئلہ وہی کاغذ نہیں تھا پاس۔

یہ مارچ 2011 کے دن تھے جب اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر نے متوجہ کیا۔شام کے جنوبی شہر درعا میں احتجاج ۔احتجاجیوں پر فائرنگ ۔میں نے احمد فاضل کو میل بھیجی۔ میں نے لکھا تھا۔

احمد یہ مارچ کے خوبصورت نشیلے سے دن ہیں۔کھلے کھلے روشن روشن سے۔گلاب کے پھولوں اور چنبیلی کی کلیوں میں مہکتے ہوئے بچپن، جوانی اور اُدھیڑ عمری کے اِن دنوں کی جاذبیت اور حسن کی کیا مداح سرائی کروں کہ جب دلوں میں امنگیں اور ولولے انگڑائیاں لیتے تھے۔میرا ملک امن وسکون کے ہنڈولے میں جھولے لیتا تھا۔مگر اب بہار کی رعنائیاں خون کے پانیوں میں تیرتے ہوئے آتی ہیں۔دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے، کب کہیں سے کوئی تڑپا دینے والی خبر آ جائے۔

چلو ہم تو اِس عذاب سے گزر رہے تھے مگر تمہارے ہاں کیا بات ہوئی؟

احمد مجھے لکھو اس خبر نے مجھے بے کل کر دیا ہے۔میں تو اِن دنوں ذہنی طور پر سیریا میں رہتی ہوں۔لکھ رہی ہوں نا اس پر۔ مجھے تمہاری میل کا شدت سے انتظار رہے گا۔

اور درعا کے دلکش نظاروں کی آب وتاب پر اُس وقت خون کے چھینٹوں کا چھڑکاؤ ہو گیا جب احمد فاضل کی ای میل مجھے ملی۔اس نے لکھا تھا۔آپ وہاں گئی تھیں۔درا کتنی خوصورت جگہ تھی۔اُن باغ بہار جگہوں جہاں چنبیلی کی خوشبوئیں ہر سو بکھری رہتی تھیں جہاں آبشاریں ماحول کا

حُسن بڑھاتی تھیں۔ جہاں پہاڑ، میدان سبزہ، درخت لہلہاتی فصلیں اور توانا خوبصورت لوگ بھر پور زندگی کا احساس دلاتے تھے۔ وہاں آگ بھڑک اٹھی ہے۔شعلوں نے قیامت بر پا کر دی ہے۔ بندوق کی گولیوں نے زندگی ارزاں کردی ہے۔کیا تھا؟ سکول کے نوخیز، جوشیلے بچوں کا احتجاج۔ان کے باغیانہ اور حکومت سے نفرت و بیزاری کا سکول کی دیواروں پر اظہار۔اپنے اور اپنے والدین کے مسائل اور مشکلات کا ذکر۔

میں نے تفکر سے یہ سب پڑھا تھا اور تب کیا پل کے لئے نہیں سوچا تھا کہ یہ آگ پورے ملک کو لپیٹ میں لے لے گی یوں کہ تاریخ کی ہڈیوں جوڑوں میں اُترا ہوا ملک خوفناک اور لرزا دینے والے منظروں کی زد میں ہوگا۔

میں نے دھیرے سے آنسوؤں کو صاف کیا اور ماضی کے اُس خوبصورت دن کے ان خوبصورت لمحوں میں لوٹ گئی ہوں جب میں درعا میں تھی۔لوگ میری بصارتوں میں چلے آئے تھے۔ان کی آوازیں میری سماعتوں میں گونجنے لگی تھیں۔

مزے کی بات کہ جتنے لوگوں سے باتیں ہوئیں سب تعلیم یافتہ، بیدار مغز اور سیاسی شعور سے بہرور نظر آئے۔

یہ سب عباس کے جاننے والے تھے۔ مدھم لہجے میں ذرا دبے دبے انداز میں بات کرتے تھے۔عباس کس شہہ تھی کہ کھل کر بات کرو۔اکثریت بشار کے آمرانہ اقدام کو پسند نہیں کرتی تھی۔ایک اُدھیڑ عمر کے مرد نے قدرے تلخی سے کہا تھا۔

''دراصل جمہوریت کسی بھی ملک کا حُسن ہے۔ یہاں پہلے باپ نے ہمیں غلام بنائے رکھا۔اب بیٹا ہمارے سروں پر سوار ہوگیا ہے۔ایسا کب تک چلے گا؟ وہی ان کے عزیز رشتہ دار چہیتے، ملک کے وسائل لوٹ رہے ہیں۔

ایک نوجوان لڑکے کی بات کتنی خوبصورت تھی۔ہم لوگ ان کے چہرے دیکھ دیکھ کر تنگ

آ گئے ہیں۔کائنات کی ہر شے تبدیلی کی مظہر ہے۔انسان اپنے روزمرہ کے معمولات میں یکسانیت کو پسند نہیں کرتا۔ہم نئے لوگ، نئے چہرے، نئے خیالات اور نئی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔

میں نے پیار بھری نظروں سے لڑکے کو دیکھا تھا۔اور خود سے کہا تھا۔

''سیریا کا مستقبل یہی تو ہیں۔''

احمد فاضل کی ای میلوں نے جو تصویریں کھینچی تھیں وہ تڑپاتی تھیں۔ہائے تب کاش کچھ جان لیتی۔کاش چھ سال بعد کے آنے والے واقعات کی کوئی ایک چھوٹی سی جھلک ہی دیکھ لیتی۔شاید پھر میں البنین ہائی اسکول کی عمارت کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔اُن بیرونی دیواروں کو دیکھتی جہاں بچوں کی چھوٹی سی شرارتیں اِس چھ سالہ جنگ کا پیش خیمہ بن گئیں۔جس میں تین لاکھ افراد ہلاک ہوگئے اور دو کروڑ دس لاکھ آبادی والے ملک کا تقریباً چوتھائی حصّہ دربدری کی بھینٹ چڑھ گیا۔

معاویہ صیاصنہ فروری کی خوشگوار خنکی لئے اُس صبح بیدار ہوا تھا تو اس کے اندر کہیں کوئی اضطراب یا کوئی بے چینی نہ تھی۔آنے والے منحوس واقعات کے سائے کا کوئی ہلکا سا عکس بھی چہرے پر سایہ فگن نہ تھا۔چودہ سالہ لڑکے نے سپرے کی نئی بوتل اپنی الماری سے نکال کر بیگ میں ڈالی۔آج کلاس کے لڑکوں کا پروگرام یہ کھیل کھیلنے کا تھا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے سکول اسمبلی میں جب بھی اُن سے بعث حکومت کے حق میں نعرے لگوائے جاتے وہ چند دوست شرارتاً اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیتے۔بشار اور اس کے باپ کے بڑے بڑے پوسٹر فریڈم سکوائر میں ٹنگے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔مگر چپکے چپکے اشاروں کنائیوں میں۔اپنے بڑوں کی طرح انہیں بھی پتہ تھا کہ خفیہ کے لوگ بہت متحرک ہیں اور کون ان کا بندہ ہے کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔وہ گزشتہ کچھ عرصے سے مصر اور تیونس میں ہونے والے ہنگامے

ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ دل میں اپنے ہاں بھی انقلاب کی آرزو پالتے تھے اور امید کرتے تھے کہ کچھ ایسی ہی بیداری کی لہر شام میں بھی آئے گی۔

معاویہ پڑھنے میں تیز ذہین بچہ تھا۔ سکول آف ہونے کے بعد اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکول کی دیواروں پر سیاہ رنگ سے یہ الفاظ سپرے کرتے ہوئے لکھے۔

''اے ڈاکٹر (بشار) اب تمہارے جانے کی باری ہے۔''

اپنے ایک انٹرویو میں اُس نے کہا۔

''اس وقت جب ہم قہقہے لگاتے اور ہنستے تھے۔ ہم نے کیا ایک لمحے کے لئے یہ سوچا تھا کہ ہم کتنی بڑی جنگ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ کاش ہمیں اس کا تھوڑا سا بھی ادراک ہو جاتا تو یقیناً ہم کبھی ایسی حرکت نہ کرتے۔''

رات کو گھر کے دروازے بجے تھے۔ معاویہ کے والد آرکیٹیکچرل انجینئر تھے۔ انہوں نے پولیس کے لوگوں کو معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

تین دن بعد خفیہ ایجنسی کے لوگ اُسے سوتے ہوئے کو اٹھا کر لے گئے۔

دمشق میں بدنام زمانہ دہشت ناک سیل میں اُسے رکھا گیا۔ جہاں تاروں سے مارا جاتا۔ یخ پانی میں بٹھایا جاتا۔ بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے، کلائیوں سے سیل کی چھت سے لٹکایا جاتا۔ حتیٰ کہ معصوم چودہ سالہ بچے نے اپنے ساتھیوں کے نام اُگل دیئے۔

ان بچوں کو بھی اسی طرح اٹھا کر ایسی ہی سختیوں سے گزارا گیا۔

درعا کے لوگوں کا احتجاج اور مظاہروں نے شدت اختیار کی۔ فوج آئی اور مظاہرین پر گولی چلائے بغیر واپس چلی گئی۔

فوج کے آنے اور مظاہرین پر گولی چلانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ کرنل عفیف بزنجی جیپ سے اُترا۔ شہر سے باہر کھلے میدان میں لوگوں کا ایک جم غفیر جمع نعرے لگاتا اور للکارتا

تھا۔

اُس نے پل بھر کے لئے سوچا، انہیں دیکھا اور خود سے کہا۔

''وردیوں میں جو لوگ گاڑیوں سے اُترے ہیں وہ کون ہیں؟ سب شامی، اسی دھرتی اور اسی مٹی کے بیٹے اور اس کے رکھوالے۔ اور جن پر گولیاں چلانے کے لئے آئے ہیں اُن کا جرم کیا ہے؟ اور وہ کون ہیں؟'' اندر نے جواب دیا تھا۔

''وہ تو بچے تھے جنہوں نے سکول کی دیواروں پر سپرے کا کھیل کھیلتے کھیلتے بشار کو جانے، ہمیں جمہوریت چاہیے، ملک کو انقلاب کی ضرورت ہے جیسے نعرے لکھ دیئے تھے۔ وہی تو اِس گلستان کے پھول ہیں۔ اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ اثاثہ ہیں۔ اس کے نونہال ہیں۔ یہ اُن کے بچوں جیسے ہی تو ہیں۔

کرنل بزنجی بخوبی جانتے تھے کہ ان کے ساتھ ٹارچر سیلوں میں کیا کچھ ہوا تھا۔ اِس خیال نے سوچوں پر غلبہ پا لیا تھا کہ اگر ان کے بچوں کے ساتھ ایسا ہوتا تب؟

کرنل بزنجی کی یادداشتوں کی سطح آب پر روس میں اپنے ایک فوجی پیشہ ورانہ تربیتی کورس کے دوران اپنے ایک روسی دوست سے سنا ہوا ایک واقعہ ابھر کر سامنے آیا۔ ستر کی دہائی کے آغاز کا واقعہ جب سوویت کے جنوبی حصّے کے ایک شہر نووچرکاسک کے ایک بہت بڑے کارخانے میں بڑی دھماکہ خیز بغاوت ہوئی تھی۔ وجوہات غریب آدمی کی زندگی کو تنگ کرنے کے حربے تھے۔ گھروں کی فراہمی کا تقاضا تھا۔ گوشت، مکھن کی قیمتوں میں بہت اضافہ کر دیا گیا تھا۔

کام چھوڑ کر چودہ ہزار مزدور باہر نکلا تو شہر کا چوتھائی حصہّ بھی اُن کی حمایت میں ساتھ ہو لیا۔ مقامی پولیس کے سپاہی آئے تو اُلٹا انہیں منتشر کرنے پکڑ دھکڑ کرنے کی بجائے انہیں ہلاّ شیری دینے، اُن کا حوصلہ بڑھانے اور اُن کی پیٹھ ٹھونکنے میں جُت گئے۔ شہر کی انتظامیہ نے فوج بلا لی۔ اب ایک نیا اور انوکھا تماشا دیکھنے کو ملا۔ ٹرکوں اور جیپوں سے فوجی جوان اور جونیئر افسر

چھلانگیں مار کر اُترے اور سیدھے جا کر ہڑتالیوں کے گلے لگے۔ اُن کے منہ ماتھے چومے اور بولے ڈٹے رہنا۔ اِن حرامزادوں کو مزہ چکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ زاروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

انہوں نے بندوقیں اٹھائیں۔ فضا میں لہرائیں۔ خالی فائر گئے اور بلند آہنگ نعروں کے ساتھ یکجہتی کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ تو غریبوں کو مار دینا چاہتے ہیں۔''

اب کریملن میں تو بھونچال آ گیا۔ تھرتھلی مچ گئی۔ کیا ہو؟ سر جوڑ کر بیٹھے۔ تجویز ہوا کہ پس ماندہ دیہی علاقوں کی فوج بلائی جائے۔ سو کاکیشیائی فوج آئی۔

یہاں کس قدر حیرت انگیز بات ہوئی کہ فوج کے سینئر افسر کو جب گولی چلانے کا حکم ملا وہ اپنی جیپ سے اُترا۔ اُس نے فوج کے سامنے اونچی آواز میں جیسے للکار کر کہا۔

''میں اِن غریب نہتے لوگوں پر گولی چلاؤں۔ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو سچے کھرے لوگ ہیں۔ محلوں میں رہنے والے اُن سے ان کے نوالے چھین لینا چاہتے ہیں۔ حق سچ کا ساتھ دینا میرا پہلا فرض ہے۔ رہی یہ جان تو اِس جان کی اوقات ہی کیا ہے؟''

اُس کے ساتھ ہی اُس نے خود کو گولی مار لی۔

کرنل عفیف کے لئے یہ بڑا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''گولی کن پر چلائیں گے؟ اپنے لوگوں پر اپنے بچوں پر؟ یہ درعا کے بچے نہیں ہمارے ہیں۔''

انہوں نے گولی چلانے اور انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ انکار ہی عذاب بن گیا۔ کچھ ایسے ہی واقعات حماء، لاطاکیہ اور بنی یاس وغیرہ کے قصبات میں پیش آئے۔

بس تو یہ فیصلہ اسی دن اور اسی وقت ہو گیا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے؟ جیپوں کے رخ مڑے اور پورا دستہ فری سیرین آرمی میں شامل ہونے چلا گیا۔

اور یہی فیصلہ معاویہ کا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے بھی بندوق ہاتھ میں تھام لی۔

ایف ایس اے میں ہی اسنا ئپر کی گولی میری ٹانگ میں لگی۔ جس سے ٹانگ میں لنگ پڑ گیا۔

سچی بات ہے اتنی تباہی کے باوجود اسد حکومت ابھی بھی قائم ہے۔

اِس جنگ نے کتنے تحفے کتنی سوغاتیں بخشیں۔ شام کا خوبصورت چہرہ گہنا گیا۔ بستے رستے لوگ اُجڑ گئے ۔ دربدری مقدر بن گئی۔ رشتے فنا ہو گئے۔ آنسو گالوں پر مسلسل بہنے اور آنکھیں گیلی رہنے لگیں۔

نئے مذہبی جنوبی گروہ کھمبیوں کی طرح اُگ آئے جنہوں نے دہشت کا بازار گرم کر دیا۔ کاش میں جانتا ہوتا کہ میری یہ چھوٹی سی شرارت کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو گی تو کیا میں ایسا کرتا؟

☆☆☆

باب نمبر 30:

بصریٰ

عباس کا شکریہ کہ اُس نے مزریب Mzcireeb جھیل دکھائی۔شہر سے کوئی دس بارہ میل پر بڑا خوبصورت تفریحی مقام تھا۔ بڑی رونق تھی یہاں خاندان کے خاندان پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ ریسٹورنٹ بھی تھا۔کچھ کھانے کو جی مچلنے لگا تھا۔آئس کریم لی۔

شُھب Shihab مزریب سے کوئی چار کلومیٹر پر ہوگا۔زرخیز ہموار اور خوبصورت نظاروں سے مالا مال۔گئے وقتوں کے ٹوٹے پھوٹے محل کی دیواریں،ستون کہیں کمرے کوٹھریاں موجود تھیں۔پتہ چلا تھا کہ مقامی حکومت نے آغا خان فاؤنڈیشن کے تعاون سے اِن اثاثوں کو محفوظ کرنے کا بندوبست کیا ہے۔چلو اِن کی حکومتوں نے کچھ تو کیا۔ ہماری کو تو توفیق ہی نہیں کہ کبھی اپنی یادگاروں پر بھی نظر ڈال لیں۔کبھی آل اولادوں کو دکھانے اور خود دیکھنے وآئیں تو پتہ چلے کہ گُجر ہمسائیوں نے تاریخی درودیواروں کو پھاتیوں کے ہار پہنا رکھے ہیں۔

عباس کی ایک بات نے مجھے بیتاب کر دیا تھا۔ بے چین کر دیا تھا۔ یہاں کچھ آبشاریں۔ خوبصورت مناظر ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں اور وہیں قریب ہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ یرموک لڑی گئی۔ اُن عظیم اور فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک جنہوں نے مسلمانوں کو اِن خطوں کے نئے حکمران بنانے کے لئے مہریں ثبت کیں۔

اب کہیں ممکن تھا کہ جوش واضطراب میں اضافہ نہ ہو اور اس مقام کو دیکھنے کی خواہش بپھر کر سر پر سوار نہ ہو جہاں اُس عظیم سپہ سالار خالد بن ولید نے تاریخ رقم کی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے عرب کا صحرا شروع ہوتا ہے۔آنکھوں کے سامنے تصویریں تھیں اُن شہہ سواروں،اُن جیالوں کی جو آندھی اور طوفان کی طرح اِن صحراؤں سے اُٹھے تھے اور اِن جہانوں پر چھا گئے تھے۔ سچی بات ہے دل رقیق سا

جذبات کی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ یوں بازنطینی بھی کچھ کم سورمانہ تھے مگر فطرت کے عروج وزوال کی حکمتیں ہمیشہ نئے انداز، نئے رنگ وآہنگ، نئے سُر وساز کے ساتھ دنیا کو ایک نئی صورت دینے کے لئے میدان میں اُتر رہی تھیں۔

شُھب میں نظارے ہی نظارے ہیں۔ آبشاریں ایک دو کیا کئی تھیں۔ کہیں ان کے دامنوں میں رومن واٹر ملز تھیں۔ قریب ہی زی زون Zeizoun بھی۔ عباس زور دے کر لے گیا کہ چل کر دیکھو تو سہی۔ واقعی مزہ آیا۔ کافی پینے اور فوابینز Fawa Beans کھانے کا۔ چٹنی بھی مزے کی تھی۔ پتہ چلا تھا کہ کھجوروں سے بنتی ہے اور اسے دبیس Dibis کہتے ہیں۔

بُصریٰ Bosra کے لئے اضطراب ہی نہ تھا۔ انتہائے شوق تھا کہ یہ بُصریٰ ہی تو تھا سرسبز ہرا بھرا، پانی کے چشموں اور کنوؤں والا کہ جہاں عرب کے تپتے صحراؤں کی بادِ سموم سے جلتی لوگوں کی آنکھیں، ان کے ہونٹ اور اندر یہاں آ کر سیراب ہوتے تھے۔ تاہم عباس نے بُصریٰ بارے وہ کہانی سنا دی تھی کہ جس نے بچپن سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اب کانوں کا سائیں سائیں اور دل کا دھڑ دھڑ دھڑ کنا تو بنتا تھا نا۔ اور وہ تھا کہ گائیڈوں کی طرح اِدھر اُدھر کی باتوں سے یاؤ بھرلسی کو رِڑک رِڑک کر اُس کا کچا بنانا چاہتا تھا۔

کیا کروں؟ سن لیا نا بھئی کہ بُصریٰ تاریخی لحاظ سے شام کے مشہورترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اب اِسے چھوڑیں۔ یہاں رومیوں اور یونانیوں کی یادگاریں ہیں اسے بھی ایک طرف رکھیں۔ اس کا رومن ایمفی تھیٹر دنیا کے بہترین شاہکار تھیٹروں میں سے ایک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہوگا۔ دیکھیں گے اُسے بھی۔

اِن سب تاریخی حقائق سے قطعی انکار نہیں۔ مگر میں کیا کروں؟ مجھے تو سب سے پہلے مبارک مسجد جانا ہے۔ جہاں میرے اُس جان جگر شہزادے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی شام کے سفر کے دوران بیٹھی تھی۔ تب وہ میرا شہزادہ صرف بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا کے ساتھ آیا تھا۔ اُس خانقاہ کو بھی دیکھنے کے لئے میں مری جا رہی تھی۔

''تو بھیٔ لے چلو وہاں جہاں دلبر کی مہرِ نبوت کی تصدیق نستوری عیسائی پادری بحیرٰی نے کی تھی۔''

علی ظہر کی نماز پہلے ادا کرنے کا خواہش مند تھا۔ وہ قریب کی فاطمہ مسجد میں چلا گیا۔ مسجد کوئی بارہویں صدی کی تعمیر ہے۔ باہر سے مینار کی خوبصورتی نظروں کو لبھاتی ہے۔ کھیتڈرل اور مسجد قریب قریب ہی ہیں۔

مسجد اور کھیتڈرل دونوں بعد میں۔ پہلے وہاں جہاں میرا دل۔ بحیرٰی کی مناسٹری تک جانے کے لئے جتنے بھی قدم اُٹھائے اُن میں گنگناہٹ تھی۔ میری آنکھیں ہیں وہاں میرا دل ہے جہاں۔ دائیں ہاتھ بلند و بالا پتھروں کی بنی کہیں کہیں سے شکستہ سی مشرقی تعمیری نمونے کی حامل عمارت۔ بظاہر کچھ خاص خصوصیت، کچھ انفرادیت نظر نہیں آئی تھی۔ مگر یہ بصرٰی کیا، شام کیا، دنیا بھر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے بے حد تقدس والی جگہ تھی۔ بادی النظر میں عام سی مگر بے حد خاص سی۔ میرے تصور کی اڑانیں دور کہیں راستے کی لو برساتی دوپہر میں بادل کے ایک ٹکڑے کو اس بچے کے سر پر تنا دیکھتی تھیں۔ کہیں اُس درخت کی شاخوں میں پھنسی تھیں جس کی چھاؤں میں وہ سرخ و سفید بارہ سالہ لڑکا آ کر بیٹھا تھا۔ جس کے لئے شاخیں جھک گئیں اور بادل کا ٹکڑا اس پر ٹھہر گیا تھا یوں چھاؤں گھنی ہو گئی تھی۔ سارے منظر ایک کے بعد ایک نگاہوں کے سامنے جیسے رقص کرتے تھے۔

یہ خانقاہ نسل در نسل راہبوں کے لئیے مخصوص تھی۔ یہاں بے حد قدیم تحریری مخطوطات جن میں پرانی دستاویزات، تورات اور زبور کے انتہائی قدیم نسخے موجود تھے۔ یہ انتہائی قیمتی مذہبی اثاثہ خود بخود ایک راہب کے مرنے کے بعد اس کے جانشین کی نگرانی میں چلا جاتا تھا۔ انہی قلمی نسخوں میں سے ایک میں عربوں میں ایک نبی کے معبوث ہونے کا ذکر تھا۔ بحیرٰی اِس مخطوطے کا مطالعہ کر چکا تھا اور ورقہ بن نوفل کی طرح اُسے بھی یقین تھا کہ اُس نبی کی پیدائش اس کی زندگی میں ہی ہو گی۔

اور اُس دن جب عرب کا وہ ماہ کامل سفر میں تھا اور خانقاہ کا موجودہ راہب بحیرٰی اپنی خانقاہ سے باہر کھڑا دور سے آنے والے قافلے کو دیکھتا تھا جو بس کسی لمحے میں خانقاہ کے پاس ہی پڑاؤ کیلئے رکنے

والا تھا۔ اُس نے تعجب سے بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو مسلسل ایک بچے اور ساتھ ایک معمر مرد پر سایہ فگن دیکھا۔ درخت کے نیچے بیٹھنے پر بادل کے ٹکڑے کا درخت پر ٹھہر جانا سب بحیریٰ کے لئے اُس کہانی کا عنوان بن رہا تھا جو اُس نے پڑھ رکھی تھی۔

''تو کیا اُس کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ قافلے میں موجود ہے۔'' بحیریٰ نے خود سے سوال کیا تھا۔

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ چند دن پہلے خانقاہ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان آیا تھا۔ اُس نے قافلے کو پیغام بھیجا۔

''قریش کے لوگوں میں نے تمہارے لئے کھانے کا اہتمام کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میں سے ہر ایک اس دعوت میں شامل ہو۔''

قافلے والے دعوت میں آئے مگر اس بچے کو اونٹوں اور سامان کی نگرانی کے لیئے پیچھے چھوڑ دیا۔

بحیریٰ نے آنے والے ہر شخص کو بہ نظر غائر دیکھا۔ مگر کسی چہرے پر، کسی وجود میں اُسے وہ خاص خصوصیت نظر نہ آئی جو کسی معجزے کی اہل ٹھہرتی۔

اُس نے بلند آواز میں استفسار کیا۔

''اے اہل قریش میں نے تم سب لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کیا سب لوگ آئے ہیں یا کوئی رہ گیا ہے؟''

''ہاں ایک بچہ جسے نگرانی کے لیئے چھوڑ کر آئے ہیں۔'' مجمع میں سے کسی نے کہا۔

بحیریٰ فوراً بولا۔ ''یہ تو قطعی مناسب نہیں۔ اُسے بھی لے کر آؤ۔ ہمارے ساتھ کھانے میں وہ بھی شامل ہو۔''

ایک آدمی گیا اور بچے کو لے کر آیا۔

بحیریٰ کی صرف ایک ہی نظر اُسے یہ یقین دلانے کو کافی تھی کہ جس معجزے کا اس نے مشاہدہ

کیا تھا وہ سو فی صد درست تھا۔ بچے کے چہرے پر نور کی لَو دمکتی تھی۔کھانے کے دوران اس کی آنکھیں بچے کا توجہ سے جائزہ لیتی رہیں۔

اُس نے محسوس کیا تھا کہ بچے کے خدوخال اوراس کا جسم کتاب میں دیئے گئے حلییٔ کے عین مطابق ہیں۔ جب کھانے مرحلہ ختم ہوا تو راہب اٹھ کر اپنے سب سے کم عمر مہمان کے پاس جا بیٹھا اور چند سوال کیئے۔ بچے کے جواب دینے کا انداز دل نشین تھا۔شائستگی کے حُسن کا رچاؤ تھا اس میں۔ بولتے ہوئے لہجے میں متانت کا بھر پور تاثر نمایاں ہوتا تھا۔

دفعتاً راہب نے بچے کی عبا کاندھے سے اُتار کر پیٹھ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بچے نے کِسی جھجھک کا اظہار نہیں کیا کہ راہب ایک معزز اور برگزیدہ انسان تھا۔گو راہب کو یقین ہو گیا تھا مگر وہ اپنے یقین کو محکم کرنا چاہتا تھا۔

شانے ننگے ہو گئے تھے اور دونوں کاندھوں کے عین بیچ وہ نشان موجود تھا جسے وہ دیکھنے کا متمنّی تھا۔مہر نبوت چمک رہی تھی۔کتاب کے مطابق اور عین اس مقام پر جس کا ذکر درج تھا۔راہب ابوطالب کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ بچہ آپ کا کیا لگتا ہے؟

''میرا بیٹا ہے'' ابوطالب کا جواب تھا۔

''یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔راہب نے بات کاٹ دی۔اس بچے کا باپ زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے۔'' ابوطالب بولے۔

''اور باپ کب فوت ہوا؟'' راہب نے سوال کیا۔

''بچہ تو ابھی رحم مادر میں تھا۔''

بحیریٰ نے کہا۔

''یہ بالکل سچ ہے۔دیکھو میری تم سے درخواست ہے کہ اِس بچے کو اپنے ملک واپس لے جاؤ۔اسے یہودیوں سے بچا کر رکھنا۔خدائے عظیم و برتر کی قسم اگر وہ اسے دیکھ لیں اور یہ جان لیں جو

میں نے جانا ہے تو اِسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اِس کے لئیے قدرت نے اپنے خزانے میں بڑی عظمتیں سنبھال کر رکھی ہیں۔''

آسمان کو میری نظروں نے کِس قدر محبوبیت سے دیکھا تھا۔ اندر سے شکر گزاری کا چھلکاؤ ہر ہر مو سے باہر آرہا تھا میں اِس قابل کہ یہاں آتی؟ اِسی ٹرانس میں وقت گزرا۔

تو اب مبارک مسجد کی زیارت ہو جائے۔ اس کے ساتھ بھی خوبصورت دلکش کہانیاں اور روایتیں جڑی ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہی ہے کہ اُونٹنی یہیں تو بیٹھی تھی۔ دوسری قرآن پاک کی پہلی تحریری کاپی سب سے پہلے یہاں بُصریٰ لائی گئی۔

میرے لئے دونوں اہم۔ بڑے بڑے پتھروں والی خوبصورت مسجد تھی اُس کے طاق پر جو تحریر ہے اِسی بنا پر اِسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کہا جاتا ہے۔ نماز پڑھی۔ نفل پڑھے۔ مشکور ہوئی۔ دعا مانگی۔

تو پھر طے ہوا کہ کھانا رومن تھیٹر دیکھنے کے بعد کھایا جائے۔ سچی بات ہے بھئی یہ رومن تھیٹر بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ تھیٹر کے عین سامنے جامع مسجد ابوبکر ہے۔ عباس نے بتایا تھا کہ اِس علاقے کے لوگ جمعہ پڑھنے کے لئیے مسجد ابوبکر آتے ہیں۔ خواہ وہ مسلکی اعتبار سے کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔

''ارے کتنی اچھی بات ہے۔ کاش ہماری مسجدوں میں بھی یہ چلن رواج پائے۔''

داخلہ بذریعہ ٹکٹ پندرہ لیرافی کس تھا۔ گائیڈ بھی دائیں بائیں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے مگر ہمارے ساتھ عباس تھا۔

تیسری صدی کا یہ تھیٹر دنیا کی واحد ایسی عمارت ہے جو مکمل طور پر محفوظ بھی ہے اور اپنی شان بان سے قائم بھی ہے۔ بڑی بات ہے بھئی۔ سچ تو یہ تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی اس کی ہیبت اور عظمت کا احساس رگ و پے میں دوڑنے لگتا ہے۔ پندرہ ہزار لوگوں کی دل پشوری اور تفریح کا مرکز جس کی نشستیں تین چوتھائی سرکل میں کتنی کہانیاں سناتی، کتنی تصویریں دکھاتی ہیں۔ انسان کھیل تماشوں کا ازلی شوقین ۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے کیا کیا عجوبے بنا ڈالتا ہے؟

ڈھلانی عمودی رخ پر پھیلی یہ نشستیں جن پر بیٹھے لوگ اس سٹیج پر کیا کیا منظر دیکھتے ہوں گے۔ہائے ہنسانے، رلانے والے۔نمایاں تعمیری خوبی کہ صرف دس منٹ میں پندرہ ہزارلوگوں سے بھرا پھرا تھیٹر خالی ہوجائے کہ بےشمار داخلی اور خارجی دروازے مختلف لیول پر یوں بنائے گئے ہیں کہ نہ رش نہ کہیں بھگدڑ رمچنے کا خوف۔یوں ہوا کی طرح داخل ہوں اور بگولے کی مانند نکل جائیں۔

اس کے مختلف حصّے ایک ترتیب اور موزوینت سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔اداکاروں کی پرفارمینس، مکالموں کی ادائیگی، آوازوں کا اُتار چڑھاؤ گلوکاروں، موسیقاروں اور سازندوں کی آوازیں، اوردھنیں ان سبھوں سے ہرجگہ اوپر، نیچے، قریب، دور بیٹھے ہوئے لوگوں کا دیکھنا سننا اور اُس سے محظوظ ہونا سب اِس طرز تعمیر کی فنکارانہ کاریگری کا مرہون تھا۔اس کے ذہین اور قابل معماروں نے تھیٹر کوان زاویوں کے پیش نظر وہ شکل اور آرکسٹرا کی جگہ کو وہ خاص گہرائی دی کہ آج کے جدید دور کے ماہرین فن حیرت زدہ یقیناً سوچتے اور خود سے کہتے ہوں گے کہ انسان وقت کے ہر دور میں بہترین ذہانت اور فطانت کے جوہروں سے ہمیشہ لبریز رہا ہے۔

بغیر دروازوں کے خالی کمرے آواز کو گونج دار بنانے کے لئے تعمیر ہوئے۔تا کہ ہر جگہ پر بیٹھے لوگوں کو آواز سنائی دے۔عباس نے سکّے گرا کر اور تالی بجا کر یہ تماشا ہمیں دکھایا۔

سٹیج کے اطراف میں بالکونیاں معززین کے لئے کہہ لیجیئے شاہی خاندان کے لئے کہہ لیں درجہ بدرجہ تھیں۔انسان کی ذات ہمیشہ حدبندیوں کی گھمن گھیریوں میں الجھتی رہی۔موت اور مقبروں میں بھی تخصیص کرتی ہے۔یہ اور بات ہے کہ مٹی کبھی فرق نہیں کرتی۔

صحن کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے اس کے صحن سے نہر کو گزارا گیا۔یہ گویا اُس وقت کا بہترین ایر کنڈیشنگ سسٹم تھا۔

روایت اور چلن کے مطابق زمانے کے مدّ وجزر نے اسے بھی متاثر کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے جب شہر فتح کیا تو اس میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اونچی اونچی

مدافعتی دیواروں اور خوبصورت میناروں نے اِسے سیٹیڈل کی سی صورت دے دی۔ یوں یہ مشترکہ ثقافتی ورثہ بن گیا۔ میوزیم بھی یہاں تھا۔ تاہم بھوک ستارہی تھی۔

مسجد عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھا۔ بُصریٰ کی پہلی مسجد کہ بُصریٰ کے لوگ اِسے نئی دلہن کی مسجد کہتے ہیں۔ جو بھی وہ کہیں بجا کہ بُصریٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہی تو فتح ہوا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ تھکے ہونے کے باوجود بصریٰ کی گلیوں میں پھرنا پرلُطف کام تھا۔ قدامتوں کو سینے سے لگائے وہ بتاتی تھیں کہ اُن پرانے بوڑھے دنوں میں یہاں زندگی گزارنا کیسا خوبصورت تجربہ تھا۔ میرے لیئے بھی اِن دنوں کے تصور میں چند لمحے گزارنا مزے کا کام تھا گو تھیٹر کے اونچے نیچے راستوں نے ہڈی جوڑ ہلا کر رکھ دیئے تھے۔

شہر بھی اُن سب حکمرانوں کی فتوحات اور شہر پر اُن کے کہیں خستہ حال اور کہیں بہتر نشانوں کے ساتھ ترجمانی کرتا تھا۔ نباطین Nabatean آرچ کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ آسمان کو چھوتی گول میناروں پر ٹکی بڑے بڑے پتھروں سے بُصریٰ کے اولڈ کواٹر میں گھومتے پھرتے ہوئے احساس ہوا تھا کہ زندگی کے ہنگامے اور مسرتوں کا حصول اُن زمانوں میں جیسے شہریوں دروازوں پر تھا۔ گلیاں، بازار اور شہر جس منظّم انداز کی تصویر پیش کرتا تھا وہ بتاتا تھا کہ ضروریات زندگی کی فراہمی غالباً حکمرانوں کی پہلی اہم ترجیح تھی۔ صدیوں قبل کے حکمران اور اِس جدید دور کے ہمارے حکمران۔ ذہن موازنے کرتا تھا۔ دل جلاتا اور بندہ اپنی کم مائیگی پر کڑھتا تھا اور وہ کڑھ رہی تھی۔

تھیٹر کے احاطے میں موجود ریسٹورنٹ کے اندر خود کو مُردوں کی طرح گرانے والے بات تھی۔ کافی پینی ہے۔ تھکن دور کرنے کا اور کوئی نسخہ کارگر نہیں ہوسکتا۔ بلڈ پریشر کی ڈبل ڈوز لے لو۔ عقل نے سمجھایا۔

مزید کچھ دیکھنے پر اب طبیعت مائل نہ تھی۔ دراصل عباس نے چھوٹی چھوٹی جگہوں کو دکھانے میں تھکا ڈالا تھا۔ اب سویدا Suweida دیکھنے پر اصرار تھا۔

''ہمت کریں۔ انگوروں کا گھر ہے۔ بیلوں کا حُسن ہر سو پھیلا ہوا ملے گا'' اور ہماری واپسی

اِسی راستے سے ہوتی ہے۔ یہ نسبتاً چھوٹا راستہ ہے۔ بُصریٰ اور سویدا کے درمیان کوئی تیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ بس آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔

جوان لوگوں کے ساتھ چلنا بھی بسا اوقات مسئلہ بن جاتا ہے۔ جتنا بھی انکار کرتی ہوں علی کا اصرار اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ تھوڑا سا جھلاّ بھی لگتا ہے۔ عباس ڈرائیور ہونے کے باوجود نیک نیت بچہ تھا۔ سچی بات ہے عباس جیتا رہے۔ ایسے ڈرائیور کہاں ہوتے ہیں جنہیں نہ اپنے وقت کی پرواہ ہے نہ پٹرول کی۔ اپنے دیس کی ہر شے خواہ وہ چھوٹی ہے یا بڑی دکھانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر میں بہت تھک گئی ہوں۔ آپ جانتی ہی نہیں السویدا کیا ہے۔ یہ بڑا منفرد شہر ہے۔ یہ دروز شہر ہے۔ آرتھوڈوکس عیسائیوں کا شہر ہے۔ ویسے یہاں سُنی مسلمان بھی ہیں مگر اُن کی تعداد کم ہے۔

اب جب اتنا محبت بھرا اصرار ہو تو بات ماننی پڑتی ہے۔ سر جھکانا پڑتا ہے خواہ آپ کی ہڈیوں کے پائے ہی کیوں نہ پکے ہوئے ہوں۔ اب سچ تو یہی تھا کہ ایک بات بہت کھلی تھی۔ لوگوں کے ذاتی گھر حد درجہ شاندار نظر آئے۔ اندر کا حال رب جانتا ہے مگر ظاہراً ان کے چہروں مہروں کا حُسن و جمال صدیوں پُرانے شکستہ دم محل باڑیوں کے کالموں اور منقش پتھروں سے سجے لشکارے مارتے جاتے تھے۔ کہیں ان کی بالکونیوں میں کھڑی کوئی دلکش سی عورت کوئی جوان، کوئی بوڑھی، کوئی مرد نظر آتا تو منظر جیسے قلب و روح کو تازہ دم کر دیتا تھا۔ یہ کہیں مالِ غنیمت سے تو نہیں آراستہ پیراستہ ہیں۔ اور پھر جہاں قہوہ پینے کے لئیے رُکے۔ اس کی تصدیق اِس کافی شاپ کے مالک نے بھی کر دی۔

علی اور فاطمہ کو میوزیم دیکھنے کی آخر آئی ہوئی تھی۔ میری طرح نسرین بھی انکاری تھی۔ چلو ہم یہاں کیفے میں بیٹھتے ہیں۔ تم لوگ جاؤ مگر عباس انہیں وہاں اُتار کر ہمارے پاس آ گیا تھا۔ اور اب ہم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شہر کے ہوائی بوسے لے رہے تھے۔ بازار دیکھا۔ آرٹ کی دکانوں میں گئے۔ کیا شاہکار دیواروں پر آویزاں تھے۔ پورا شہر تو یہیں نظر آتا تھا۔ شہر کا کلچر بھی سجا ہوا تھا۔ رقص و موسیقی کے منظر پینٹ تھے۔ دولہا دلہن بھی نظر آ گئے تھے۔ شادی کے چند منظروں نے بھی شاد کیا۔

چھٹی صدی کے لیسر Lesser چرچ کے پاس ہی وہ شہرہ آفاق محراب تھی کہ جس کے بغیر

شہر ادھورا ہے۔ دردناک سی کہانی بھی سُننے کو ملی کہ پندرھویں صدی کے شہنشاہ تیمیرین نے شہر کے معززین کو اِس محراب کو پھانسی گھاٹ بنا کر پر چڑھایا تھا۔ سوتب سے یہ پھانسی گھاٹ کے نام سے مشہور ہے۔

شہر کے مرکز میں سلطان پاشا العطرش کا مجسمہ دیکھا۔ فرانسیسی غلبے کے خلاف جدوجہد کا ہیرہ پاشا العطرش۔ جی ٹھنڈا ہوا۔ سیلوٹ مارا۔

کوئی دو گھنٹے بعد ہم لوگوں نے جوڑے کو میوزیم سے پک کیا۔ علی سے میوزیم کا احوال سنتے ہوئے میں نے عباس سے کہا۔

''میاں سیدھے سیدھے چلو۔ جی چاہتا ہے یہیں کہیں لم لیٹ ہو جائیں۔ تمہاری محبتوں نے چور چور کر دیا ہے۔

سیاہ، سبز اور سُرخ انگوروں کے چھابے بھرے ہوئے دکانوں میں سجے دعوت دیتے تھے۔ ایک کلو خریدے۔

یہ تو باتیں امن والے دنوں کی تھیں۔ ہاں جب میں نے عبداللہ ال جازر سے ای میل رابطہ کیا۔ انہوں نے جو شہر کی تصویر کشی کی اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔

بصریٰ پر فری سیرئین آرمی کا بڑا سخت کنٹرول تھا۔ پر امن سا شہر اسے تو ایسے ہی حکومت نے رگیدنے کی کوشش کی۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ درعا ہمسائے میں تھا۔ اس کی گڑ بڑ کا لامحالہ اثر تو ہونا تھا۔ ایک فطری امر ہے کہ یہاں وہاں کھڑے لوگوں نے ہمسایہ شہر میں ہونے والے حادثے پر دکھ اور افسوس کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔ تشویش اور دکھ بھرے جذبات کا ردّعمل بھی فطری تھا۔ چور کی داڑھی میں تنکا جیسی بات ہوئی۔ سکیورٹی فورسز نے گولی چلا دی اور چار لوگ مر گئے۔ صورت کشیدہ ہوگئی۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں نے بتدریج حالات کو بگاڑنے میں کردار ادا کیا۔

مارچ 2015ء جیسے طوفان کی سی صورت میں اِس تاریخی شہر پر نازل ہوا۔ پرانے شہر میں باغیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر حکومتی فوج ایئر فورس کے ہوائی حملے اور بیرل بموں کی یلغار برسائی گئی۔ Maaraba اسپتال پر راکٹ فائر ہوئے۔ یہاں زخمی باغیوں کا علاج ہو رہا تھا۔ اسپتال تو

ملبے کا ڈھیر بن گیا اور زخمی بیمار، بچے، بوڑھے سب قیمہ بن گئے تھے۔

29مارچ کو مقامی سطح پر بڑی جھڑپیں دو بڑے گروپوں میں ہو ہیں، یہ اسلامی muthunna اور ال سُنیٰ Al Sunnah Lions Brigade کے درمیان تھیں جو ان ہتھیاروں اور ایموشین ammunition کی تقسیم بارے تھیں جو بصریٰ سے انہیں ملا تھا۔ ایک کارکن قتل ہو گیا۔ دوسری طرف کے بھی لوگ مارے گئے۔

شہر ایسے لڑائی جھگڑوں کا عادی نہیں تھا۔ بہت افسردگی طاری ہے اس پر۔ بہرحال خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔

☆☆☆

باب نمبر 31:

شام کی خانہ جنگی شاعری کے نئے رنگ و آہنگ کے آئینے میں

''شاعری شام میں ہمیشہ سے بڑی اہم رہی ہے۔''

غدا العطرش جو ایک اچھی شاعرہ، کہانی کار اور ساتھ ہی مترجم بھی ہے۔ کہتی ہے۔

دراصل وقت اور حالات نے اِس کی نوعیت اور ہیت تبدیل کر دی ہے۔ وہ سکولوں کے بچوں کا ترنم سے رزمیہ نظمیں پڑھنے اور پاپ سٹارز کا موسیقی کی ہم آہنگی کے ساتھ بہترین رومانی شاعری کا انتخاب اپنے سامعین کے لئے ایک خوب صورت تحفے کی سی صورت رکھتا تھا۔ ادبی بیٹھکوں میں گھنٹوں بحث مباحثوں کے عنوانات میں سرفہرست عشق و عاشقی کو ہی ترجیح حاصل تھی۔

مگر اِس خانہ جنگی نے ادب کی اِس صنف کے زمانوں پرانے عنوانات کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ خوف کی اُن دیواروں کو گرا دیا جن کی دہشت سائے کی طرح تعاقب میں رہتی تھی۔ اُس وقت وہ باتیں کہی جا رہی ہیں جن کے کہنے کا کبھی کوئی تصور ہی نہ تھا۔ تمثیلی اور استعاری انداز کا چلن ختم ہوا۔ شام کے اندر اور باہر جو رہا ہے اس پر کھلے، واضح اور مضبوط لفظوں میں اظہار ہوا ہے۔ شام میں جس ادب کا ظہور ہوا ہے چند سال قبل اس کا کہیں گمان تک نہ تھا۔

اِس جنگ نے ایک اور کام بھی کیا کہ چشم غزال اور کاکل سیاہ کے پیچ و خم سے اٹھا کر شاعروں اور ادیبوں کو نئے منظروں جو ان کے اردگرد پھیلے تھے پر لکھنے کو اکسایا۔ خون میں ڈوبے لفظ نکلے جنہوں نے قبروں اور ٹوٹی ہڈیوں کی باتیں کیں۔

کیلگری Calgary یونیورسٹی البرٹا کینیڈا میں مقیم اپنے وطن شام سے جنون کی حد تک پیار کرنے والی شام کی بیٹی غدا العطرش جو اس وقت اُن آوازوں کو جو ایک زمانے بعد بلند ہوئی ہیں فیس

بک اور سوشل میڈیا کے ذریعے انگریزی میں ترجمہ کر کے متعارف کروا رہی ہے۔ Stripped to the Bone شامی عورتوں کی شناخت، اُن کے حوصلے، جرأت، دلیری، محبت، نفرت اور مزاحمت سے لبریز وہ خوبصورت کہانیاں ہیں جو غدا نے لکھیں۔ وہ مشرق اور مغرب کے درمیان پل کا کام کر رہی ہے۔

میں جولائی 2008ء میں اُس وقت یہ کب جانتی تھی کہ اِس سہانی سی سہ پہر میں جب سویدا کے حسین منظر میرے سامنے ہیں۔ ذرا بھاگ کر، ذرا تگ ودو سے اُس ڈاکٹر نجت عبدالصمد کو کسی اسپتال سے ڈھونڈ نکالوں وہ سویدا ہی میں تو رہتا تھا اور وہیں کام کرتا تھا۔ اس سے ملوں۔ اس سے کچھ کہوں، اس سے پوچھوں۔

''صمد تم شاعروں کو تو الہام ہوتا ہے۔ تم لوگ تو آنے والے وقت کی چاپ سن لیتے ہو۔

پھر ضد کرتے ہوئے کہتی۔

مجھے کچھ سناؤ۔ شاید تمہارے ہونٹوں سے نکلے لفظوں سے رستے ہوئے احساس کے کسی ٹکڑے سے اُس آفت کا کچھ اندازہ لگا سکوں کہ تمہاری اندر کی آنکھ نے سالوں پہلے حشر کی اِس گھڑی کی کسی آہٹ کو سنا تھا۔''

اسی خوبصورت شہر، اسی سویدا کے یوسف ابو یحییٰ کا پتہ بھی تم سے پوچھتی شاعر تو ایک دوسرے کو جانتے ہوتے ہیں۔ تب میں کچھ وقت تم دونوں کے ساتھ گزارتی، باتیں کرتی، شاعری سنتی۔ میں تو سچی بات ہے کنوئیں کے پاس جا کر بھی پیاسی رہی تھی۔

سویدا حُسن ورعنائی کے اعتبار سے ہی نہیں امن وآشتی کے حوالے سے بھی جنت سے کم نہیں۔ یہ بات ہمارے ٹیکسی ڈرائیور عباس نے بڑے فخریہ انداز میں بتائی تھی۔ واقعی تبھی تو متاثرہ علاقوں کے لوگ اِس کی طرف بھاگے تھے۔ اپنے گھروں کی بستی رستی جنت سے جو دوزخ بن گئی تھی۔ امن کے لئے عافیت، کے لئے۔ اپنی جنت کو چھوڑنا کتنا بڑا المیہ ہے؟

ڈاکٹر نجت تم نے یہ سب دیکھا۔ تم نے اپنے ملک کو آگ کے شعلوں میں جلتے دیکھا۔ تمہارا کرب تمہارے ہونٹوں پر پھوٹا۔

جب کمزوری مجھ پر غالب آتی ہے
میں اپنے دل کی مرہم پٹی کرتا ہوں
اُس بچے کے قدموں کی استقامت سے
جو مہاجر کیمپوں کے راستوں میں جمی برفوں پر
اپنے ایک پاؤں میں ایک چھوٹا سا کالا جوتا
دوسرے پاؤں میں بڑی سی نیلی سینڈل پہنے
اِدھر اُدھر پھرتا
چمکتے آسمانوں میں اُڑتی تتلیوں کو دیکھتا
ان کے لئے گیت گاتا
مگر
یہ تتلیاں
یہ چمکتے روشن سے آسمان
تو صرف اس کی آنکھوں کے خواب ہیں

فیس بک نے طوفان اٹھا دیا ہے۔عطرش کا کہنا ہے۔سویدا کے شاعروں یُوسف ابو یحییٰ اور نجت عبدالصمد کو اس نے دریافت کیا۔ان کی تازہ نظمیں وہ اُن سے لے کر انہیں انگریزی میں ترجمہ کرتی ہیں اور سوشل میڈیا پر شیئر کرتی ہیں۔یہ کام وہ ہی نہیں بہت اور لوگ بھی کر رہے ہیں۔

تاہم یہ نئی آزادی جو جذبات کے جوش و جنون سے بھری ہوئی ہے۔اسے خطرات لاحق ہیں۔شاعر ابراہیم کاشوش Qashoush کو پہلے اغواء کیا گیا۔زدوکوب اور شدید جسمانی تشدد ہوا اور پھر جون 2011ء میں مار دیا گیا۔دیاال عبداللہ اور طلال مولوہی کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ابھی بھی جیل میں ہیں۔جہاں انہیں کسی وکیل کی خدمات بھی حاصل نہیں۔لکھاری خالد خلیفہ پر مئی 2012ء میں دمشق میں حملہ ہوا۔ترکِ وطن شامی شاعروں کو بھی بہت ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ثمر یز بک کو شدید

ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ میرم ال مرسی جن کی نظموں کی ابھی کتاب چھپی ہے بہ عنوان ''آزادی جوعریاں ہوتی ہے'' دونوں کا کہنا ہے کہ آئے دن اُنہیں موت کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔شام کے کسی جیل جانااور وہاں دن گزارنا کتنا مشکل ہے۔ثمر توان صعوبتوں سے بہت گذری۔

بعض لکھاریوں نے حفاظتی اقدامات کرتے ہوئے فرضی نام رکھ لئے ہیں۔اب پولیس چھاپے مارتی ہے۔کہیں بھانڈا پھوٹ جاتا ہےاور کہیں پردہ رہ جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شامی لکھاری ابھی تک مہیب خطرات میں ہیں۔مگر آفرین ہے اُن کے ہمت وحوصلے پر کہ چھوٹے موٹے ڈر ڈُر تو چھوڑ یئے موت کا خوف بھی انہیں اپنے کام سے روک نہیں سکا۔

ہم نے خوف کا بھوت بھگا دیا ہے۔ہم نے ڈر کے آسیب کو پاش پاش کر دیا ہے۔

میرم ال مرسی کا کہنا ہے۔

یہ نئی آزادی گوابھی خطرے سے خالی نہیں۔صورت پریشان کن ضرور ہےمگر راہ سے بھٹکانے والی ہرگز نہیں۔ایسی انقلابی شاعری جنم بھی تو تبھی لیتی ہے۔ذراڈاکٹر نجت عبدالصمد کو توسنیئے۔

مصیبت پرصبر کرنے والی شامی عورت
میرے زخمی دل کے لئے مرہم کی طرح ہے
مجھےتقویت ملتی ہےاُس عورت سے
جو گہرے رشتوں کی موت،غربت اور در بدری
کےسامنےڈٹی کھڑی ہے
جوشدید سردی میں
کھانا پکانے کے لئے
لکڑیوں کا بھاری گٹھا
یخ بستہ جنگل سے لاتی ہے

وہ درخت نہیں کاٹتی
کوئی چیز چوری نہیں کرتی
تھکاوٹ کے آگے جھکتی نہیں
کسی سے خیرات نہیں مانگتی

اور

جو اُداسی، تنہائی اور مایوسی سے خائف نہیں
میرا دل حوصلہ پکڑتا ہے
اُس جیالے لڑکے کے عزم پر
جس کے اکلوتے گردے کو برقی چھڑی سے کوٹا جاتا ہے
جس کا پیشاب خون بن جاتا ہے
پھر بھی وہ اگلے مظاہرے میں موجود ہے
میرے زخمی دل پر پھاہا رکھتی ہے
دسمبر کی منجمد شاخیں اور تنے
جو اگلے مارچ میں کھلنے کی قسم کھاتے ہیں
دلیل سے بھری ہوئی ایک توانا آواز
جو شکستگی اور مایوسی سے بہت بالا ہے
میرے دل کو تقویت دیتی ہے
اس نئے خوبصورت تصور کی شبیہ
جو ہمارے شہیدوں نے مادرِ وطن کو دی ہے

اور

جسے غریب کی آنکھ دیکھتی ہے

یوسف ابو یحییٰ کی اس نظم کو بھی غدا العطرش نے ترجمہ کیا ہے۔

میں ایک شامی ہوں
جلاوطن
اپنے مادر وطن سے دور
چاقو کے بلیڈوں جیسے راستے پر سوجے پاؤں سے
چلتا ہوں
میں شامی ہوں
شیعہ، دروز، کُرد، عیسائی
علوی، سنی اور سرکیشائی
میرا فرقہ میرے مادر وطن کی خوشبو ہے
وہی خوشبو
جو بارش کے بعد مٹی سے نکلتی ہے
میرا شام ہی تو میرا مذہب ہے
میں اسی دھرتی کا بیٹا
زیتون کی طرح
سیبوں، اناروں، انجیروں اور انگوروں کی طرح
شام میری سرزمین
شام میری پہچان
اب تمہارے تخت و تاج کا کچھ فائدہ؟
تمہارا عرب ازم
تمہاری نظمیں

کیا تمہارے لفظ میرا گھر واپس لا سکتے ہیں
اور انہیں جو مر گئے
اور آنسو جو اِس دھرتی پر گرے
میں اُسی سبز جنت کا بیٹا ہوں
لیکن آج میں
بھوک اور پیاس سے مر رہا ہوں
لبنان اور عمان میں ویران خیمے
میرے مہاجر ہونے کے گواہ ہیں
میرے مادر وطن کی طرح کوئی ایسی سرزمین نہیں
جس کے دانے میری پرورش کر سکیں
اور نہ ہی دنیا کے بادل
میری پیاس بجھا سکیں

اور وطن سے محبت کی وہ للک اس سے چاہت کی وہ آگ جو بیرون ملک رہنے والے شامیوں نے اپنی پور پور میں جلتی محسوس کی۔ اس نے اُنہیں اس مشترکہ احساس کی لڑی میں موتیوں کی طرح پرو دیا اور اپنے آباؤاجداد کی سرزمین بچانے کے لئے اکٹھا کر دیا۔ یہ شامی امریکی گلوکار عمر آفندم ہو۔ خاولہ کینو یہ ہو۔ امل کیسر ہو۔ کسیر جو امریکن کالج جونیر کی طالبہ ہے کہتی ہے۔

''جنگ میری شاعری پر قابض ہوگئی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں سوجھتا۔ زمین پر بکھرے خون اور اناروں کے رنگ میں کوئی فرق ہے کیا؟''

امریکن ماں اور شامی باپ کے پانچ بچوں میں سے چوتھے نمبر کی بیٹی امل کیسر ڈینور میں رہائش پذیر اپنے باپ کے شامی ریسٹورنٹ میں اُس کی مددگار، کالج کی طالبہ اور امریکہ میں شامیوں کے لئیے آواز اٹھانے والی مجاہدہ کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

امل کا کہنا ہے میں نے تین سال دمشق کے مضافاتی علاقے حمور یہ اپنی دادی کے فارم ہاؤس پر گزارے۔ ہم شامی لوگ اپنی شناخت ،اپنی پہچان کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ ہمارے خاندان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ نئی نسل کو معلوم ہونا چاہیے ہم کون ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ہم کون تھے بلکہ اُن کی کوشش تھی کہ ہم خود جانیں اور پھر جان کر اُسے اپنائیں۔

امل کی یادوں میں شام میں اپنی دادی کا فارم ہاؤس بہت اہم ہے۔ وہ وقت جب اُس نے شام کو قریب سے دیکھا۔ اس کی محبت میں ڈوبی اور بولی شام میرا گھر میرا وطن اور میری پہچان ہے۔ امریکہ نے مجھے علم، چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی استعداد دی۔

اس کی یادوں میں ہمیشہ حموریہ میں گزرا ہوا وقت جھلملاتا ہے۔ جب سارے خاندان کے بچے اناروں اور آلوچوں کے درختوں تلے کھیلتے۔ رات کو خاندان کھانے کی میز پر اکٹھا ہوتا۔ شامی ثقافت اور کلچر کا ایک اہم حصّہ خاندان کا کھانے پر اکٹھے ہونا ہے۔ اس خانہ جنگی نے ہمارے خاندان کے ستائیس (27) افراد کی جان لی۔ ہمیں اچھی طرح موت کی تلخیوں کا احساس ہوا۔ ہمارے خاندان نے بہت اذیت کا سامنا کیا ہے۔ امل بڑے دُکھ اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے۔

امریکہ آنے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ میں اپنی دادی کا وہ فارم ہاؤس اب کبھی دیکھ نہ پاؤں گی کیونکہ حکومتی فوجیوں نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ انہوں نے اس خوبصورت باغ کے سارے درختوں کو کاٹ دیا تھا اور وہ اب اُن کی دادی کی ملکیت نہیں رہا تھا۔

وجہ بس اتنی سی تھی کہ اس کا شامی خاندان سیاسی طور پر بڑا نمایاں اور اپنی رائے کا ڈٹ کر اظہار کرنے والا تھا۔ کہہ لیں کہ اپوزیشن میں تھا۔

وائٹ ہاؤس کے لان میں "بشار کے نام کھلے خط میں اُس کی نظم نے طوفان اٹھا دیا تھا۔ اس کی ایک نظم ’’گولیاں اور زمین‘‘ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

جنگ جب شروع ہوتی ہے
دریا بھی خشک ہوجاتے ہیں
فوجیوں کے ہاتھ
کبھی کسانوں کے ہاتھ بھی ہوئے ہیں
گولیوں اور دھرتی کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق
خون بھی کبھی فصلیں اُگاتے ہیں

بیس سالہ امل کسیر اپنی کتاب بیگ میں ڈالتی ہے۔حجاب پہنتی ہے اور شام کے دکھ اور المیے پر نظمیں پڑھتی ہے۔

کسیر کی ایک نظم پڑھیئے۔

میری دادی شام کو ہر شامی سے زیادہ جانتی ہے
اس کے گھٹنوں میں آرتھرائٹس ہے
اُسے اپنے کھیتوں کی مٹی کے نام اور خوبیوں سے مکمل آگاہی ہے
وہ ظالموں اور آمروں کو بھی جانتی ہے
وہ کہتی ہے
غلاظت اس کے (بشار) انتظار میں ہے
وہ اپنی قبر بارے بھی جلد جان جائے گا
اور پھر
وہ اپنی چھاتی پر پورے ملک کا بوجھ محسوس کرے گا

شاعری گواہی دیتی ہے۔موجہ کف نے کہا۔
موجہ کف شامی امریکی انعام یافتہ لکھاری آرکنساس یونیورسٹی میں

پروفیسر ہیں۔2011 میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا شامی ادب خوف ،حکومتی سنسر شپ اور جبر وظلم کے حصار میں تھا۔لیکن اب سب کچھ بدل گیا ہے۔انتہائے شکر اِس انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا۔شام اپنی ایک نئی پہچان اور اس کا ادبی رنگ ایک نئے انداز سے سامنے آرہا ہے۔شاعری اس وقت ایک بڑا اور نمایاں کردار ادا کررہی ہے کہ احتجاجی مظاہروں میں انقلابی گیتوں کو احتجاجی طور پر گایا جارہا ہے۔

عامر طایاب پیشے کے اعتبار سے وکیل انسانی حقوق کا علمبردار خانہ جنگی کے ابتدائی دنوں سے ہی اِس آگ میں ایک نعرہ مستانہ لگا کر کود پڑا تھا۔بڑی انقلابی نظموں کا خالق ہے۔۔اس کی یہ ایک نظم پڑھیئے۔

رات بہت لمبی ہوگئی ہے
اور تاریکی بڑھ گئی ہے
مجھے تو ستاروں کی روشنی بھی نظر نہیں آتی
جو راستہ ہی دکھا سکے
سفر لمبا ہوگیا ہے
اور میرے قدموں کے نشان غائب ہونے شروع ہوگئے ہیں
واپسی کا راستہ کیسے پتہ چلے گا؟
ایک خواب سا غنودگی میں جھلکتا ہے
جو میری آنکھوں کی پتلیوں کو تھپکیاں دیتا ہے
اس کے ساتھ ساتھ
میں خوف زدہ بھی ہوں
کہ دن کا طلوع مجھے دفن کردے گا
میرے بارے کچھ مت پوچھو

مت پوچھو میں کون ہوں

اِس جنگ کے ڈھیر سارے ستم ہیں۔ لاکھوں لوگ پناہ کے لئے بھاگے۔ کہیں کشتیوں میں، کہیں پیدل، کہیں کار، کہیں گاڑی کہیں بسوں میں ۔ لبنان ، اردن اور ترکی کے مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین ہونے اور کہیں ترکی اور بیروت کے راستوں سے یورپ جانے کے لیے ۔ اِن کیمپوں میں نوجوان تھے۔ بچے، عورتیں اور بوڑھے مرد تھے۔

یہ ستم رسیدہ بے خانماں لوگ شدید خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کا دشمن حکومت ہی نہیں بلکہ بیرونی طاقتیں بھی ہیں ۔ ان کے مفادات ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے اندر سے لاوے پھوٹے۔

کیا یہ ذکر ڈاکٹر ہیثم جیفیبہلول کے بغیر مکمل ہوگا۔ سکائٹرسٹ بہلول جو تاثیق گروپ کا بانی ہے۔ جو شام کے شاعروں، موسیقاروں اور آرٹسٹوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ شام کے مردم خیز شہر لطاکیہ میں 1983ء میں پیدا ہونے والا ہیثم جو اس وقت میسا چوسٹس یونیورسٹی کے میڈیکل سکول میں پروفیسر ہیں۔ اُن کی نظموں کی دو کتابیں عربی میں ہیں جن کے انگریزی تراجم کو بے پناہ پذیرائی ملی۔

کلاوَڈ کیفے کو ذرا پڑھیئے ۔

چھاتی کے داخلی دروازے پر
گلے اور زبان کے درمیان
اُداس چہروں والے انسانوں کی لمبی قطاریں
جو بے چین اور بے ڈھبے لباسوں میں ملبوس
منصوبے بناتے ہیں
پراُمید ہیں
جنگ کے خاتمے کے منتظر ہیں
لیکن

وہ خوف زدہ بھی ہیں
ڈبل روٹی اور آلوؤں کی قیمتوں کے بارے
اور لفظوں کے بارے
وہ خوش ہوتے ہیں ماحولیاتی گرمی اور
سازشوں کے بارے میں سن کر
ہاں لیکن، مہلک بیماریوں کے خوف
انہیں پریشان کرتے ہیں
تاہم وہ ہنستے ہیں
اُن کی اکلوتی چاہت
ایک سگریٹ اور راکھ ہے
وہی راکھ جو شہروں کو تباہ کر دیتی ہے
اور جب وقفہ ختم ہوتا ہے
وہ پھیپھڑوں کی دیواروں پر درمیانی انگلیوں سے
وقت کے کوئلے سے cross بناتے ہیں
اور کام کو لوٹ جاتے ہیں
جنگ کے سال گزرتے ہیں
ایک ایک کرکے
کیلنڈر کے صفحوں کی طرح پلٹتے ہوئے
اور شاندار منصوبوں کو تہس نہس کرتے ہوئے
شہیدوں کے ناموں کا اندراج کرنے والا
وہ جو مُردوں کے لئے دعا پڑھتا ہے

اور جو ایک ہاتھ سے جرنلز کے میڈلز لگاتا ہے
اور دوسرے سے المیہ شاعری لکھتا ہے
کچھ نہیں بدلتا سوائے تعداد کے
اور اُن لوگوں کے اعتقاد کے
جو گلیوں میں ماتم کرتے ہیں
جبکہ کلاؤڈ کیفے میں
کوئی پل کے لئے اپنی نگاہیں اوپر اٹھاتا ہے
اور پھر
شور غل کی آوازوں میں
اپنی گرے داڑھی کو جھکاتے ہوئے
اپنے نئے آئی فون میں مہمک ہو جاتا ہے

جاہد ال احمدی کی دل کے تاروں کو چھوتی نظم ''شام کے آسمان پر چمکتے دو چاند'' پڑھیئے ۔شاعر کا اپنے ملک کو کرب اور دکھ کے سمندر میں گرتے دیکھنا کس قدر غم زدہ المیہ ہے۔اس کا ذرا نوحہ سنیئے ۔

یہ ہم ہیں
دل کے دریا پر معلق پل کی
کس ورید سے خون بہہ رہا ہے
اور فاصلے کم نہیں ہو رہے
فرات کے لبوں سے چاہت کے دو بولے گئے ہیں
اور تیسرا ماتم زدہ ملک کے لئے ہے
تکلیف بھرے دو سال اور اب تیسرا بھی
اُس لکھے ہوئے کو ٹال رہا ہے جو

تقدیر کے قلم سے لکھا گیا
چنبیلی کے پھولوں جیسے شام
تمہارے خوبصورت نخلستان
جنہیں
آنکھوں کے دامن کی ہریالی چھوتی ہے
جو اُفق کی نیلاہٹ پر بھی ختم نہیں ہوتی
ہماری سڑکیں میجانا اور اتابا سے کتنا گونجتی ہیں
اور ہم تھکن زدہ لوگوں کے لئے کتنی شراب
بہاتے ہیں!
خدارا ہمارے خواب نہ نوچو
خدارا! اپنے دروازے ہمارے محبوبوں کے لئے نہ بند کرو
ہمیں ہچکچاہٹوں سے نکال لو
ہمیں گناہوں میں نہ پھنساؤ
جو ہم نے نہیں کئے
ہمیں اپنے وطن کے سہارے اونچا اُڑنے دو
تاکہ ہم دہرے موسموں کے عذابوں سے بچ سکیں
دمشق کے آسمانوں پر چھائے بادل ختم ہو رہے ہیں
آہستہ آہستہ مچھلیوں کی طرح
کائنات کے اُفق پر ایک نئی پیدائش ہو رہی ہے
آنے والے کل میں
تم مشرق کی اس ماں کو دیکھو گے

شاعری گواہی دیتی ہے۔موجہ کف نے کہا۔

شامی شاعرہ اور ایکٹویسٹ خاولہ کیونیہ Khawla Quniaاور فنکارہ مدوہ سلیمان جس نے اسد کے خلاف مظاہروں میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔گم شدہ لوگوں کے لئے آواز اٹھائی ۔موجہ ان کی بہت بڑی مداح ہے۔

خاولہ دنیائے شام کی انقلابی شاعرہ،ایک جوشیلی ''ایکٹویسٹ'' کی شاعری جسے بے حد سراہا گیا۔

''نہ ختم ہونے والا انقلاب'' اِس کی روزمرہ یادوں کا مجموعہ ہے۔"Sinper" خفیہ گولی چلانے والا ایک گہری اور دل میں طوفان اٹھانے والی اُس کی نظم جسے موجہ نے ترجمہ کیا،فیس بک پر چڑھایا اور پوری دنیا میں یہ نشر ہوئی۔

"Sniper" کو ذرا دیکھئیے۔

انگلی جو رکتی نہیں
عضو جو تقدیر کے آگے جھکتا ہے
وہ تقدیر جیسے خاموش رائفل لکھتی ہے
اور تم
کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟
کس نے تمہیں یہ سکھایا؟
جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو
کس نے تمہیں اس سنگین لمحے میں منجمد کیا
یہ لمحہ جو
مجھے،تمہاری آنکھ اور گولی
کو اکٹھا کر دیتا ہے

اور یہی وہ لمحہ ہے جو

مجھ سے میرا خواب چھینتا ہے

اور تمہیں ناموری دیتا ہے

لیکن

ہم بہت عرصے تک خاموش نہیں رہیں گے

صمد اپنی ایک میل میں لکھتا ہے العطرش آج مجھے اپنے ملک میں دنیا کے ساتوں براعظموں سے آتی آوازوں کی خوشبو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم خود کو یتیم محسوس کرتے ہیں۔ عمر آفندم کو کتنے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم پھر بھی اس نے اپنا گیت ریلیز کروایا۔ اب وہ کہتے ہیں۔

اور اب جب کہا جاتا ہے

شام تذبذب میں ہے کہ

کس کا ساتھ دیا جائے

لیکن ایک سوچ ایک خیال ضرور ہے

ہم سب شکست کا شکار ہیں

خانہ جنگی جنگ ہی تو ہے

جہاں بچے موت کا شکار ہوئے ہیں

اور

مائیں باورچی خانوں کے فرش پر پڑی ہوئی ہیں

☆☆☆

باب نمبر 32:

دمشق نیشنل میوزیم

- 2008 کے شام میں فی کس جی ڈی پی پانچ ہزار سے کم نہ تھا۔
- میوزیم میں دھرے قدیم دروازوں اور کھڑکیوں کا چوبی کندہ کاری کا کام اپنی مثال آپ تھا۔
- میوزیم میں سکولوں سے آنے والے طلبہ کے درمیان پینٹنگ کا مقابلہ دلچسپ روایت ہے۔
- ایلان کردی کا سانحہ انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔

پہلی گھُٹ کر چھی تو اُس اُمنڈتے حسن نے ڈالی تھی جو نیشنل میوزیم کے بیرونی درودیوار سے پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہا تھا۔ گرمی نے مت ماردی تھی۔ گو یہ وہاں تکیہ ال سلیمانیہ کے پاس ہی تھا۔ مگر آج موسم کے تیور کچھ برہم تھے۔ صبح سے ہی چمک چمک کر گویا اعلان کرتا جارہا تھا کہ مشتری ہوشیار باش!

ایک میرے اس دس کلو عبایے کا سیاپا۔ ویسے مجھے کچھ زیادہ ہی برلا پڑا ہوا تھا۔ شامی عورتیں کس مزے سے کولہے مٹکاتی اور سینے اُچھالتی پھرتی تھیں۔ پر اب میری بھی تو بڑی مجبوری تھی کہ جن کے ساتھ آئی تھی اور جہاں ٹھہری تھی وہاں تو اس بڑی عیاشی کو چھوڑ کوئی چھوٹی سی عیاشی بھی ممکن نہ تھی کہ اِس ماسی مصیبتے کو گولی مارتی اور سکون سے ڈوپٹہ گلے میں ڈالتی اور لگی پھرتی۔ چلو چھوڑو میرے رنڈی رونے۔

یوں آج صبح جانے کس بدبخت کا منہ دیکھا تھا۔ پہلی نحوست فاطمہ نے پھیلائی کہ طبیعت کی خرابی کا کہتے ہوئے ساتھ جانے سے منکر ہوئی۔ نسرین کا بھی کچھ موڈ نہیں تھا۔ رہ گیا علی تو ظاہر ہے وہ کیسے جا سکتا تھا۔ اکٹھے ہونے سے خرچہ کتنا کم ہوتا تھا۔

ٹیکسی کی تلاش میں جب اِدھر اُدھر نگاہیں بھٹکتی پھرتی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکے نے جو

میرے سامنے ہی اس میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے سر نکال کر انگریزی میں کہا۔

''آپ کو کہاں جانا ہے؟''

میں نے نیشنل میوزیم کا بتایا۔

''مجھے بھی وہیں قریب ہی جانا ہے۔ آپ بیٹھ سکتی ہیں۔ اگر آدھا کرایہ دیں۔''

اگر وہ مجھے مفت لفٹ کی پیش کش کرتا تو شاید میں چند لمحے تذبذب میں پڑتی کہ یہ آج کے زمانے میں خود پیشکش کرنے والا بڑا حاتم طائی ہے۔

مگر اِس کاروباری سودے نے مجھے "فوراً ٹھیک ہے" کہنے کے ساتھ دروازہ کھولنے کا بھی کہہ دیا تھا۔ لڑکے کا یہاں زینبیہ میں جنرل سٹور تھا۔ انگریزی اچھی تھی تو باتیں ہونے لگیں۔ ملکی حالات بابت پوچھا تو لڑکے کا لہجہ بڑا دوٹوک تھا۔

''ارے بھئی ہم تو بڑے خوش ہیں۔ میرے باپ کا کہنا تھا کہ حافظ کا زمانہ اچھا تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بیٹے کا بھی کچھ کم نہیں۔ شام نے ترقی بھی تو خوب کی ہے۔ جانتی ہیں ہمارے ملک کا فی کس جی ڈی پی پانچ ہزار سے کم نہیں۔ شام اپنے وسائل کے اعتبار سے بھی کوئی بہت خوش قسمت ملک نہیں۔ پھر بھی یہ اسد فیملی کا کمال ہے۔''

وہ 2008 کا زمانہ تھا۔ پیسے میں کھیلنے والا وہ نوجوان دکان دار نہیں جانتا تھا کہ صرف دو سال بعد ہی خشک سالی جیسا ظالم دیواس کی اتنی ڈینگوں کا گلا گھوٹنے والا ہے اور سول وار جیسا عفریت اِس خوبصورت ملک کو تباہی کے کنارے پہنچانے والا ہے۔

سیاہ آہنی گیٹ سے میں نے دیکھا تھا کہ لڑکا جہاں اُترا وہ بڑا بارونق علاقہ تھا۔

''یہ الفرات سٹریٹ ہے۔ یہاں سے میوزیم قریب ہی ہے۔''

لڑکے نے باہر نکل کر میری توجہ اس شاہراہ کی جانب کروائی جہاں کھڑا وہ ٹیکسی ڈرائیور کو پیسے دے رہا تھا۔

میں نے دو سو لیرا اُسے دینے چاہے، مگر مختصر سے سفر اور بات چیت نے تھوڑی سی دید شرم پیدا

کر دی تھی۔ منہ پھاڑ کر جس منہ سے اُس نے آدھے کرایے کی بات کی تھی اسی سے وہ اب رہنے دیجئیے کہتا تھا۔

''مجھے تو یہاں تک آنا ہی آنا تھا۔آپ اسے بس پچاس لیرا دے دیں۔''

یہ تکیہ ال سلیمانیہ کے پاس ہی تھا۔خوبصورت علاقہ ہریالیوں میں ڈوبا خوبصورت منظروں کا عکاس تھا۔ میوزیم بڑے بارونق اور مصروف علاقے میں تھا۔ٹیکسی سے اُتر کر درخت کی چھاؤں تلے کھڑے ہوکر میں نے سیاہ آہنی گیٹ سے دیکھا۔اندرونی مناظر کے نظاروں نے رگ رگ میں ٹھنڈک اور لطافت کا احساس دوڑا دیا۔

مرکزی عمارت کا چہرہ مہرہ بڑا ہی دل کش نظر آیا تھا۔گول نصف قوسی صورت والے ستون اور اُن سے اُبھرتا تاثر توپ کپی سرائے میوزیم کے مرکزی گیٹ کے سے رنگ ڈھنگ سے مشابہ نظر آتا تھا۔وقار صورت سے چھلکتا تھا۔بلندی تو ایسی تھی کہ گویا آسمان کو ہاتھ لگانے کا مقابلہ درپیش ہو۔عظمت حال کا نظارہ بہرحال متاثر کن تھا۔فوارے کے کنارے پر درختوں کی قطاریں،سبزہ،پودے،بوٹے اور اطراف کے لان سب خوشی سے نہال کرتے تھے۔کیفے ٹیریا نے بھی خوشی دو چند کی تھی۔

یہاں سکون سے بیٹھ کر سنیکس اور چائے کافی یا ڈرنک پینے کا بھی اپنا مزہ ہے۔

ہر ملک کا میوزیم ہمیشہ کمزوری رہا۔ پاہڑوں کی طرح بھاگی جاتی تھی۔اب تھوڑی سی رج بج گئی ہوں۔مگر ہر ملک اسے نک سک سے سجاتا اور اس کی نمائش کے لئے مرا بھی جاتا ہے۔یقیناً سیاحوں کو متاثر کرنا بھی تو مقصد ہوتا ہے کہ اے آنے والو ہمیں ننگے بُچّے مت سمجھنا۔بڑا کچھ ہے ہمارے پاس۔تو یہی کچھ یہاں تھا۔گو میں نے تو داخل ہوتے ہی فوراً کہہ دیا تھا کہ

''بھئی اب تم لاکھ کہو مگر ابھی چھوٹے ہو اور مختصر بھی۔''

تاہم یہ پورے پانچ حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ایک حصہ تو وہی مخصوص قبل از تاریخ کا۔دوسرا ونگ قدیم ترین شامی نوادرات سے متعلق تھا۔اسلام سے قبل عرب اور اسلامی دور تھا۔ماڈرن حصہ بھی تھا۔

پہلے تو تھوڑی سی معلومات لیں۔ بائیں ہاتھ کا پورا ونگ یونانی، رومن اور بازنطینی ادوار کے artifacts سے سجا کوئی 300 قبل مسیح سے لے کر تقریباً دس صدیوں تک کا نمائندہ تھا۔ سکندر اعظم کی فوجوں کا اِن علاقوں میں آنا اور یہاں جھاڑ وپھیر دینا۔ یہ بھی عیاں تھا۔ بقیہ حصّے سب اپنے اپنے ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ پھر جیسے وقت کی گردش کچھ شہروں کو ملیامیٹ اور کچھ کو وجود میں لانے کا باعث بنتی ہے۔ ابر سا پلمیرا Palmyra، شاہبا اور اسی جیسے کئی دوسرے تاریخ ساز شہر وجود میں آئے۔

پورا ہال پلمیرا Palmyra کا نمائندہ تھا۔ اِس ہال کی پوری دیوار موزیق Mosaic کے کام سے سجی ہوئی تاریخ سناتی تھی۔ پردھان تو وہی Cassiopeia ہی لگی۔ اپنی خوبصورتی پر نازاں دنیا کی حسین ترین جل پری۔ کیا بات تھی۔ بہت دیر کھڑے رہ کر اس کا نظارہ کیا۔

پاسی ڈون Poseidon (سمندر کا دیوتا) پر نظر پڑتے ہی مشہور زمانہ اساطیری کہانی بھی یاد آ گئی تھی۔ Cassiopeia بھی کیسی چالاک تھی۔ ڈورے ڈالتی تھی پاسی ڈون پر۔ وہ بھی کیسا کائیاں تھا۔ مجبور کر رہا تھا اُسے کہ اپنی ماں کو اس کے ملک بھیجے اور اس کی ماں کو مجبور کرے کہ وہ اپنی بیٹی اینڈرومیڈ Andromedd کو اس پر قربان کرے۔

انسانی فطرت کی تیزیاں اور چالاکیاں ازلوں سے کیسے کیسے قصے کہانیوں کو جنم دیتی ہیں۔ اسی طرح یہاں رصافہ Rasafa کی بھی دومحرابی ستونوں کی فنکاری بڑی موہ لینے والی تھی۔

ایک اور چیز بھی خاصی حیران کرنے والی تھی اور وہ تدفینی بستر تھے۔ یہ عام طور پر حصّوں میں بنائے جاتے تھے۔ نچلا حصّہ فیملی ممبران کے لئے اور اوپری حصّہ مرنے والے کے مجسمے سے سجا ہوا، بیٹھا ہوا یا لیٹا ہوا۔ اس کی منطق سمجھ نہیں آئی تھی کہ تب تو خدائی زمین کا بھی کوئی قحط نہ تھا۔ ڈھیروں ڈھیر پڑی تھی۔ تو پھر مردوں کو ہمہ وقت چھاتی پر مونگ دلنے کے لئیے سجانے کی کوئی تک تھی بھلا۔

ملحقہ بڑے ہال نے مجھے حیرت زدہ کیا تھا کہ میں پلمیرین آرٹ کی گھمبیرتا کو دیکھتی اور خود سے کہتی تھی کہ چہروں پر بکھرے تاثرات کی کِس درجہ خوبصورت عکاسی ہے۔ ایک جیسے قد وقامت کے مجسموں میں سے ہر ایک کے تاثرات کتنے مختلف اور جداگانہ تھے۔ ملبوسات، زیورات، کڑھائی اُن کی

بناوٹ سب بتاتے تھے کہ زمانہ اُس وقت بھی ثقافتی سطح پر بڑا امیر اور مالا مال تھا۔

ملحقہ ہالوں میں بہت کچھ تھا۔دُرا Dura شہر سے متعلق اس کے میناروں، دیواروں اور اس کے دیوتاؤں کے مجسموں کے۔

اگلے کچھ ہال میں نے چھوڑ دیئے تھے۔جسٹن اول، دوم اس کی بیوی صوفیہ اور بازنطینی عہد کے نمونے۔دراصل بہتیرے دیکھے بیٹھی تھی۔

رومن حصّہ خاصہ مزے کا تھا۔ایک تو رومن عورتوں کا حُسن بڑا قاتلانہ تھا۔افسوس کچھ کے سر کٹے ہوئے تھے۔کیا بات تھی جی چاہتا تھا کہ وہ مجسمہ ساز سامنے ہوں تو جھک جاؤں ان کے چرنوں میں۔ہاتھ چوم لوں اُن کے جنہوں نے انہیں تراشا۔تاثرات سے گندھے ہوئے۔بڑی ہی پیچیدہ گھتیاں تھیں مذہب اور اس کے فلسفے کی جن کی یہ داستانیں سناتے تھے۔ایک دو بار تو نگرانوں سے مدد چاہی اور انہوں نے کی بھی۔پھر سوچا کہتے ہوں گے کتنی نکمی عورت ہے۔کچھ پتہ ہی نہیں اسے تاریخ کا۔

اوپر کی منزل میں بازنطینی دور کے جیولری ہال تھے۔یہاں زیورات تھے۔کیا بات تھی بھئی اُن کی بھی۔گو مجھے زیورات کا کچھ شوق نہیں۔سونے کی ذرا طمع نہیں۔پاس رتی تولہ نہیں مگر کیا ہوا؟ حسین نہیں تو حُسن کو پسند کرنے والے تو ہیں نا۔کانوں کو پہننے والی بالیوں اور بالوں کے ڈیزائنوں کا ہی حساب نہ تھا۔ایسے شاندار کہ جی چاہے اٹھا کر سب کچھ لے جاؤں۔

انسانی چہروں کی قیمتی پتھروں پر جتنی خوبصورت کندہ کاری مجھے یہاں نظر آئی تھی وہ بھی کیا کمال کی تھی۔سب سے خوبصوت اپالو کا مجسمہ تھا۔روبی کے پتھروں سے سجا دائیں ہاتھ میں کمان اور بائیں میں تیر کے ساتھ۔آرٹسٹ کے باکمال ہاتھوں نے طاقت اور تاثرات کا بھرپور اظہار اس کی صورت میں مجسم کردیا تھا۔یہاں پتھروں کی بھرمار تھی۔

فسٹ فلور کی لابی میں سے گزرتے ہوئے میں نے کچھ تانکا جھانکی نہیں کی۔گو وہاں دھرے ماربل کے دیوی دیوتاؤں کے مجسموں نے مجھے آوازیں دیں کہ ہمیں دیکھے بغیر ہی جارہی ہو؟

تاہم کان منہ لپیٹ آگے بڑھ گئی۔ہائے اِن میں پھنس گئی تو بس گئی۔سکوں سے بھی کبھی کوئی

دلچسپی رہی نہیں تھی۔ سکہ رائج وقت سے ضرور تھوڑا سا تعلق رکھتی ہوں۔ عرب اسلامک ونگ کو بھی دیکھا۔ سب سے زیادہ شوق سے برتنوں کو دیکھا۔ کندہ کاری سے محظوظ ہوئی۔

دو چیزوں نے بہت متاثر کیا۔ خوبصورت ہال جو دمشق ہال تھا۔ لکڑی اور ماربل سے سجا ہوا۔ دروازوں کے پٹ، کھڑکیاں، الماریاں، چوب کاری کے اتنے رنگ ڈھنگ، اتنے انوکھے ڈیزائن اور نقش ونگاری کا منفرد کام۔ یہاں تصویریں بنانا ممنوع تھا۔ کمرے میں بیٹھے نگران سے ملتجی لہجے میں درخواست کی۔ اُس نے پذیرائی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میں باہر نکل کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آپ بنا لیجیئے۔''

گوشام کی قدیم ترین تہذیبوں کے نمائندہ تو کئی ہال تھے۔ تاہم میوزیم کے عملے کی راہنمائی کرنے پر اُس ہال میں گھسنا پڑا۔ جہاں 11 سے 14 قبل مسیح کے زگورت زبان کے حروف ابجد دیکھنے کو ملے۔ تیس (30) حروف پر مشتمل۔ ہر علامت ایک حرف کو ظاہر کرتی۔ اسی طرح ماری ہال کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ ماری کے فنکاروں نے اپنے بادشاہوں، ملکاؤں اور دوسری مقتدر شخصیات کے مجسمے بنائے۔ ان میں دیوی اشطر اور اس کا شاہی محل جو کہ دنیا کا خوبصورت ترین محل تھا۔ ان کے مجسموں کی ایک خصوصیت کہیں ان کے ہنستے مسکراتے چہرے ہیں یا پھر خاموش اور سنجیدہ سے۔

اور جب میں میوزیم کے ہال میں اص سلام As-Salam سکول کے بڑے بچوں کو پینٹنگ اور سکیچنگ کرتے اور چھوٹے چھوٹے معصوم صحت مند گورے چٹے بچوں کو کہیں رنگین پینسلوں اور کاغذوں پر ڈرائنگ کرتے اور رنگ بھرتے دیکھتی تھی تو یہ جانی تھی کہ سکولوں کے بچے اکثر و بیشتر یہاں آ کر یہ کام کرتے ہیں۔

میں نے ادھیڑ عمر کی خاتون استاد سے تعلیمی معاملات پر بات چیت کی تو جانی تھی کہ حکمران تعلیم کے معاملے میں بہت سرگرم ہیں۔ اس میدان میں وہ کسی طرح بھی اپنے ہم عصر ملکوں ایران اور سعودی عرب سے کم نہیں کہ نوّے فی صد بچے سیکنڈری لیول تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہر دس میں سے 8 نو لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ ہر طرح کی فنی اور طبّی تعلیم کے لئے حکومت پورے وسائل مہیا کرتی

اور نئی نسل پر پیسہ خرچ کرتی ہے۔

اللہ میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی ہی۔ بغداد یونیورسٹی کے وہ اُستاد یاد آئے تھے جنہیں اقتصادی پابندیوں پر غصہ تھا۔جنہیں اپنے ملک کا فی کس جی این پی تین ہزار ڈالر سے پانچ سو ڈالر تک آجانے کا دکھ تھا۔انہیں اپنے ملک کے نظام صحت، نظام تعلیم، اپنے سکول، کالج، یونیورسٹیاں، اپنے اسپتال پورے مشرق وسطیٰ میں بہترین ہونے پر فخر تھا۔

اور اب یہی حال اِس ملک کا بھی ہو رہا ہے۔کہاں کی تعلیم اور کہاں کی صحت؟ لاکھوں افراد ہلاک اور لاکھوں ہی بے گھر ہو چکے ہیں۔ایلان کردی کی ترکی کے ساحل پر پڑی لاش نے کتنا رلایا ہے۔ معصوم بچہ اپنے والدین کے ساتھ بحر روم کے راستے یونان میں داخل ہونے کے لئے اپنے اُن لاکھوں ہم وطنوں کی طرح امن کی تلاش میں کسی کشتی میں بیٹھا تھا۔ بے رحم موجوں نے پہلے ڈبویا پھر ساحل پر پھینکا۔سرخ ٹی شرٹ نیوی بلیو نیکر اور بوٹ پہنے ایلان کردی جیسے سو رہا تھا۔کتنا واویلا مچا تھا مگر کچھ ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔

کافی شاپ سے کافی پیتے اور بسکٹ کھاتے ہوئے میں نے گردوپیش کو دیکھا تھا۔دراصل میوزیم کے سامنے بڑے دلفریب منظروں کا سلسلہ آگے پیچھے سے سامنے آیا تھا۔ بلند وبالا عمارات کے سلسلے بڑے دلفریب تھے۔زردی پہاڑوں پر بکھرا شہر جس کی مسجدوں کے بلند وبالا مینار چمکتے اور آنکھوں میں کھُبے جاتے تھے۔ہوا میں تمازت ضرور تھی مگر کھجور کے درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر چلتے ہوئے اسمیں ایک نغمگی سی بھی گھُل جاتی تھی۔گلاب اور چنبیلی کی مہک میں فسوں سا مسحور کرتا تھا۔پودوں اور بوٹوں کا ہرا کچور رنگ آنکھوں میں طمانیت بھری ٹھنڈک اُتار رہا تھا۔

مجھے بہت دیر بعد احساس ہوا تھا کہ اب مجھے اٹھ جانا چاہیے۔

☆☆☆

باب نمبر 33:

تین سو سال پرانا النفورا کیفے Nofora میں
ابو رشیدی حکاوتی

پرانے دمشق میں داخل ہوتے ہی علی نے با آواز بلند حکم صادر کر دیا تھا کہ اب واپسی رات کو ہی ہوگی۔ دو پہر کا کھانا شیش طاؤس کباب اور بقدش آئس کریم پر ہوگا۔ پھر ادھوری ڈکشٹ کی فلم دیکھی جائے گی۔ رات کو پرانے دمشق کے کہانی گھر میں کہانی سُننے جائیں گے۔ علی کے نام کا نعرہ لگانے کو جی چاہا اور لگا بھی دیا۔

پرانے دمشق کو کہیں رات کی جگمگاتی اور کہیں نیم روشن زرد روشنیوں میں دیکھنا دلکش نہیں ایک فسوں خیز تجربہ تھا۔

ایک تو رات کے ان لمحات میں کہیں تنگ کہیں کشادہ گلی کوچوں کا نیم تاریکی میں ڈوبا حُسن اوپر سے بلند و بالا دیواروں میں چوبی کندہ کاری سے مزین بالکونیاں اور دریچے اس پر طُرّہ گلیاروں سے گزرنے کی اپنی خوب صورتی۔

دمشق آنے کے بعد تین چار دن تک مسلسل ایسے ہی گلی کوچوں سے گزری تھی۔ سورج کی تیز روشنی میں اور کہیں بلند و بالا دیواروں کے سایوں میں لپٹے مناظر نے بہت متاثر کیا تھا۔ مگر دن کی روشنی میں حُسن کا انداز کچھ اور نوعیت کا تھا۔ گو خوبصورتی کے چھلکاؤ کی تو کمی نہ تھی۔ مگر فرق تھا۔ وہی فرق جو دن اور رات میں ہوتا ہے، جو حقیقت اور خواب میں ہوتا ہے۔

تاہم رات کو اس کے خوابناک سے ماحول نے یہاں طلسم کا جو جہان وا کیا ہوا تھا اس نے تو ہوش و خرد پر بجلیاں گرا دی تھیں۔ لگتا تھا جیسے یہ رومانوی اور اساطیری ماحول کہیں ہارون الرشید کے

زمانے میں لئے جا رہا ہے۔ہم چاروں کا ٹولہ دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھتا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا تھا۔علی ہمیں یہاں داستان سنانے لایا تھا۔یہ وہیں امیہ مسجد کے مشرقی دروازے کے قریب ہی تھا۔

ال نوفورا کیفے کے سامنے بہت دیر رکنا پڑا تھا۔ ہری بیلوں والے معلق گملے جا بجا خنکی اور تازگی کا احساس بکھیرتے تھے۔ برآمدے کا فرش سے چھت ستونوں سے برآمدے کے چوبی شیڈز تک چوبی کٹاؤ میں لٹکتے آرائشی بُندے، دیواروں سے جڑی بڑی پینٹنگز، چوبی کھڑکیاں اور پھولوں بیلوں سے ڈھنپا نیم قوسی آہنی دروازہ جو دور دیسوں سے آنے والے مہمانوں کو دمشق کی قدامت میں لپٹی ہواؤں میں خوش آمدید کہتے ہوئے دعوت دیتا تھا۔ کہتا تھا۔

آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ میں تمہیں اُڑن کھٹولے پر بٹھا کر قرون وسطیٰ کے اس دور میں لے جاؤں گا جہاں تم تعمیراتی حُسن کے نادر نمونے، خیال وفن میں ڈوبے آرٹ کے شاہکار، انگلیوں کی کرشماتی مہارت کے دلآویز معجزوں کی ایک دنیا دیکھوگی۔

اور جو کہانی تم یہاں سنوگی اس میں شام اور عرب دنیا کے آباؤاجداد کی تہذیبی خوشبوئیں چنبیلی جیسی مہک لئے ہوئے ہوں گی۔آج کے دمشق کی گلیوں میں کھلنے والے گلابوں کی مہک صدیوں پہلے کے گلابوں جیسی محسوس ہوگی۔

جب دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو شیشہ پیتے اور موج مستیاں کرتے دیکھتے آگے بڑھے تو ایک بڑا کمرہ برآمدے کی ہی طرز کا، دیواریں، چھت، آرٹ اور چوبی کندہ کاری کے نمونوں سے سجا نظر آیا تھا۔ کس قدر خوابناک ماحول تھا۔ جو کہیں صدیوں پہلے اُس دور میں لے جاتا تھا جب یہ سب سٹریٹ لائف کا حصہ تھے۔تاہم جب عثمانی دور میں کافی کا راج ہوا تب کافی ہاؤس رواج پکڑ گئے۔

ہم بمشکل وقت پر ہی پہنچے تھے۔تاہم دروازے کھڑکیاں کھلے تھے۔ایک چبوترہ علیحدہ سے بنا ہوا تھا۔ دیواریں، تصویریں اور مجسموں سے سجی ماحول کو اور تاریخی بناتی تھیں۔شیشہ، قہوہ پیتے لوگ جو دائرے کی صورت بیٹھے عنترہ بن شداد کی کہانی سنتے۔اسلام سے پہلے کے دور کی شہرہ آفاق کہانی۔چھت کے پنکھے کی سست رفتار گردش ہنی ایپل تمباکو کی خوشبو اور پودینہ ملے قہوے کی مہک کو فضا میں بکھیر رہی تھی۔

چبوترے کی کرسی کے دائیں بائیں دو آدمی بیٹھے شیشہ پیتے تھے اور اس کی ڈرامائی حرکات سر دھنتے تھے۔ یہ پیٹرن تھے۔ جو کہانی کو بڑھاوا دینے اور اس کی تمثیلی صورت گری میں معاونت کرنے کا کردار ادا کرتے تھے۔

کہانی سنانے والا سٹیج پر دھری ایک خوبصورت چوبی کندہ کاری سے مزین کرسی پر بیٹھا ایک ادھیڑ عمر کا سرخ وسفید مرد نظر آیا تھا۔ ہاتھ میں کتاب پکڑی تھی اور تمثیلی انداز میں کہانی کا بیانیہ جاری تھا۔ ایک ہجوم اپنی آنکھیں اور کان حکاوتی کے چہرے اور ہونٹوں پر چسپاں کئے ماحول میں غرق نظر آتا تھا۔ قصہ گوئی کی مرکزی زبان تو عربی تھی تاہم بیچ بیچ میں جرمن اور فرانسیسی کے تڑکے بھی لگتے تھے۔ اس کا اندازہ ہمیں وہاں بیٹھے حاضرین کے انداز سے ہوتا تھا۔

حکاوتی کا حلیہ بھی بڑی رومانیت سی لئے ہوئے تھا۔ سرخ ترکی ٹوپی سر پر سجی لشکارے مارتی تھی۔ بالشت بھر چوڑا ماتھا ٹوپی سے زیادہ لشکارے مار رہا تھا۔ آنکھوں پر گول شیشوں والی پتلی کمانی دار عینک چڑھی تھی۔ کمر میں عربی دولہوں جیسا تام جھام والا پٹکا تھا۔ پتلون بھی بڑی کھلی ڈلی بیگی سٹائل کی تھی۔ پرانے دمشق کے بہت سارے نادر تحفوں کے ساتھ یہ ابورشید حکاوتی بھی ایسا ہی ایک بیش بہا تحفہ تھا۔ عربی زبان اپنے مخصوص رنگ وآہنگ میں گندھی کسی بھاری ہوا کے جھونکے کی مانند ہمارے سروں کو چھوتی گزرتی تھی۔

بیس سال سے وہ دمشق کا ایک اہم سیاحتی کردار بنا لوگوں کی تفریح کا باعث تھا۔ اس کیفے میں وہ صدیوں پرانے عرب جنگجوؤں، رزمیہ داستانوں اور لوک رومانی کہانیوں کو سنا رہا ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں یہ فن نسل درنسل چلتا رہا۔ کچھ خاندانوں نے اسے چھوڑ دیا۔ تاہم رشید حلاق باپ دادا کے اس فن سے جڑا اپنی منفرد پہچان بناتا رہا۔

اور جب پاکستان کے اخبار ہر روز شام کے حوالے سے جنگ کی کوئی نہ کوئی خبر شائع کر رہے تھے۔ اور جب دمشق کے لوگوں کی ملنے والی ای میلیں مجھے رلاتی تھیں۔ تب ایسے ہی ایک دن نفورا بھی یاد آیا تھا۔ سوچا پوچھوں تو سہی وہ داستان گوئی کا مرکز کس حال میں ہے؟ بہت دلگیر سی تحریر تھی احمد فاضل کی

جوسکرین پر نمودار ہوئی تھی۔

جنگ نے ملک اور لوگ ہی نہیں تباہ کئے بلکہ اُن قدیم روایتوں پر بھی کاری ضرب لگائی جو ملک کا حسن تھیں۔

اس چھ سالہ جنگ نے اُسے بھی توڑ کر رکھ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے تو ٹی وی اور الیکٹرانک میڈیا کے دیگر ذرائع نے بھی اتنا متاثر نہیں کیا تھا۔ گو لوگوں نے تب کہنا شروع کر دیا تھا کہ لعنت بھیجو اس کام پر۔ اس کی ساری فینٹسی کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ مگر اس نے جی داری اور صاف گوئی سے کہا۔

''مجھے تو اور کوئی کام ہی نہیں آتا۔ بچپن سے میں نے اپنے والد کو یہی تو کرتے دیکھا۔ میرا بچپن تو ان نایاب تیس والیوم پر مشتمل کہانیوں کو ہی پڑھنے میں گزرا۔''

دمشق کے مضافات کا مشرقی حصہ جولڑائی میں میدان بنا جنگ ہوا تھا۔ جہاں اس کا گھر تھا۔ دو منزلہ گھر کا نچلا حصہ جو اس نے گروسری سٹور بنا رکھا تھا کہ اضافی آمدنی ضروری تھی۔ ایک دن ایسی بمباری ہوئی کہ گھر زمین بوس ہو گیا۔ سودا لینے والی ایک معصوم بچی اور ایک مرد دونوں ملبے کے نیچے آ کر مر گئے۔ بیوی بچ گئی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر وہ پاگل سا ہوا اٹھا۔ دکان میں مرنے والی معصوم بچی اور مرد نے اُسے توڑ دیا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ لبنان بھاگ گیا۔ جہاں اس کا بیٹا رہتا تھا۔

اس جنگ نے بہت کچھ گنوایا تو وہیں وہ پرانا تاریخی کردار بھی فرار ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لبنان میں امن تھا۔ اس کا بیٹا اس کے پاس تھا۔ مگر وہاں اس کا دمشق تو نہیں تھا۔ اس کا اپنا دمشق اس کا شام جس کے شہروں پر ہر روز بمباری تباہ کن شیلنگ اُسے رُلاتی۔ وہ مضطرب اور بے قرار تھا۔

اس کی واپسی اُس وقت ہوئی جب اُسے سیرین ٹیلی ویژن پر کہانی سنانے کی پیشکش ہوئی۔ وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

''جو دورانیہ ملا ہے وہ صرف پندرہ منٹ کا ہے۔ لوگوں کے پاس گھنٹے بھر کا وقت نہیں تاہم میرے ملک کے پرانے شہر سلامت رہیں۔ اُن کی آب و تاب جگمگاتی رہے۔ سیاح آتے رہیں۔ لوگ کتنے ہی ماڈرن کیوں نہ ہو جائیں۔ اُن کے اندر ماضی میں جانے کی ہڑک رہتی رہے۔''

میں آگ اور خون میں نہاتی اُن فضاؤں سے واپس 2008 کی اُس خوبصورت رات کے اُن خوبصورت لمحوں میں اُترتی ہوں مجھے وہ کہانی یاد آرہی ہے جو اس رات ہم نے سُنی تھی۔

Antarah ibn Shaddad عنطرہ بن شداد وہی فلموں والے منظر پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش ہورہی تھی۔ سمجھ نہ آنے کے باوجود کچھ نہ کچھ سمجھا۔ کم از کم اُس کا انداز بیان۔ جو کہیں دریا کی شوریدہ سرموجوں جیسا کہیں چودھویں کے چاند میں نہاتی سرسراتی ہواؤں کی سرگوشیوں جیسا۔جی میں آتا ہے تشبیوں اور استعاروں کا ڈھیر لگادوں یہ کہانی ایک شاعر ایک نواب knight اور ایک غلام جس نے اپنی ذاتی خوبیوں سے بے حد عزت اور بے حد حوصلے اور جی داری سے جنگوں میں بڑی عزت کمائی تھی۔ کے گرد گھومتی تھی۔

کہانی کے خاتمے پر میں نے پوچھا تھا کہ کونسی کہانی ایسی ہے جو بہت ذوق وشوق سے سنی جاتی ہے؟ معلوم ہوا کہ یہی جو سنائی گئی ہے۔ زمانہ قبل از اسلام کی انطر ہیرو کی کہانی، جو ایک غلام عورت کا بیٹا بہادر، دلیر اور جیالا جنگجو ساتھ ہی شاعر بھی۔ جسے خوبصورت شہزادی ابلا سے محبت ہوگئی تھی۔ جسے حاصل کرنے کی دلچسپ داستان لوگوں کو بہت پسند ہے۔ ایک اور بہت سنی جانے والی کہانی سلطان بیابارکی تھی۔ قرون وسطیٰ کا مصری حکمران جس نے صلیبی جنگیں لڑیں۔ ترجمان نے کہانی کا خلاصہ انگریزی میں بھی بیان کردیا تھا۔ جنگ نے ملک اور لوگ ہی نہیں تباہ کئے۔ اُن قدیم روایتوں پر بھی کاری ضرب لگائی جو ملک کا حُسن تھیں۔ کیفے کے مالک محمد رباط نے گہرے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔ تین سو سال قدیم اِس کیفے میں ہمیشہ ہی کہانی سنانے والا رہا۔ بے شک ملک میں ٹی وی چینلز آئے مگر ال نفورا میں کہانی سنی جاتی رہی۔ جنگ نے تو سب کچھ تباہ کردیا۔ ہلق کا گھر تباہ ہوگیا۔ نقاب پوشوں نے اس کے بیٹے کے اغوا کی دھمکیاں دیں۔ تاہم پھر بھی وہ ڈٹا رہا۔ کہانی سناتا رہا۔ ہر روز نہیں۔ ہفتے میں ایک دن۔ اور پھر دمشق میں ہی فوت ہوگیا۔ یقیناً اس کی لگن سچی تھی کہ وہ اپنے ملک میں مرنا چاہتا تھا۔ سلامت رہے نفورا سلامت رہیں وہ نئے کہانی گو۔ اور لوٹے شام کا وہ حسن جو آنکھوں کے راستے دل میں کھلتا چلا جاتا تھا۔

بس یہی دعا لبوں سے نکلتی ہے۔

باب نمبر 34:

اُمّ ناجی، ایک پہلو یہ بھی ہے تصویر کا

اُمّ ناجی ہوں میں۔ اپنے اکلوتے بیٹے ناجی کی ماں، حلب جانے والی مرکزی شاہراہ پر ال نبک Al-Nabk نامی شہر سے میرا تعلق ہے۔ تین بے حد خوبصورت اور پیارے بچوں کی ماں۔ بچوں میں سب سے بڑی بلقیس ہے جو دمشق یونیورسٹی میں آرکیٹیکٹ (علم فن تعمیر) کی طالبہ ہے۔ اس کے بعد ناجی جو ہائی سکول میں پڑھ رہا ہے۔ سحر سب سے چھوٹی ہے۔ کنڈر گارٹن میں جاتی ہے۔ میں نے اقتصادیات (اکنامکس) کی تعلیم حاصل کی لیکن کبھی ملازمت نہیں کی۔

میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیئے خود کو وقف کر دیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ موسیقی اور شاعری سیکھیں۔ سکول میں اچھی کارکردگی دکھائیں۔ اپنے ملک کے لیئے اچھے اور قابل فخر شہری بنیں۔ لیکن جب شام میں بحران پیدا ہوا (پھیلا) تو میرے لیئے ذاتی مفاد کی بجائے قومی مفاد زیادہ اہم ہو گیا۔

درعا کے واقعے پر مجھے شدید افسوس تھا۔ بچوں کو اپنی تعلیم پر توجہ دینا زیادہ اہم ہے۔ الٹی پلٹی سرگرمیوں پر والدین کو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ درعا کی دیکھا دیکھی چھوٹے شہروں میں بھی یہ وبا پھیلنے لگی تھی۔

آواخر اپریل 2011 میں میرے گھر کے قریب کچھ احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ لیکن جیسے ہی فوج کی گاڑیاں نظر آتیں ہر کوئی بھاگ جاتا۔ مجھے ہنسی آتی کہ بھئی اب بھاگتے کیوں ہو؟ کھڑے رہو۔ جو کر رہے ہو کرتے جاؤ۔ پھر میں نے گلیوں میں لوگوں کو احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ احتجاج کیوں کر رہے ہیں؟ شام ایک محفوظ اور صحیح سلامت ملک ہے۔''

وہ میرے ساتھ بحث مباحثہ اور لڑائی جھگڑے پر اُتر آتے۔ میں جتنی چاہے تاویلیں اور دلائل دیتی وہ گاجر مولی کی طرح انہیں کاٹ دیتے۔ تاہم کچھ باتوں میں وہ بھی حق بجانب تھے۔

مجھے تو اپنی خالہ اور اپنے کئی دوستوں کو ان احتجاجی مظاہروں کی حمایت کرتے ہوئے دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اُن کا شمار حکومت کے مراعات یافتہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں انہیں کہتی۔

''آپ دمشق کو تباہ کر رہے ہیں۔''

لیکن جیسے انہوں نے اپنے کان بند کر لیئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں۔

میں یعنی اُمّ ناجی اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ مظاہرین کی اس تحریک میں آزادی کی سچی تڑپ کی بجائے ''ذاتی مفادات'' تھے۔

ایف ایس اے (فری سیریئین آرمی) نے علاقہ کو تقریباً ایک سال تک کنٹرول میں رکھا میری کبھی کبھی آتے جاتے اُن سے تکرار ہو جاتی کہ وہ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ انہیں جھوٹے خواب دکھا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ انہوں نے مجھے برداشت کیا۔ پھر مجھے دھمکی دینے لگے کہ اگر میں نے حکومتی فوج کی حمایت ترک نہ کی اور اپنے گھر کی چھت سے شام کا قومی پرچم نہ ہٹایا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے اور میرے بیٹے ناجی کو اغوا کر لیں گے۔''

میں اُن کی دھمکیوں سے کبھی متاثر نہ ہوئی۔ شام کا پرچم میرے گھر کی چھت پر لہراتا رہا کہ وہ میرے لیئے ایک مقدس علامت کی مانند تھا۔ اُس کے لہرانے میں میری چاہتیں اور محبتیں تھیں۔

وہ لوگوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھمکاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تحریک

(آزادی) سے پہلے ہم سب لوگ حتیٰ کہ متوسط اور نچلے متوسط گھرانے بھی اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ چھٹیاں گزارنے کہیں بھی اِدھر اُدھر جا سکتے تھے۔ اچھا کھاتے پیتے اور ادویات خرید سکتے تھے۔

وہ لوگ جو مظاہرے کر رہے تھے۔ انہیں رشوت دی گئی کاروبار اور حکومتی عہدوں کی۔ لوگوں کو ان کے بھائیوں کو مارنے کے لیئے اور ہتھیار خریدنے کے لیئے رقوم ادا کی گئیں۔ مظاہرین کو یہ کہہ کر سبز باغ دکھائے گئے اور وعدے کیئے گئے کہ ایک نئی حکومت میں انہیں وزراتی، سفارتی ذمہ داریوں پر متمکن کیا جائے گا۔

وہ لوگ جنہوں نے مظاہرے کیئے اور دعویٰ کیا کہ وہ آزادی کے خواہش مند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذاتی مفاد تھے نہ کہ ایک قومی مقصد پیش نظر تھا۔ وہ ان اولین لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے خاندان والوں کو پہلے باہر بھیجا تھا۔ بعد میں وہ احتجاجوں میں شریک ہوئے۔

فری سیرین آرمی نے جس قدر دھاندلیاں کیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں۔ حکومت نے لوگوں کو بنیادی خوراک کے لیئے کوپن دیئے جنہیں ایف ایس اے نے اپنے لیئے چھین لیئے۔ ان کے راہنما دمشق کی جانب جانے والے اشیاء سے بھرے ٹرکوں کو اغوا کر کے امیر بن گئے تھے۔

ایف ایس اے (فری سیرین آرمی) (الجیش السوری الحر) نے ایسے بہت سے کام کیئے جس کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے۔ ان کے پاس ہر چیز تھی۔ ہتھیار، کاریں، پراڈو، پجاروں، کوئی بھی گھر جو وہ چاہتے اس پر قبضہ کرنا ان کے لیئے بس کھیل تماشے جیسا ہی تھا۔

لاکھ میں دلیر تھی۔ حوصلہ مند تھی مگر ماں تھی۔ جب اردگرد تڑ تڑ بندوقیں چلتیں اور ہمیشہ چلتی رہتیں۔ ایسے میں اگر ایف ایس اے والوں کو سرکاری ملازم کام پر جاتا ملتا تو وہ اُسے گھر واپس

چلے جانے اور نوکری چھوڑ دینے پر مجبور کرتے پل بھر کے لیے بھی نہ سوچتے کہ اس کی تنخواہ ہی اس کے خاندان کا واحد ذریعہ آمدن ہے۔ میری بیٹی کے لئیے دمشق میں اس کے کالج جانا مشکل ہو گیا تھا۔ میرا خاوند اغوا کیئے جانے کے خوف میں مبتلا رہتا۔ تاوان کی رقم 20 ملین شامی پاؤنڈ سے کم نہ تھی۔

میرے دائیں بائیں دونوں طرف کے ہمسائے جو ایف ایس اے کی حمایت کرتے تھے وہ ہمیں یہ کہنا شروع ہو گئے کہ ہم انقلاب اور شام کے باغی ہیں۔ ایف ایس اے والے اپنے حمایتیوں کو خوراک اور پیسہ دے رہے تھے اور اُن خاندانوں کو بے گھر کر رہے تھے جو اُن سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہاں ہمارے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے جو بھوک سے مر رہے تھے۔ لیکن ایف ایس اے والے ان کی کوئی مدد نہ کرتے کیونکہ ان لوگوں نے حکومت کی حمایت کی تھی۔

میرے وہ رشتہ دار جو امریکہ اور یورپ میں رہتے تھے انہوں نے مجھے ملک چھوڑ دینے کا کہا۔ میں نے کہا۔

''ارے کیوں چھوڑوں۔ میرا تو مرنا جینا بس اسی کے ساتھ ہے۔''

میرا پختہ ایمان ہے کہ آدمی کی عزت اس کے اپنے ملک میں ہی ہوتی ہے۔

نومبر 2013 میں حکومتی فوج (نابک) کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ وہاں گھمسان کی جنگ اور فائرنگ ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ ہم نے تہہ خانے میں قیام کیا اور اپنا کھانا اپنے ہمسایوں کے ساتھ بانٹا۔ جب شام کی فوج نے نابک کو آزاد کرایا میں گلیوں میں گئی اور شامی پرچم کو مین سکوائر میں بلند کرنے میں مدد دی۔

یہ ایک انقلاب نہیں ہے۔ یہ ڈراؤنا خواب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پانچ سالوں میں ہمیں ہمارا شام واپس مل جائے گا۔ یہ تمام لوگ جو شام میں جہاد کرنے آئے کیا وہ مجھے یہ وضاحت دے سکتے ہیں کہ کس چیز کا جہاد؟ صدر بشار ایک ڈاکٹر ہے۔ پروقار شخصیت کا مالک ہے جس نے

اپنے ملک کی حفاظت کی۔اس نے بڑی مستقل مزاجی سے کام لیا ہے اور کبھی بھی متزلزل نہیں ہوا۔

شام آج پچھلے تین سالوں سے کہیں بہتر ہے۔تمام پناہ گزینوں نے شام چھوڑ دیا کیونکہ وہ فوج کو مطلوب تھے۔شام کی فوج نے کئی بار انہیں واپس آنے کی اور ریڈ کریسنٹ کے ساتھ تعاون کی پیش کش کی۔لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

جیسے جیسے فوج مزید علاقے آزاد کراتی جاتی ہے امن و سلامتی بہتر ہوتی جاتی ہے۔دمشق میں میری بیٹی اب یونیورسٹی بحفاظت جاتی ہے۔ہر چیز دستیاب ہے۔بجلی، پانی، روٹی اور پھل۔ہاں مہنگائی بہت زیادہ ہے لیکن امن تو ہے نا۔کیا کوئی چیز امن سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔نہیں کوئی نہیں۔صدر بشار ہی وہ واحد شخص ہے جو شام کو تہذیب کی سرزمین کے طور پر محفوظ رکھ سکتا ہے۔جب حزبِ مخالف قابو میں نہیں تھی تو ہر طرف چوری، عصمت دری، گردنیں کاٹنا اور لوٹ مار تھی۔لیکن جب (نا بک) کو ریاست نے آزاد کرایا تو لوگ شہر کو دوبارہ آباد کرنے کے لیئے پھول اُگانے اور زیتون کے درخت لگانے کے لیئے واپس لوٹ آئے۔میں نے رضا کارانہ طور پر کام کرتے ہوئے سکولوں اور سڑکوں کی از سرِ نو تعمیر کا کام شروع کر دیا۔اب میرے پاس 150 خاندانوں سے زیادہ کفالت کے لیئے موجود ہیں۔ہم ریڈ کریسنٹ کے تعاون سے اپنے ضلع میں موجود ضرورت مند لوگوں کو خوراک کی ٹوکریاں پیش کر رہے ہیں۔

میرا یہی ایمان ہے کہ شام دنیا کے سامنے بطور نمونہ واپس (صحیح حالت میں) آ جائے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا یہ ایمان اور زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 35:

ال صلاحیہ، جبل قاسیون اور یادگار

- محی الدین ابن عربی جیسی بلند پایہ دینی، علمی شخصیت دمشق کیلئے ایسی ہی ہے جیسے میرے لاہور کی علی گنج بخش ہجویری۔
- جبل قاسیون سے دمشق شہر کو دیکھنا گویا دامن کوہ سے اسلام آباد کے شہر کو دیکھنے جیسا ہی ہے۔
- ال غوطہ کے باقی ماندہ سرسبز وشاداب حصّے دمشق شہر کا حسن ہیں۔ یہی وہ ال غوطہ ہے جس کا مقدس کتاب میں ذکر ہے۔

ترغیب تو ہم دونوں میں سے کسی ایک کی ہی ہوتی۔ یوں ماشاءاللہ علی مجھ سے چار ہاتھ آگے ہی تھا۔ جوان بچہ تھا نا۔ شکر ہے نسرین بھی کسی نہ کسی طرح ہمارے جال میں پھنس ہی جاتی تھی۔ فاطمہ تو شوہر کا وساء (جدائی) چند لمحوں کے لئے بھی کھانے والی لڑکی ہی نہ تھی۔ میرے تینوں ساتھی شیعہ مسلک سے تھے مگر بڑے کھلے ڈلے مزے کے بڑے لبرل سے جبکہ میں سنی مسلک سے۔ خیر سے میں بھی اس لبرل ازم میں اُن سے دو ہاتھ آگے ہی تھی۔ یوں مزے کی گزر رہی تھی کہ جب چار دیوانے اکھٹے ہوکر چڑھیاں کرتے۔ کئی جگہ انہیں ڈنڈیاں مارنی پڑتیں۔ نسرین کہیں کنی کترانے کی کوشش کرتی جسے ہم مل جل کرنا کام بنا دیتے۔ بہرحال میری تو موجیں ہی موجیں تھیں۔

ایک دن پہلے جبل قاسیون Mount Qassyoun جانے کا پروگرام فائنل ہوا تھا۔

اسی لئے آج میں شہر کے لیئے نہیں نکلی تھی۔ دو پہر کے کھانے کا انتظار تھا کہ کسی صاحب ثروت کا بڑا اہتمامی سا لنچ تھا۔

جبل قاسیون کو جب جب میں نے دمشق میں چلتے پھرتے دیکھا۔ مجھے تو پہاڑ پر کہیں ٹھہرے ہوئے اور کہیں متحرک کئی منظر نظر آتے تھے۔ اب اللہ جانے یہ سراب تھے یا حقیقی۔ بہر حال ایک تو بڑا واضح ہو کر کئی بار آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ سفید عمارت، سادہ سی کھڑکیوں اور سبز چھت کے ساتھ نظر آئی تھی۔

پہلی بار اس منظر کے نظر آنے پر میں نے قریب سے گزرنے والے ایک پڑھے لکھے اور سمجھداری کی کسوٹی پر پورا اُترنے والے شخص کو بلا تکلف روک لیا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ قیافہ کی کسوٹی پر کھ پر پوری تھی۔ ادھیڑ عمری کے پیٹے میں مرد نے رک کر صاف ستھری انگریزی میں بتایا تھا کہ یہ محی الدین ابن عربی کا مزار مبارک ہے۔

ایک اور نے یہ بتایا تھا کہ اسی پہاڑ پر وہ مقام بھی ہے جہاں دنیا کا پہلا جرم ہوا تھا۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔ جاتے جاتے اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہاں کچھ اور بھی یادگاریں ہیں۔ اگر گئیں تو وہ سب دیکھ لیں۔

چکن قورمہ، چکن پلاؤ اور حلوے جیسا زوردار قسم کا کھانا کھا کر جب چلے تو دو بج رہے تھے۔

اب جب ٹیکسی کے لئے بات چیت ہونے لگی تو میں نے لڑکے سے پوچھا۔

''پہلے ہمیں بتاؤ کہ وہاں کیا کیا چیزیں دکھاؤ گے؟''

اُس نے عربی میں دوڑ لگا دی تھی۔ ہمارے پلے خاک نہ پڑا۔ ہمیں عباس کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ گزشتہ تین دنوں سے علیل تھا۔ تاہم لڑکا تیز اور جانکاری والا نظر آیا تھا۔ تین ہزار سیرین لیرا کا مطالبہ ہوا۔ میں چیخی۔ میرے ساتھ نسرین اور علی بھی چیخے۔

لڑکے نے دونوں ہاتھ فضا میں دائیں بائیں لہرائے۔ پہلے ابن عربی اص صلاحیہ As Salhiyyah، پھر قاسیون اور پھر یادگار۔ اُس نے دونوں بازوؤں کا دائرہ سا بناتے ہوئے بہت

سا سفر، پہاڑی سفر کا مفہوم کچھ بے ربط سے جملوں اور کچھ تمثیلی انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی۔ یقیناً وہ اس میں کامیاب ہوا کہ ہم بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اتنی جگہیں۔ پیسے بہت مناسب اور کمی بالکل نہیں۔

منت طرلوں سے 2500 سیرین لیرا پر فائنل ہوا۔ اس نے پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ پہلے وہ صلاحیہ کوارٹر جائے گا۔ میں نے ذرا خوشامدانہ انداز میں مکھن لگایا کہ جو دکھا سکتے ہو دکھا دو۔ تمہیں دعادیں گے۔

صلاحیہ کواٹر کے بعض حصے بہت خوبصورت، ماڈرن اور شاندار تھے۔ ہاں البتہ بعض قدرے ماٹھے تھے۔ یہاں صدیوں پہلے وہ لوگ آباد ہوئے جو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے ظلم وستم سے پناہ ڈھونڈتے یہاں آئے۔ پہاڑیوں کے دامنوں اور اس کی ڈھلانوں پر کہیں چھوٹے موٹے گھروں اور کہیں خیموں کی صورت پھیلتے اور آباد ہوتے چلے گئے۔ ان کا زیادہ پھیلاؤ دریائے Tora کے ساتھ ساتھ ہوا جو دراصل دریائے برادہ کی ہی ایک شاخ تھی۔

آنے والے وقتوں کی دہائیوں میں وہ کُرد جنگجو بھی جو صلاح الدین کے ساتھ آئے تھے۔ یہی کوئی بارہویں صدی میں وہ بھی یہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ یوں اِسے کچھ لوگ کردوں کا علاقہ بھی کہتے ہیں۔ المہاجرین بھی اسی کا نام ہے۔ دھیرے دھیرے مسجدیں، مدرسے، اسپتال اور بہت سی شاندار عمارات بنتی چلی گئیں اور یوں یہ دمشق کا ہی ایک حصّہ شمار ہونے لگا۔

لڑکا اچھا ڈرائیور تھا۔ تنگ تنگ گلیوں میں سے بھی گاڑی کو لہراتا ہوا نکال کرلے جاتا۔ بعض جگہوں کے منظر نظروں پر بڑے گراں گزرتے تھے کہ بے ڈھبے سے مکان، تنگ گلیاں، ان میں بہتی نالیاں، دوڑتے بھاگتے پھرتے بچے۔ گلیوں میں ہی کریانے، پنساری کی دکانیں اُن میں خریداری کرتے نچلے متوسط طبقے کے لوگ۔

گاڑی رُکی اور پتہ چلا کہ مزار تک پیدل جانا ہوگا۔ من وعن وہی درباروں والا منظر تھا۔ جب میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے راستے پر آگے بڑھتی تھی۔ اپنے وقت کا، اپنے بعد آنے والے وقتوں کا بہت بڑا عالم بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں اُن کی کتاب زندگی کے ورق پلٹی تھی۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی آبائی جگہ مرسیاMursiya،سپین کا ایک علاقہ تھی۔سن پیدائش یہی کوئی 1165ء اور وفات 1240ء کی ہے۔ اپنے وقت کی بہت اہم صوفی شخصیت جو اسلامی Theology پرایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی سے بہت نمایاں تھے۔

اس وقت اُندلس یورپی اثر کے تحت اندرونی مقامی سیاست میں بہت بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔اس کے باوجود اندلس علم وادب اور فکری تحریکوں کا مرکز تھا۔

سلطنت معاویہ کا دربار عالموں،مفکروں،فلسفیوں اور صاحب کمال وفن کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔

ابتدائی تربیت تو اسی ماحول نے کی۔جوان ہوئے تو شہروں اور ملکوں ملکوں پھرنا اور صاحب علم لوگوں سے ملنا شروع کردیا۔سینتیس 37 سال میں حج کیا۔پھر نہ اُندلس گئے اور نہ مراکش۔کچھ وقت میسوپوٹیمیا اور ایشیائے کوچک میں گزارا۔

رجعت پسند عالموں نے ان کی روشن خیالی کی بہت مذمت کی۔ قاہرہ میں بھی اُن کے نظریات وخیالات کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔نکالے جانے پر اصرار تھا۔ساٹھ سال کی عمر میں وہ دمشق آئے اور پھر یہیں انہوں نے ڈیرے لگالئے۔

اپنے عہد کا دانشور،فلاسفر،لکھاری، مذہبی رہنما اور سائنس دان۔ اِس وقت کی پوری اسلامی دنیا میں وہ زیر بحث تھے۔کچھ سائنس دانوں کو ان کے مابعد طبیعاتی Metaphysical نظریات سے اختلاف تھا۔کچھ حامی تھے۔کچھ کا خیال تھا کہ وہ اسلام کے عظیم ترین فلاسفر ہیں۔کچھ کا خیال اُن کے دہریے ہونے پر تھا۔کچھ اور کا کہنا تھا کہ اُن کی فکری سوچ اور تحریر کی تحریک دراصل خدائی تحفہ ہے۔صوفی ازم اُن کے خیال میں ذہنی پریشانی کا واحد علاج ہے۔فلاسفی شک کی طرف لے جاتی ہے۔ابہام پیدا کرتی ہے۔مگر خدا سے براہ راست رابطہ ہی روح کو سکون دیتا ہے۔

انہوں نے اپنے اِس نظریئے پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں

کتابیں اور مضامین اُن کی زندگی، اُن کی کتابوں، اُن کے افکار و خیالات پر لکھے گئے۔ یہ کام زیادہ عربی، انگریزی، جرمن، سپینش، فرنچ اور فارسی میں ہوا۔ بہت سے ماہر شرقیات اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ابن عربی کی تحریروں نے بہت سے فلاسفروں، دانشوروں اور صاحب علم لوگوں کو متاثر کیا جیسے ریمنڈ لولیو Raymond Loleo اور دانتے۔ دانتے کی ڈیوائن کومیڈی کے بارے تو یہ تاثر بھی ہے کہ وہ اُن سے بہت متاثر ہے۔ جاپانی ماہر شرقیات Ezotsu کا کہنا ہے کہ Taoism فلاسفی، صوفی ازم اور تصوف کے میدانوں میں ابن عربی سے بہت متاثر ہے۔

میں نے کتاب بند کر دی تھی کہ زندہ کھلی کتاب کے سامنے اُسے پڑھنے اور دیکھنے کے مقام پر تھی۔ ڈرائیور کو میں نے کہتے سُنا تھا کہ قاسیون کا پہاڑی سلسلہ بس یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

زائرین کی بہتات اور وہی مخصوص ماحول جو صوفیائے کرام کے درباروں اور مزاروں کا خاصہ ہوتا ہے اپنی پوری رنگینیوں سے یہاں کارفرما تھا۔ ملحقہ مسجد بہت خوبصورت، خاص طور پر مینار کی کندہ کاری نظروں کو کھینچتی تھی۔ مزار سطح زمین سے نیچے ہے۔ کئی پوڈے اُتر کر جانا پڑا تھا۔ جب زینہ اُترتی تھی تو سامنے دیوار میں پتھر پر کندہ شعر نے روک لیا تھا۔ میں نے کاپی کھول کر اس میں درج کیا۔

فلکل واحد یسمو بہ　　　　وانا الباقی العصر ذاک الواحد

اندر کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ شیشے میں مقید مزار مبارک اپنی رعنائیاں بکھیر رہا تھا۔ قیمتی قالین بچھے تھے۔ فانوسوں کی روشنی ماحول کو جگمگ جگمگ بناتی تھی۔ نم آنکھوں سے اٹھے ہوئے بے شمار ہاتھوں میں ہمارے ہاتھ اور آنکھوں میں اُتری نمی بھی اس ماحول میں شامل ہو گئی تھی۔

آپ کے پہلو میں آپ کے دو بیٹے سعید الدین و عماد الدین کے مزار ہیں۔ عقبی سمت میں کچھ قبریں ہیں۔ ملحقہ دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب آبادی کا پھیلاؤ ہوا تو مزار کہیں ملبے کے نیچے آ گیا۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ آپ کی پیشن گوئی تھی کہ جب سین شین میں داخل ہوگا تب محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی۔ روایت ہے کہ جب عثمانی سلطان سلیم نے شام فتح کیا۔ یعنی سلیم کا سین شام کے شین میں داخل ہوا تو اس نے آپ

کے مقبرے کے مقام پر کسی عمارت کے لیئے کھدائی کروائی تو لوح مزار نکل آئی۔

ہم نے نفل پڑھے۔ فاتحہ خوانی کی۔ مدرسہ بھی دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے لاکھوں ذہنوں کی سیرابی ہوئی۔ یہاں بھی نفل پڑھے اور باہر آ گئے۔ مجاوروں نے مت ماردی تھی۔ نسرین کے پاس ٹوٹی ریز گاری تھی۔ وہی دے کر جان چھڑائی۔

تو اب شوق اور دید کی جولانیاں پھر اپنے عروج پر تھیں کہ وہاں جا رہے تھے جہاں انسانیت کا پہلا قتل ہوا۔ زن بنیاد بنی تھی۔ ہابیل کی قبر پر نسرین اربعین کی زیارت کی بھی بڑی خواہشمند تھی۔

جس علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ راستہ بے حد ویرانی لئے ہوئے تھا۔ چھوٹی پہاڑیاں، ٹیلے اور کہیں کہیں بھیڑ بکریاں چراتے لوگ۔ میرے اندر سے شکریئے کی تہوں میں لپٹا ہوا اظہار خدا کے حضور سجدہ ریز ہوا تھا کہ مجھ جیسی آپ پھدری اکیلی ٹیکسی میں مہم جوئی کے شوق میں نہ نکل کھڑی ہوئی۔

''اللہ! کتنی اجاڑ بیابان ہے یہ جگہ۔''

لڑکے نے اپنی کمنٹری جاری رکھی تھی۔

دمیر نام کی ایک آبادی میں ایک بے حد پرانا چرچ نظر آیا تھا۔ لڑکے نے اپنے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ جو پہاڑ دیکھ رہے ہیں۔ یہ شام اور اسرائیل کا باڈر ہے۔''

اب اسرائیل کا ذکر ہو اور اس کے جوروستم یاد نہ آئیں کیسے ممکن ہے؟ یاد آئے جنہوں نے رنجور کیا۔

اب منظروں میں خوبصورتی اور رعنائی ابھرنے لگی تھی۔ وادیاں سبزے میں لپٹی نظر آتی تھیں۔ پھل دار درختوں کی نشان دہی ہونے لگی تھی۔ خوبانی اور سیبوں کے پیڑ۔ زیتون کے باغات۔

ہم نے گاڑی رکوائی۔ باہر نکلے۔ منظروں کے حُسن و رعنائی سے کتنی دیر لُطف اٹھاتے رہے۔ میں تو یہی سوچتی رہی اللہ اِس سرزمین کو تو نے کتنے بھاگ لگائے۔ ساتھ ہی ہنسی بھی آئی کہ اِن بھاگوں کے ساتھ بھوگ کاٹنے بھی اسی دھرتی کا مقدر کر دیئے گئے ہیں۔ تبھی سڑک کے کنارے ایک

بورڈ پر بنی ہابیل اور دوسری جانب بیروت لکھا نظر آیا۔ گاڑی بنی ہابیل کی سمت مڑ گئی۔

تھوڑا سا آگے جانے پر فوجی چیک پوسٹوں کے آثار شروع ہو گئے۔ ایک چیک پوسٹ پر بیریئر لگے ہوئے تھے۔ گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے عربی میں باہر نکل کر بتایا مگر پذیرائی کے آثار نہ نظر آنے پر میں نے دروازہ کھولا۔ باہر نکلی اور ملتجی سے انداز میں درخواست گزار ہوئی۔ اب پاسپورٹ کا مطالبہ ہوا۔ پاسپورٹ کہاں تھے؟ بہرحال منت طرلوں نے ان کے دلوں میں مہر ڈال دی۔ اجازت مل گئی۔

شکر ہے ڈرائیور کا لائسنس انہوں نے رکھا اور اجازت دے دی۔ میں نے دعائیہ جملے کہے۔ واللہ انہیں سمجھ آئے یا نہیں۔ ہاں البتہ آنکھوں سے چھلکتی محبت ضرور نظر آئی ہوگی۔

جگہ جگہ فوجی، ٹینک توپیں نظر آ رہی تھیں۔ آبادی کے آثار تھوڑے سے نظر آئے۔ چند دکانیں بھی تھیں۔ علاقے کا نام بھی یہی ہے۔ مقبرے کے صدر دروازے پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ کمرہ مناسب تھا۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ مگر خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی پندرہ فٹ لمبی قبر ہوگی۔ بہرحال فاتحہ پڑھی ۔نفل پڑھے اور رخصت ہوئے۔ جب باہر نکلے تو کچھ اور لوگوں کو دیکھا۔

میں نے پوچھا تو ایران کا پتہ چلا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو نری فراڈ بازی ہی لگی کہ باہر چٹان پر پام کے پیڑ بارے پتہ چلا کہ اس کے پتے ہر بیماری کا شافی علاج ہیں۔ ایک گتے پر یہ بھی لکھا نظر آیا کہ ''از چشیدن برگ شفا است'' پتوں کی فروخت کا عمل بھی جاری تھا۔

اب دوسرا قابل ذکر مقام اُن قابل ذکر اصحاب کا تھا۔ مگر ڈرائیور نے کہا کہ دس میل کا راستہ گاڑی سے اور آگے تین چار میل کی چڑھائی۔ نہ نسرین اور نہ ہی میں اِس مہم جوئی پر آمادہ ہوئیں۔ ہم دونوں کے انکار نے ڈرائیور کو خوش کر دیا۔ اس کی جان چھوٹ گئی۔ رہ گئے شبیر اور سکینہ۔ شبیر بھی چپ سے ہو گئے۔

تاہم ڈرائیور نے ہمیں کچھ اور غاروں کی ضرور زیارت کروائی۔ غار جبرائیل میں لڑکے نے ایک پیغمبر ذوالکفل علیہ الصلاۃ والسلام کے مزار بارے بتایا۔ ایک غار کے متعلق پتہ چلا کہ یہاں حضرت

مریم رضی اللہ عنہا کچھ ماہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی ولادت سے قبل رہی تھیں۔ایک جگہ غاروں کے اوپر ایک بڑا سا منہ کھولے شگاف ہے۔اس پر دانتوں اور زبان کا گمان ہوتا ہے۔زمین بھی سرخ ہے جسے خون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اسے خونی غار کہتے ہیں۔

ایسی ایسی بے تکی کہانیاں تھیں۔مجاوروں کے روّیے اور پیسے ٹھگنے کے طریقے اور زائرین کا گھیراؤ۔بہر حال بمشکل جان چھڑا کر بھاگے۔

دو خوبصورت چیزیں ہمیں ڈرائیور نے اور دکھائیں۔

صدارتی محل کی شاندار عمارت اور اس سے آگے ایک بڑی منفرد سی محراب اور اس میں سمائے گنبد کا منظر تھا۔نامعلوم سپاہی کی یاد میں۔1994ء میں اِس یادگار کی تعمیر ہوئی۔یہ ماڈرن اسلامی طرز تعمیر کی حامل یادگاروں میں سب سے خوبصورت ہے۔اسلامی فن تعمیر کے دو اہم ستون گنبد اور محراب ہی دراصل اس کی بنیاد اور انتہا ہیں۔گنبد دراصل علامتی نشان ہے اُس نمائندگی کا جہاں شہید کی حفاظت کی جاتی ہے۔اور محراب فتح کی علامت۔پوری علامت اس تصور کو ابھارتی ہے جیسا کہ گویا سپاہی کا ہلمٹ ہے جو دفاعِ وطن کے لئے شہید ہوا۔

اس کا Diorama ہال شامی تاریخ کی پانچ اہم جنگوں کا نمائندہ ہے۔پہلی جنگ یرموک 636ء میں بازنطینیوں کے ساتھ ہوئی اور دمشق فتح ہوا۔دوسری حطین کی جنگ کی نمائندہ ہے جو صلاح الدین نے لڑی جس میں یروشلم صلیبیوں سے آزاد ہوا۔تیسری 1921ء کی میسلون Maysaloun کی ہے جس میں شام کے وزیر دفاع یوسف اعظم فرانسیسی فوج کے دمشق پر قبضہ کے خلاف مدافعت میں شہید ہوئے۔چوتھی لڑائی ماؤنٹ ہرمن (جبل الشیخ) 1973ء میں جس میں شامی فوجوں نے ہرمن پہاڑ پر اسرائیلی آبزرویشن پوسٹ پر قبضہ کیا تھا۔پانچویں 1982ء کی لبنان اسرائیلی فوجوں کے خلاف سلطان یعقوب نے لڑی تھی۔

واپسی میں نسرین نے بتایا کہ ایک چٹان سے پانی کے قطرے بھی گر رہے تھے۔جس کے بارے میں وہاں کے مجاور کا کہنا تھا کہ وہ دراصل اسی دکھی چٹان کے آنسو ہیں جو ابھی تک ہابیل کے غم میں

بہہ رہے ہیں۔

سچی بات ہے مجھے تو سب رولا غولا ہی لگا۔ کچھ ایسی ہی رائے نسرین کی تھی۔ ہاں مگر شبیر اور سکینہ بہت متاثر تھے۔ وہاں سے دمشق کے دامن یعنی جبل قاسیون پر پہنچے۔

کہہ لیجئے یہ ایک طرح اسلام آباد کے دامن کوہ کی طرح ہے۔ دمشق کا سارا شہر روشنیوں میں جگمگ جگمگ کرر ہا تھا اور منظر اتنا خوبصورت تھا کہ لگتا تھا جیسے نیچے دیوں کا کھیت اُ گا ہوا ہو۔

ایک خوبصورت یادگار ایک خوبصورت ماحول میں ایک خوبصورت سیر گاہ۔اس کے سکوائر میں کھڑے ہو کر فطرت اور دمشق دونوں کو بہت اچھی طرح دیکھا اور محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔شام کو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اُن منظروں کو بھی جو ہم نے سورج کی طلائی کرنوں کے ساتھ دیکھے تھے۔سورج جیسی کرنیں جو شہر کے در و دیواروں، مسجدوں کے بلند و بالا میناروں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ رہی تھیں۔

تب آسمان کتنا نزدیک تھا اور ال غوطہ کے سر سبز و شاداب حصوں کو اس کے تمام تر حُسن سے دیکھنا بڑا مسحور کن تھا۔کبھی اس کے انہی سر سبز و شاداب غوطوں کی وجہ سے دمشق کو جنت کا ٹکڑا کہا گیا تھا۔ جنت کے ان ٹکڑوں میں سے کچھ تو آبادیوں کے پھیلاؤ کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔تاہم بچے کھچے نظاروں کو کیمروں کی آنکھوں اور انسانی آنکھوں میں محفوظ کرنا بھی کتنا مزے کا کام تھا۔یہی سب کچھ کرتے کرتے نئے منظر سامنے آنے لگے تھے۔

دمشق شہر کی رات کے پہلے پہر کا نظارہ کسقدر موہ لینے والا تھا۔لگتا تھا جیسے روشنی کے سمندر میں تیر رہے ہیں۔دو رنگ اتنے نمایاں ہو کر آنکھوں کے سامنے ابھرے تھے کہ لطف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔مسجدوں کے بلند و بالا میناروں سے پھوٹتی سبز روشنی اور دمشق کی شاہراہوں پر جگمگاتی نارنجی ،سفید،اور سبز رنگوں کی روشنیوں کا دلکش امتزاج اگر کہیں دیکھنا ہو تو وہ یہاں نظر آتا ہے۔

بچے ،بوڑھوں، جوانوں،عورتوں،مردوں ،لڑکیوں اور لڑکوں کے جمگھٹے ہنستے باتیں کرتے کھلکھلاتے ،سرگوشیاں کرتے۔کتنے رنگ و روپ تھے ان کے۔

ریڑھیوں پر، پک اپ گاڑیوں کے پیچھے کھلے حصّوں میں پھل اور ڈرائی فروٹ بکتے

تھے۔ بادام لیئے ۔سیب خریدے۔کافی لی۔فرائڈ چپس کھائے۔

زندگی کی خوبصورت شاموں میں سے ایک۔خدا کے عنایت کردہ تحفوں میں سے ایک مزید تحفہ۔احسان ہے اُس اوپر والے کا۔شاعر یاد آیا تھا۔

محی الدین ابن العربی کا جبہ پہنے
میں ماؤنٹ قاسم کی چوٹی سے نیچے اتر تا ہوں
شہر کے بچوں کے لیے آڑو، انار اور سیب کا حلوہ لیے
اور عورتوں کے لیے فیروزے کے ہار اور محبت بھری نظمیں لیے
میں تمھارا دمشقی گلاب ہوں، شام کے لوگو
سو جو بھی مجھے پائے
گلدان میں سجا دے

☆☆☆

باب نمبر 36:

تکیہ سلیمانیہ

- تکیہ سلیمانیہ کے گول گنبدوں کا پہلا تاثر ساتھ ساتھ جڑی بیٹھی لقی کبوتریوں جیسا ہے۔
- آرٹ اینڈ کرافٹ کی دکانوں میں جیسے رنگوں کی برسات اُتری ہوئی تھی۔
- حجاز ریلوے اسٹیشن کی عمارت کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔

تکیہ، سلیمانیہ بھی دمشق کی خاص الخاص چیزوں میں سے ایک ہے۔ ایک تو عثمانی خلیفہ کی بنوائی ہوئی۔ رنگ ڈھنگ کا تڑکا بھی اُن کے انداز کا لگا ہوا۔ نہر برادہ Barada کے کنارے نے خوبصورتی اور محل وقوع کو اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ تو ظاہر ہے سونے پر سہاگہ یقیناً اِسی کا نام ہے۔ گو پرانے پن کا گہنانا بھی ساتھ چپکا ہوا ہے۔ مگر اس نے بھی حُسن بڑھا دیا ہے کہ Old is Gold ایسے تو نہیں کہا گیا۔

دور سے ہی منظر نظروں کو نتھ ڈالتا ہے۔ چار دیواری سے جڑے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اردگرد کے ماحول نے کہیں استنبول کی یاد دلا دی تھی۔ اپنی وضع کے گول گول ساتھ ساتھ جڑے گنبدوں کی قطاریں جیسے بیسیوں ایک دوسرے سے ساتھ ساتھ جڑی بیٹھی لقی کبوتریوں کا سا تاثر ابھارتے تھے۔ درختوں سے گھرا، ہریالیوں میں بسا بڑا ہی خوبصورت نظر آیا تھا۔

تعمیر یہی کوئی لگ بھگ 1554ء کی ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اسی جگہ کوئی دو صدیاں قبل مصری سلطان کا محل "ابلق" تھا۔ تیمور نے بھی دمشق پر حملے کے دوران یہیں قیام کیا تھا۔ سلیمان ذی شان نے بھی یہیں تکیہ سلیمانیہ کی بنیاد رکھی۔

تعمیر کے وقت تو بہت سے حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مہمان خانے تھے۔ بازار، سراہیں، سلطان کے لئے ہال کمرہ، مسجد اور مدرسہ بھی تھا۔ آغاز میں تو سال ہا سال تک حاجیوں کے لئے سرائے کا کام بھی اسی نے دیا تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ چیزیں بدلتی گئیں۔

تو میں اس کے تالاب کنارے کھڑی عظمتوں کی داستان پڑھتی تھی۔ اس کے خوبصورت اونچے اونچے محرابی کٹوں والے برآمدوں کو دیکھتی تھی۔ وہ بھی کیا وقت تھا کہ عثمانیوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ رہے نام تیرا مولا۔

اونچے اونچے درختوں میں ہوا سرسراتی اور انہیں خوابیدگی سے باہر نکلنے کو کہتی تھی۔ اس کے کچھ کہنے پر اس کے پتے کبھی سست روی اور کبھی ہوشیاری سے حرکت کرتے تو بہت سے خوبصورت منظر جھلملانے لگتے۔

بلند و بالا چھتوں اور محرابی دروازوں والے دالانوں میں بازار سجے پڑے تھے۔ کبھی یہاں علم وادب کے چراغ جلتے تھے کہ یہ مدرسہ تھا۔ اب ملٹری میوزیم اور بازار بنا پڑا ہے۔

ملٹری میوزیم تو میں نے نہیں دیکھا کہ بھلا اُسے کیا دیکھنا تھا؟ ہاں البتہ بازاروں میں ضرور گھسی۔ کیا رنگ وحُسن کی دنیا بکھری ہوئی تھی یہاں۔ کہیں دکانوں کے چہرے مہروں کی رنگا رنگ انفرادیت کو دیکھتی تھی۔ کہیں ان پر چوبی کندہ کاری کی جولانیاں حیرت زدہ کرتی تھی۔ کہیں دکانوں کے اندر نادر شاہکار آنکھیں پھاڑتے تھے۔ کہیں اُن ہنرمند ہاتھوں کے یہ خزانے مائل کرتے اور سرگوشیانہ انداز میں کہتے تھے۔

''سنو تو یہ بڑی نادر چیزیں ہیں۔ لے جاؤ جو لے جا سکتی ہو۔''

کھڈیوں پر چیزیں بنتی تھیں اور چاروں طرف ان کے نمائشی شہ پارے تھے۔ چینی مٹی کے برتنوں اور ان پر نقاشی کا کام، تانبے، پیتل کے شاہکاروں پر رنگ آمیزی، اتنی خوبصورت دستی کڑھائی کی چیزیں جس چیز کو دیکھوں ایک "ہائے" اندر سے نکلے۔ سینریاں، خطاطی کے نمونے،۔ پہلی بار جی چاہا تھا سمیٹ لوں سب کچھ۔ کیفے ٹیریا سے قہوہ پیتے اور بسکٹ کھاتے ہوئے میں نے بہت وقت گزارا اور اس

بہت وقت کے ہر ہر لمحے سے لطف اٹھایا۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں کیسے اُن تاثرات کا اظہار کروں جو مجھے یہاں آرٹ اینڈ کرافٹ کی ایک دکان میں داخل ہو کر محسوس ہوئے۔ میرے عین سامنے ایک ایسی پنٹینگ تھی جس نے میرے قدموں کو روک دیا تھا۔ میری آنکھوں کو ساکت کر دیا تھا۔ یہ کیسا شاہکار تھا؟ وسطی عہد کا نمائندہ۔ چھت کے گنبد سے لے کر نشست گاہ کی ہر چیز چوب اور چوبی کندہ کاری سے سجی سنوری آنکھوں کو ہر ہر شاہکار پر روکتی بغور دیکھنے اور سراہنے پر اصرار کرتی تھی۔ سچ تو ہے کہ اس کی رنگ آمیزی، اس کے کرداراور قدیم تہذیب کے عکاس روشن اور تاریک حصے کس حسن و خوبصورتی سے میرے اوپر عیاں ہوئے۔

دائیں ہاتھ ایک قلعہ بند شہر میں علی الصبح کو شہر کا مرکزی دروازہ کھلنے پر مسافروں کی آمد کے مناظر ہیں۔ کچھ منظر مقامی لوگوں کے تھے۔ کیا بات تھی فنکار کی۔

چند اور بھی ایسے ہی خوبصورت لاجواب شاہکار تھے۔ جی چاہتا تھا بس انہیں خرید لوں اور لے جاؤں۔ ہائے میرا دل بھی آیا تو کمبخت کن پر۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہی۔ دل کو ٹھنڈا کرتی رہی۔

ال میدان کا علاقہ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی یہاں اسلام کے پانچویں رکن کی تکمیل کے لیئے تاحدّ نظر پھیلے خیموں میں اِس مقدس فرض کی تکمیل کیلئے آئے زائرین کے اژدہام بکھرے ہوتے تھے۔ حج کے لیئے قافلے یہاں اُترتے۔ اُن کے قیام و طعام، تربیت کے لئے اہتمام اور مقام مقدس کے لئے رخصتی کے سب مرحلوں کا اہتمام، گورنر کی زیر ہدایت اور زیر نگرانی ہوتا تھا۔ تصور کی آنکھ کے سامنے ماضی کے خوش کن منظروں کے بہت سے روپ تھے۔ مگر حال میں حقیقت کی آنکھ بلند و بالا عمارات کے سلسلے، خوبصورت شاہراہوں پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں، پٹریوں پر چلتے پھرتے لوگوں کے پرے، اردگرد پھیلی مسجدیں، مدرسے، سکول اور شاپنگ پلازے دیکھتی تھی۔

حجاز ریلوے اسٹیشن بھی دیکھنے کی چیز تھی اور تھا بھی قریب ہی۔ کس قدر عظیم الشان عمارت

تھی۔ کیا باہر اور کیا اندر ۔ ہال کمرے کی گیلریاں، اُن کی ریلنگ چھت سے جڑتی رنگین شیشوں والی کھڑکیاں، تعمیری خدوخال، نقش ونگاری سب متاثر کن تھے۔ اِس ریلوے اسٹیشن کو بنانے کا بڑا مقصد استنبول عثمانی سلطنت کے دارلخلافہ اور حجاز کے درمیان حاجیوں کی آمدورفت مقصود تھی۔

میں واپس آتا ہوں۔ دمشق، میرے دمشق
میری ماں کی خوشبودار چادروں کے بعد سے
مجھے سونے کے لیئے کوئی بستر نہیں ملا ہے
تیل اور معتر (ایک خوشبودار پتیوں کا پودا) سے گندھی دلہن کے بعد
دنیا میں کوئی دلہن مجھے خوش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی
اور ناشپاتی والے جام کے بعد جو وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بناتی تھی
مجھے صبح کے ناشتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے

☆☆☆

باب نمبر 37: المناک کہانیاں

غریب کے خوابوں نے بُنیں کہانیاں
اپنی ہی خاک وخون میں لُتھڑی کہانیاں
شعلوں میں جلیں راکھ ہوئیں کہانیاں
ظالم ہوائیں اڑاتی پھریں کہانیاں

کہاں غلطی ہوئی۔ کِس گناہ کی سزا ملی۔ ہمارے اہداف میں تو کہیں کھوٹ نہ تھا۔ مخلص تھے ہم ۔لوگ بھی جذبوں سے سرشار تھے۔انہوں نے بغاوت کی حمایت ہراُس چیز سے کی جس کے وہ مالک تھے۔

یہ کرنل عفیف محمد سلیما تھا۔جس کے گلے میں آواز پھنستی تھی۔جس کے چہرے پر حُزن و یاس تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ جولوگ اسلحہ یا ہتھیاروں کے مالک تھے انہوں نے وہ ہمارے حوالے کر دیے۔ بریگیڈ کا بجٹ 88,000 شامی پاونڈز ماہانہ سے بھی بڑھ گیا تھا۔وہ سب جنہیں کسی نہ کسی جرم میں جلاوطن کر دیا تھا۔انہوں نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے پیغامات بھیجے۔

''گھبرانا نہیں۔ہم اپنے ملک کے لیئے ہر چھوٹے سے چھوٹا کام کریں گے دنیا بھر میں پھیلے بااثر شامیوں سے التجا کریں گے کہ تمہارے مادرِ وطن پر یہ بڑا کڑا وقت ہے۔اس کا ساتھ دو۔''

کرنل عفیف نے اپنے مخاطب کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

حقیقتاً انہوں نے جی جان سے ساتھ دیا۔ وہ سب ہمیں پیسہ بھیج رہے تھے۔عرب ریاستوں کا کردار بھی اپنی جگہ بڑا اہم تھا۔خصوصاً خلیجی ریاستوں کا کہ اُن کی طرف سے رقوم ملنا شروع ہوگئیں۔لیکن ہوا کیا؟ تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے اپنا (ہدف) ہم پر مسلط کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔

دمشق میں ایک بہت بڑی ایف ایس اے (فری سیرئین آرمی) بریگیڈ میری زیر کمان تھی۔غوطہ کے ایک ضلع (موودامیہ) میں 3500 سے زیادہ مسلح جنگجوؤں نے ڈٹ کر ساتھ دیا۔ پہلے سال تو وہیں احتجاج اور مزاحمت کی تاریخ لکھتے رہے۔

جولائی 2012 کے دن تھے۔ہمارے عزائم جوان تھے۔ہمیں کامیابیاں نصیب ہورہی تھیں۔ ہم صدارتی محل سے محض تین کلومیٹر دور تھے۔حکومتی نظام ٹوٹ کر بکھر جانے کے قریب تھا۔

لیکن جب طیاروں نے دمشق کے مرکز کو نشانہ بنایا تو ہمیں منظرہ جو کہ دارالحکومت کے جنوب مغربی حصّہ میں ہے، کی طرف فرار ہونا پڑا تھا۔جہاں ہمیں درختوں کے جھنڈ میں بڑی جانفشانی سے کھودی گئی خندقوں میں چھپنا پڑا۔ دعائیں مانگتے اور اس بات کا انتظار کرتے کہ فوجی آگے بڑھ جائیں تو باہر نکلیں۔

احمد ندیم کیا میری یادوں سے کبھی محو ہوسکتا ہے۔کبھی نہیں۔وہ نوجوان لڑکا جس کی آنکھوں میں ولولے تھے۔جس کے وجود میں بجلیاں تھیں۔احمد ندیم میرے ساتھ ہی ایک خندق میں تھا۔جب سنائپر کی طرف سے ایک گولی اس کے سر میں آ کر لگی۔اس نے میرے بازوؤں میں جان دی۔اس کی عمر اُس وقت صرف 22 سال تھی۔نو گھنٹوں تک میں اس کی لاش کے ساتھ خندق میں تھا جبکہ اس دوران فضائی حملے اور توپوں کی گولہ باری جاری تھی۔میں اسے تکتا رہا جبکہ وہ مر چکا تھا۔یہ وہی لڑکا تھا جو چند گھنٹوں پہلے میرے ساتھ مل کر کھانا کھا رہا تھا، باتیں کررہا

تھا۔کامیابیوں کے امکانات پر مجھ سے سوال جواب کرر ہا تھا۔ ہم دمشق میں پہلے احتجاجی مظاہرے سے اکٹھے تھے۔اس نے آخری لفظ جو مجھے کہے تھے وہ یہ تھے:

''کرنل اتنا احسان ضرور کرنا مجھے ایک ایسے شامی کے طور پر یاد رکھنا جس نے اپنے ملک کی خاطر جان دی۔''

آدھی رات کے بعد جب گولہ باری قدرے کم ہوئی تب ہم اسے ایک زیتون کے درخت کے نزدیک دفنانے کے قابل ہوئے۔

شامی لوگ ہم سے متنفر ہونا شروع ہوئے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ FSA (فری سیرین آرمی) آدھے راستے سے ہی بھٹک گئی تھی۔ جب داعش، النصرہ فرنٹ، باغی شامی اسلامی گروپ اور ایسی ہی چند اور شدت پسند تنظیمیں آ کر اُس سے ملیں۔

شامیوں نے ایف ایس اے سے متنفر ہونا شروع کر دیا تھا۔ جب بغاوتوں نے شدت پکڑی تو لوگوں نے ہمیں کوسنا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ ہم نے حکومتی نظام کے خلاف بغاوت کی۔ ان کے خیال میں ہم ہی وہ وجہ تھے جن کی وجہ سے بنیاد پرست جنگجوؤں کو ہمارے ملک میں آنے کا موقع ملا۔لیکن ہم تو آزادی چاہتے تھے۔فرقہ واریت پر مبنی تنظیم داعش نہیں۔

کچھ لوگ اب یہ خیال کرتے ہیں کہ بغاوت سے پہلے کی زندگی زیادہ اچھی تھی۔لیکن یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا کوئی بہن بھائی نہیں کھویا۔جن کی کار کو دھاکے سے اُڑایا نہیں گیا تھا۔ یا ان کے گھر مسمار نہیں کیئے گئے تھے۔اُن کا کوئی بچہ اٹھایا نہیں گیا۔ میرے بہت سے ایسے عزیز دوست، محلے دار اور جاننے والے ہیں جو جب اکٹھے بیٹھتے ہیں یا خبریں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔

''کتنے افسوس کی بات ہے ہم اچھی بھلی زندگی گزار رہے تھے نا۔''

یہ بات صحیح ہے کہ اگر چہ ہمارے پاس شان وشوکت تو نہ تھی مگر مناسب مقدار میں خوراک تو تھی۔ امن تو تھا۔

اب کیا مجھے یہ چاہیے کہ میں شہیدوں کے لیئے بغاوت جاری رکھوں اور حکومتی بمباری کے نیچے اور زیادہ لوگوں کو مرنے دوں؟ کیا مجھے مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیے؟ یا حکومتی فوج کے سامنے اس امید کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے چاہیں کہ ایک دن ان لوگوں میں سے ہی ایک بچہ ایک اور شامی بغاوت کی راہنمائی کرے گا کیونکہ ہماری بغاوت خدا کی لعنت کا شکار ہوئی۔

ہم نے محسوس کیا ہے کہ سمجھدار اور چالاک قومیں اپنے اپنے مفادات کے تحت کام کرتی ہیں۔آپ کہیں وہ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارے ساتھ کوئی وابستگی رکھتی ہیں۔ایسا ہرگز نہیں۔ترکی ہمیشہ شام کے معاملات میں مخل رہنا پسند کرتا ہے۔اب بھی جب ملک آگ اور خون میں نہا رہا ہے۔اُسے اپنے طویل کوئی نوسو میٹر لمبے بارڈر کو خاردار بنانے کی مصیبت پڑی ہوئی ہے کہ وہ ایسا کرنے سے مہاجرین کو روک سکے۔بقول ترکی سمگلروں کا ناطقہ بند کر سکے۔پہاڑیوں میں گھری یہ اونچے نیچے راستوں والی سرحد اپنی دیواری تکمیل کے بعد یقیناً شام کو ایک بڑے قید خانے میں بدل دے گی۔شاید میں بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔لیکن کیا کروں لبنان نے بھی اپنے بارڈر بند کر دیئے ہیں۔بہر حال ان ملکوں کے اپنے مسائل بھی بے شمار ہیں۔اب حال ہی میں میں نے ترکی بارڈر پر موجود فوجی (چیک پوائنٹس) یعنی ناکوں سے گزرنے کے لیئے 3000 ڈالر کے عوض جعلی شناخت حاصل کرنے کے بعد دمشق چھوڑ دیا ہے۔میں اب ترکی کے باب السلامہ کیمپ میں ہوں اور واپس جانے کی بجائے کسی اور ملک روانہ ہونے کے لیئے تیار ہوں۔

جو لوگ حکومتی فوج سے لڑے وہ کبھی بھی حکومتی فوج کے ساتھ مفاہمت نہیں کریں گے۔جب ایک دفعہ انہوں نے آزادی کا مزہ چکھ لیا ہے تو وہ ذلت کی طرف کب واپس لوٹیں گے۔اگر تم ایک بار اپنا سر جھکا لو گے تو پھر یہ جُھکا ہی رہے گا۔

☆☆☆

باب نمبر 38:

میرم ال مرسی

میرم ال مرسی شامی نژاد وہ لکھاری ہے جو بہت شہرت یافتہ اور خواتین کے حق میں مؤثر آواز اٹھانے والی شخصیت کے طور پر جانی جاتی ہے۔1962ء میں بحیرہ روم کے ساحلی شہر لاطاکیہ میں ایک کھاتے پیتے سُنی گھرانے میں جنم لینے والی خوبصورت لڑکی جس کے شاعرانہ اور باغیانہ رجحانات کا احساس کہیں اس کے بچپن سے ہی ہو گیا تھا۔

ابھی دمشق یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر کی سٹوڈنٹ تھی کہ عیسائی مسلک کے نوجوان سے محبت اور شادی ہو جانے سے تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔تاہم شادی ناکام ہوگئی کہ مرد کی فیملی بہت معترض تھی۔شامی قانون میں مسلمان عورت کو دوسرے مذاہب میں شادی کی مناہی ہے۔

اب تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑا اور ساتھ ہی رسائل اور اخبارات میں لکھنا شروع کر دیا۔ شاعری کی طرف رجحان کا آغاز تو نوعمری سے ہی ہو گیا تھا۔عربی کے رسائل میں چھپنے بھی لگی تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق یہ بڑی منفرد قسم کی شاعری تھی۔جس کی توقع اُس عمر کی لڑکی سے نہیں کی جاسکتی تھی۔

نوعمری میں محبت اس کے نتیجے میں ملنے والے دکھ،فرانس جانا اور وہاں سکونت اختیار کرنا،دوسری شادی وہیں ایک شامی سے کرنے ،بعدازاں اُس سے بھی علیحدگی اختیار کرنا،شامی شوہر سے جنم دینے والے بیٹے کی جدائی کا غم کہ اُس کا باپ اُسے اپنے ساتھ شام لے گیا تھا۔ اُسے ماں سے ملنے کی ممانعت تھی۔تیسری شادی فرانسیسی سے ہوئی جس سے دو بچے ہوئے۔اب

اس سے بھی علیحدگی ہوگئی ہے۔

یہ سب وہ الیمیے تھے جنہوں نے سوچوں کو متاثر کیا۔

1984ء میں پہلا مجموعہ چھپا۔عنوان تھا Alerted you with a white dove۔مگر شہرت 1997ء میں چھپنے والی A red cherry on a white titled floor سے ملی جو دوسرا مجموعہ کلام تھا۔ یہ نظمیں بے حد منفرد، محبت کی شدت، جنسی خواہشات اور آرٹ سے بھری ہوئی تھیں۔

شامی پبلیشرز نے اِسے چھاپنے سے انکار کردیا۔ تیونس کی وزارت ثقافت نے اُسے چھاپا اوراس نے عربی کے شہرہ آفاق شاعر ایڈونس Adonis کے نام پر رکھا جانے والا ایڈونس ایوارڈ جیتا۔ 2002ء میں یہ ہسپانوی میں چھپی جس نے بعدازاں یورپی لوگوں کی توجہ کھینچی۔ اس کے انگریزی، فرانسیسی ترجمے ہوئے۔

اسی دوران دو کتابیں ''میں تمہیں دیکھتا ہوں'' اور ''ولادہ کی واپسی'' بھی چھپیں۔ میرم ال مرسی کا کہنا ہے کہ اس کی باغی فطرت نے اس کے دل کی دنیا بہت وسیع کر دی تھی۔ یورپ کی زندگی اور مختلف النوع انسانوں کی مڈبھیڑ میں انسانی فطرت اوراس کے رویوں کی اتنی پرتیں انسان پر کھلتی ہیں کہ دل اور ذہن کی دنیا اپنا دامن پھیلا لیتی ہے۔ میرے ذہن کی کھڑکیاں بھی اسی سرعت سے کھلنے لگی تھیں۔ میں نے خود پر دوسرے لوگوں کی دنیاؤں کے دروازے کھولے اور عورت کی حیثیت میں ماں بیوی اور گھر دار عورت کے بےشمار روپ دیکھے اور پھر اپنی شاعری کے آئینے میں دوسروں کو دکھائے۔

خوبصورت شاعرانہ لفظوں سے سجی یہ شاعری کی دنیا مرسی نے جنگ کی قتل وغارت گری سے قبل پیش کی تھی۔ تاہم نقادوں کی رائے کے مطابق اس کی نوعمری کی محبت کے موضوعات کو اگر کہیں دریا برد بھی کر دیا جائے کہ جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ محبت کی دیوی کا

انتقامی ردِّعمل ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

عرب کی روایتی محبت بھری شاعری پر طنزیہ نقطہ چینی، جنس جیسے موضوع پر ایک عورت کا آزادانہ اظہار خیال ہی اس کی شاعری کو ہوا کے ایک تازہ فرحت آگیں جھونکے کی سی کیفیت کی سرشاری دیتا ہے۔ گارڈئین نے اُسے محبت کی شاعرہ کہا ہے جس کے اشعار محبت کی مسرت و درد کی وضاحت کو پوری سچائی سے بیان کرتے ہیں۔

ذرا دیکھئے اُس کی چند چھوٹی چھوٹی نظمیں۔

کتنی بیوقوف کتنی احمق ہوں میں
جب کبھی میرا دل
دستک کی آواز سنتا ہے
یہ اپنے دروازے کھول دیتا ہے

....

خواہش میرے اندر شعلہ بن کر اُبھرتی ہے
اور میری آنکھیں سلگ اٹھتی ہیں
اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے
ایک شیطان کا روپ دھار لیتی ہوں
صرف پیار حاصل کرنے کے لئے

....

میں انتظار کرتی ہوں
لیکن کس کا انتظار
ایک آدمی کا

جو میرے لئے پھول لاتا ہے

اور میٹھے بول

ایک آدمی

جو مجھے دیکھتا ہے گہری نظروں سے

مجھ سے باتیں کرتا ہے

اور میری باتیں سنتا ہے

ایک آدمی جو روتا ہے

میرے لئے

اور مجھے اس پر ترس آتا ہے

پیار آتا ہے

ایک اور انداز دیکھئے۔

مجھے اپنے سارے بل چھل (Lies) دے دو

میں انہیں دھو دوں گی

اپنے دل کی معصومیت کے کٹ بھی اُن پر لگا دوں گی

اور انہیں حقیقت میں ڈھال دوں گی

قرضا ہم راعلا ابیلت ابیضBarefoot Souls اُس کا بے حد اہم چوتھا مجموعہ ہے ۔اس کتاب کا دنیا کی آٹھ بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ 2009ء میں جب اُس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تو اس نے تہلکہ مچادیا۔

مرسی کی محبت بارے حساب کتاب حد درجہ درد انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا فلسفۂ حسیات زندگی کی تہوں میں یوں لپٹا ہوا ہے کہ اُس کی مخالفت ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔

کتاب زیادہ تر عورتوں اور اُن کی نسوانیت کی تصویر کشی کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں جو کہیں پیرس میں رہنے والی شامی عورتوں اور کہیں اُس کے وطن شام کی عورتوں بارے ہیں۔ یہ تلخ شاعری عورتوں کی اُن آوازوں، اُن خواہشوں اور آرزوؤں کو عیاں کرتی ہے جن کا اظہار یہ عورت نہیں کرتی۔ حالات کا نا قابل یقین دباؤ کیسے اُن کی زندگیوں کو متاثر کرتا ہے۔ نسوانی تجربات کو کھُلے ڈُلے انداز میں پیش کرنے کا حوصلہ اور جرأت ہی اُسے منفرد کرتی ہے۔ یہ معلوم اور نامعلوم کے درمیان گفت وشنید کا عمل ہے۔

میری مدد کرو
میرے مہربان شوہر
اس سوارخ کو بند کرنے میں
جو میری چھاتی کی بلندترین دیوار میں
کھلا ہے

....

میرے عقل مند شوہر
مجھے
نسوانیت کی اونچی ایڑیوں پر چڑھنے سے
روکو
کہ وہاں سڑک کے پار
ایک نوجوان میرا انتظار کرتا ہے

....

ذرا اِس نظم کا انداز دیکھئے۔

وہ میرے پاس آیا
ایک مرد کے روپ میں
اور میں نے توجہ نہ دی
اس نے کہا
اپنے بارے باتیں کرو
میں مقدس بھوت ہوں
انکار کرنے سے ڈری
اُسے پیار کرنے دیا
میری کنواری چھاتیاں
اس کی نظروں کی تپش
انہوں نے مجھے ایک خوبصورت عورت میں بدل دیا
تب
اُس نے میرے جسم میں
اپنی روح پھونکی
بادلوں جیسی گرج
اور بجلی جیسی چمک کے ساتھ
اور میں نے اعتماد کیا

....

شاعرہ کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو۔

نمک کے دانوں کی طرح

پہلے وہ چمکے
پھر پگھل گئے
اور اس طرح غائب ہو گئے
وہ مرد
جنہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی

....

اُس کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ خوبصورت شاندار لفظوں، تشبیہوں، استعاروں کے زیورات سے ہرگز سجی سنوری نہیں۔ یہ محبت میں ٹوٹے دلوں کی بات نہیں کرتی اور نہ ہی یہ وصال کی لطف انگیزیوں کے قصے سناتی ہے۔ یہ تو گردوپیش کی روزمرہ زندگی میں کیا ہو رہا ہے کی بات کرتی ہے۔ کہیں جذبات کی شدت کہیں متضاد احساسات، کہیں کہیں بناوٹی جھوٹ، کہیں سچ، ذرا دیکھئے۔

کولی۔ سوزین کی بیٹی۔ عمر گیارہ سال

میں نے اکثر اپنے باپ کو دیکھا ہے
میری ماں کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے
غسل خانے میں لے جاتے ہوئے
میں خود کو چھپا لیتی ہوں
کمرے کی الماری میں
اور
انتظار کرتی ہوں کہ وہ پرسکون ہو جائے
ہماری نشست گاہ کی دیوار پر

مگر مچھ کی تصویر ٹنگی ہے
میں اور میرا بھائی
اسے ''پاپا'' کہتے ہیں

....

ایک اور نظم میں نو سالہ سارہ کو دیکھیں جو ثنا کی بیٹی ہے۔

میرا باپ میری ماں کو کیوں مارتا ہے
وہ نہیں جانتی
اس کی قمیض کو کیسے اچھی طرح استری کرنا ہے
لیکن میں
جب بڑی ہو جاؤں گی
قمیض استری کروں گی
بہت اچھے طریقے سے

....

ایک گھر
بچے
اور ایک بیوی
جو اُسے پیار کرے
یہی وہ چاہتا ہے
اس سے زیادہ کچھ نہیں
ایک دن جب وہ جاگا

اُسے محسوس ہوا
جیسے اُس کی روح بوڑھی ہوگئی ہے
ایک گھر
بچے
اور شوہر جو اُسے پیار کرتا ہو
یہی سب اُس کی تمنا تھی
اس سے زیادہ کچھ نہیں
لیکن ایک دن جب وہ جاگی
اُس نے دیکھا
اُس کی روح نے
ایک کھڑکی کھولی
اور پرواز کر گئی

....

میں نے اپنے باپ کو مار دیا
اس رات یا اگلے دن
مجھے یاد نہیں
میں ایک سوٹ کیس کے ساتھ
جس میں میرے خواب بھرے ہیں
میری فراموش کرنے والی عادت
میری تصویر

جواس کے ساتھ تھی
جب میں بچی تھی
اور جب وہ مجھے اٹھاتا تھا
اپنی کلائیوں میں
ان سب کے ساتھ
میں بھاگ جاتی ہوں
میں نے اپنے باپ کو زندہ دفن کردیا
ایک خوبصورت خول میں
گہرے سمندر میں
لیکن اُس نے مجھے ڈھونڈ لیا
بیڈ کے نیچے چھپتے
خوف اور تنہائی سے کانپتے ہوئے
لرزتے ہوئے

....

دیکھو۔دیکھو
اُن سب زخموں کو دیکھو
جو مجھے ملے ہیں
تمہارے ساتھ جھگڑوں میں
یہ گہرا اور سیاہ زخم
اٹھارہ سال کی عمر میں ملا تھا

پہلی بار جب تم نے مجھے زخمی کیا
خون بہتا تھا اور میں سوچتی تھی
مجھے مر جانا چاہیے
تب میں نے قسم کھائی
کبھی تمہارے ساتھ نہیں جھگڑوں گی
لیکن ہر بار تم آتے
اُس مسکراہٹ کے ساتھ
جو جیسے جنت اور ابدیت کا وعدہ دیتی ہو
اور میں اُس پر یقین کرتی
کسی ہیلمٹ کسی حفاظتی ہتھیار کے بغیر
تم مجھ پر لعن طعن کے گولہ بارود سے جھپٹ پڑتے
اتنی شدت سے زدوکوب کرتے جتنا کر سکتے تھے
ایسے لگتا جیسے
سچ مچ تم چاہتے ہو میں مر جاؤں
مجھے حیرت ہے
کس معجزے نے مجھے زندہ رکھا
یا پھر وہ کون سا معجزہ تھا
میں تمہارے اکھاڑے میں پھر سے گر جاتی ہوں
دیکھو دیکھو
یہ زخم تو ابھی بھی تر و تازہ ہے

اس میں ابھی بھی خون بہہ رہا ہے
دیکھو اس بار انسان بنو
تم دیکھتے ہو
مجھ میں مزید زخم سہنے کی تاب نہیں
کم از کم اِسے تو اچھے انداز میں کرو

....

ذرا اِس نظم کو پڑھیئے ۔ دکھ، یاس اور غم میں لپٹی ۔

میری طرح کی عورتیں
جنہیں بات کرنی نہیں آتی
ایک لفظ ان کے گلوں میں اٹکا رہتا ہے
کانٹے جیسا
جسے وہ نگل لیتی ہیں
میری طرح کی عورتیں
رونے کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں
نہ رکنے والا رونا
جیسے اچانک
کوئی نس کوئی ورید پھٹ جائے
میری جیسی عورتیں
مکّے گھونسے کھاتی ہیں
انہیں لوٹانے کی ہمت نہیں پاتیں

غصّے سے بل کھاتی ہیں
برداشت کرتی ہیں
پنجروں میں بند شیروں کی طرح
عورتیں جو میری طرح
آزادی کے خواب دیکھتی ہیں

یہ چند چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں کسی انفرادی عورت کی آواز ہے، کہیں اجتماعی دکھوں کی۔ ہم اس کی صنف کی اس دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ اُس کی شاعری بڑی دلیری اور بے باکی سے اُن ممنوع اور قابل افسوس رسومات پر نقطہ چینی کرتی ہے جو شام کے معاشرے میں ایک خوفناک عذاب اور ڈراؤنے خواب کی طرح رچی ہوئی ہیں۔ آیئے انوکھی، نرالی، طنز اور تلخی میں ڈوبی نظموں کو دیکھیئے جو آپ کے انتظار میں ہیں۔

بارہ سالہ فاطمہ ایک کونے میں بیٹھی ہے
اب وہ یہ سوچنے لگی ہے
کہ وہ شادی کے قابل ہے
بچہ پیدا کر سکتی ہے
وہ اپنے لئے ایک مرد بھی ڈھونڈ لیتی ہے
لیکن اپنا سونے کا نیکلس بیچتی ہے
کہ اپنا کنوارہ پن خرید سکے
لیکن کیا اس کا بچپن
کیا وہ کبھی واپس لا سکتی ہے اُسے

ایک اور نظم ملاحظہ کریں۔

عورتوں کی نسوانیت کی بربریت پر بھی اس کے ہاں بڑا دکھ بھرا اظہار ملتا ہے۔اعضائے تناسل کے کاٹنے پر اُس کا ردِّعمل۔سینی گال کی ایمنا تا Aminata کی صورت سامنے آتا ہے۔

ایک جیتا جاگتا دکھ

جو خون کی صورت بہتا ہے

اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان

وہ اِسے کاٹ دیتے ہیں

مرسی کا کہنا ہے جنگ سے پہلے میرے اندر جو عورت تھی بس وہ ہی میری کائنات تھی۔ مجھے محرک کرنے میرے ارادوں کو تحریک دینے والی۔اپنے ابتدائی ایام اور اپنے پہلے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ میں بڑی نرم و نازک سی عورت تھی۔اور مجھے اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی تھی۔میرے شوہر کے وکیل نے میری نظموں کے حوالے دیئے جب میری طلاق کا کیس دمشق کی عدالت میں زیرِ سماعت تھا اور جج بھی اس بات سے متفق ہوا کہ میرے خیالات جو میری شاعری کی صورت منعکس ہیں میری شادی کو قائم رکھنے میں معاون نہیں ہو سکتے جو ایک اچھی اور وفادار بیوی کے لئے معاشرہ ضروری خیال کرتا ہے۔تاہم وطن پر مصیبت کے سموں میں وہ کیسے سراپا شام بن گئی۔

فرانس میں رہنے کے باوجود وہ اپنے وطن سے کتنی جڑی ہوئی ہے۔اس کا اظہار اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔خالد ال عیسیٰ اس کا بے حد خوبصورت وجیہہ مسکراتے چہرے والا نرم دل اور نرم خو محبت کا نقیب دوست جو اسد حکومت کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔اس کا ایک اور جرنلسٹ اور فوٹوگرافر دوست بھی اسی بربریت کی بھینٹ چڑھ گیا۔پھر ایک دن اس نے ایک اور کربناک خبر سنی۔اس کا اپنا بیٹا جسے اس نے تیرہ سال سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ شامی شوہر اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔وہ باغیوں کے ساتھ مظاہروں میں شریک ہوگیا۔اُس نے فون کیا اور پوچھا۔

''تم احتجاجیوں سے مل گئے ہو؟''

''ہاں مما''۔اور یقیناً میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔اُس نے اُسے بتایا۔تم میرے پاس ہوتے تو دیکھتے کہ تمہارے اِس فیصلے نے مجھے کتنا مسرور کیا ہے۔خدا شام کو سر بلند کرے۔

حلب کی تباہی اسد کے انتقام کی انتہا تھی۔

اپنے وطن کی تباہی و بربادی پر اُس کے دکھ کا اظہار اس کی نئی شاعری کی کتاب Freedom she comes naked میں ملتا ہے۔اُس کا کہنا ہے۔

''شاعری تو میں کرتی تھی۔مگر ایسی نہیں جیسی اب کی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ شاعری بھی ایک جنگی ہتھیار ہے۔میں متفق نہیں ہوں اس سے۔نظمیں ہتھیار کیوں بنیں۔اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو پھر وہ ہمیں ماضی کی انہیں روایاتی جنگوں میں لے جاتی ہیں۔شاعری کو تو ہتھیاروں کے خلاف ایک توانا ہتھیار ہونا چاہیے۔''

جب Wilfred owen نے "Anthem for Doomed youth" لکھا۔اُس نے جنگ کی دہشت اور جوانوں کو مرتے دیکھنے کی اذیت کو دیکھا اور محسوس کیا تھا۔اسی طرح جب Dylan Thomas نے Hunchback in the park لکھی اُس نے تنہائی کے مارے ایک آدمی کے پارک میں الگ تھلگ رہنے کے نہ بھولنے والے واقعے کو جو کسی عام سے کتے کی طرح رہتا تھا صرف اِس فرق سے کہ اُسے کسی نے زنجیریں نہیں پہنائی تھیں۔اس دُکھ اور معاشرے کی بے حسی کے کرب کو تھامس جیسے شعروں میں پروتا ہے۔بالکل اسی طرح جب میرم ال مرسی لکھتی ہے۔

وطن سے محبت

یہ سزائے موت کے مترادف ہے

اِس میں درد ہے۔دکھ کے اُس احساس کا کرب ہے جو آنسوؤں کا گلا گھونٹتا ہے

''کیاتم نے اُسے دیکھا ہے''
اپنے شیر خوار بچے کو اپنے بازوؤں میں لئے
متکبرانہ قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے
تنا سر اور تنی کمر
بچہ بھی جیسے فخر اور غرور سے سرشار
ایسے جیسے باپ بازوؤں میں لئے ہوئے ہو
اگر صرف وہ زندہ ہی ہوتا

....

شام تو میرے لئے خون رستے زخم جیسا ہے
یہ میری ماں ہے جو بسترِ مرگ پر ہے
یہ میرا وہ بچہ ہے جس کا گلا کٹ گیا ہے
یہ میرا اڑ راؤنا خواب ہے لیکن یہ میری اُمید ہے
میری نیند میری بیداری سبھی اسی کے ساتھ ہے

....

''آزادی جو برہنہ آتی ہے'' اُس کی خوبصورت، شہرہ آفاق نظم ہے۔ ذرا دیکھئے۔

برہنہ آنے والی کا نام ہے
آزادی
شام کے پہاڑوں کی چوٹیوں
اس کے ساحلوں
اس کے مہاجر کیمپوں میں

کہیں
اس کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ جاتے ہیں
اس کے آبلوں سے بھر جاتے ہیں
یخ ٹھنڈ سے
گہرے تشدد سے
لیکن وہ مارچ کرتی چلتی جاتی ہے
وہ اندر آتی ہے
اس کے بچے بازؤوں سے چمٹے ہوئے
کہیں گرتے ہیں جب وہ آگے بڑھتی ہے
وہ مارے جاتے ہیں
وہ چلاّتی ہے۔ بین ڈالتی ہے
لیکن پھر بھی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے
اس کے پاؤں زخمی ہیں
لیکن وہ بڑھتی چلی جاتی ہے
اس کا گلا پھٹ جاتا ہے
لیکن وہ گاتے ہوئے چلتی جاتی ہے
اس کے درخت کٹ جاتے ہیں
اس کے دریاؤں میں سیلاب ہے
خون کا
اس کی بہار کو قتل کر دیا جاتا ہے

اور اب گرمی
نوحہ خوان ہے
لیکن وہ تو مارچ کرتی چلی جاتی ہے

☆☆☆

باب نمبر 39:

نزار قبانی

- شام، دنیائے عرب، بیسوی صدی اور عربی ادب کی ایک بے حد توانا، انقلابی، سیاسی اور رومانوی آواز نزار قبانی۔
- اس کی شاعری کے پہلے مجموعے قالت لي السمر اء نے شام میں زلزلے جیسی کیفیت پیدا کر دی تھی۔
- اے میرے غم زدہ وطن بس ایک پل میں تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں خنجر تھما دیا ہے۔
- دہشت گردی پر اُس کی شہرہ آفاق سیاسی نظم دراصل اُن ملکوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔
- شاعری میں اُس کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بھی اس کا بڑا ٹھوس کام ہے۔

جیسے جیسے ہمارے عراق جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔زکریا کی بے طرح مصروفیات میں میرے لئیے وقت نکلنا مشکل ہوگیا تھا۔ایک دن زچ ہوکر میں نے احمد فاضل سے کہا۔

احمد زکریا سے پوچھووہ مجھےنزار قبانی سے ملائے بغیر دمشق سے بھیجنا چاہتا ہے۔

چلو طے ہوگیا اور جب میں ٹیکسی میں بیٹھی پرانے دمشق میں واقع اس گھر جارہی تھی جہاں جانے کی ہر اس وقت تمنا رہتی تھی جب میں اولڈ دمشق میں کہیں نہ کہیں گھوم پھر رہی ہوتی۔مزے کی بات نہ چاہتے ہوئے بھی دوبار ناخواندہ مہمان بن کر چلی بھی گئی۔آفرین ہے گھر والوں پر کہ انہوں نے خواندہ مہمان سے بھی بڑھ کر پذیرائی دی۔

میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا۔دمشق کا آسمان چمکتے سنہرے دنوں میں بھی مٹیالا سا رہتا ہے۔ہوائیں معمول کی طرح تیز تھیں۔مانوس منظر برق رفتاری سے پیچھے غائب ہورہے تھے۔بے نام سی اداسی میرے اندر درآئی تھی۔علی اور فاطمہ گھر واپس جارہے تھے۔علی کی والدہ کو برین ہیمرج ہوگیا تھا اور وہ اسپتال میں کومے کی حالت میں تھیں۔

میں نے اپنی دل گرفتگی کم کرنے کی کوشش کی اور دھیان اُس عظیم شاعر کی طرف کرتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔

میں نزار قبانی سے کب متعارف ہوئی تھی۔

کسی فلمی منظر کی طرح مجھے وہ شام یاد آئی تھی۔جب میں قاہرہ کی رعمیس سٹریٹ کی ایک بُک شاپ پر بیٹھی ہوئی تھی۔باہر ہواؤں میں بہت تیزی اور خنکی تھی۔قاہرہ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا پڑا تھا اور اندر میں کتابوں کو دیکھنے اور اُن کی پھولا پھرولی میں مگن تھی۔جب میں نے باہر سے کتابوں کے بنڈل اندر آتے دیکھے۔

یہ نجیب محفوظ کی ''ثرثرہ فوق انیل'' اور'' قالت لي السمر اء'' نزار قبانی کی

تھیں۔اول الذکر نوبل انعام یافتہ نثر کی کتاب اور موخر الذکر شاعری کا مجموعہ تھی۔

کتاب ہاتھوں میں لی تو مالک جس نے مجھے پاکستانی جان کر خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا تھا نے اِس پر نظر پڑتے ہی لطف و محبت و سرشاری سے کہا۔

''ارے نزار قبانی کا مجموعہ کلام۔کیا شاعر تھا۔عرب دنیا کا عظیم انقلابی شاعر''۔

میں نے انگریزی ترجمے کا پوچھا۔مالک نے ملازموں سے کہا۔مگر اُن کی جانچ پڑتال کے بعد پتہ چلا کہ ختم ہوگیا ہے۔

بہر حال میری لگن اور کوشش کچھ کام نہ آئی۔کتاب مجھے اسکندریہ سے بھی نہ ملی۔تاہم نیٹ سے "The Brunette told me" شام کے اِس شاعر سے میرا پہلا تعارف روایات سے باغی اور رومانوی شاعر کے طور پر ہوا۔

اب کوئی تین سال بعد جب شام کی سیاحت کیلئے آئی ہوں۔پہلے ہی دن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا گیت لگا کر اور مجھے بتا کر میری بھولی بسری یاد کو تازہ کرنے کا سامان کر دیا۔شام کو زینبیہ واپس جاتے اور آج صبح پرانے دمشق آتے ہوئے شاعر سے مزید متعارف ہوئی۔

اس عظیم شاعر سے تعارف تو احمد فاضل کے توسط سے ہی ہوا تھا۔

میں ہنسی تھی۔ممتا بھری نظریں پہلے احمد فاضل پر ڈالی تھی جو میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھا خاموش نظروں سے دیکھتا تھا۔

پھر نظروں کا رُخ کبرت کی طرف موڑا تھا جو لبوں پر میٹھی سی مسکراہٹ بکھیرے پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔سلسلہ کلام جاری تھا۔

سچی بات ہے کبرت شام میں پندرہ دن کے قیام نے مجھے بتا دیا ہے کہ شاعر دمشق کی ہر ٹیکسی میں گُھسا بیٹھا ہے۔ہر دل میں دھڑک رہا ہے۔ہر لب پر مچل رہا ہے۔ہم جیسے سیاح جنہیں عربی کی پوری سمجھ نہیں پوچھنے پر جانتے ہیں۔اور جب جذبات میں مانوسیت کے رنگ گھلتے ہیں تو

مزہ آتا ہے۔

زکریا محمد کبرت کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

آپ تو داستان گوئی میں بڑی ماہر لگتی ہیں۔

لکھنے والی ہوں نا۔

''ہاں تو سُنیے۔ پیدائش پرانے دمشق میں ہوئی۔ سال 1923ء اور پورا نام نزار توفیق قبانی تھا۔ خاندان کا تعلق ترکی کے مشہور شہر قونیہ سے اور خاندانی نام اک بیک(Ak Biyik) تھا۔ ترکی زبان میں اِس کا مطلب ''کِس کی مونچھ'' ہے۔

دو بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانہ روایات کا اسیر ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی تھا۔ قبانی شامی تھا جبکہ ماں ترکی نژاد۔ چاکلیٹ فیکٹری کا مالک توفیق شام پر فرانسیسی تسلط کے خلاف لڑنے والوں کو نہ صرف اخلاقی بلکہ مالی مدد بھی کرتا تھا۔ یوں حکام کی نظروں میں رہتا تھا۔ اکثر جیل بھی بھیجا جاتا۔

آبائی گھر میتھنہ ال شام میں تھا۔ پرانے دمشق کے ہمسائے میں۔ تعلیم بھی دمشق میں ہی ہوئی۔ قانون کی تعلیم بھی دمشق یونیورسٹی سے حاصل کی جو کہ پہلے سیریا یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی۔

روایت سے بغاوت کا عنصر اس کے خمیر میں بچپن سے ہی تھا۔ اس کا واضح عملی اظہار پندرہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ دس سالہ بڑی بہن ''وصال'' نے خودکشی کر لی تھی کہ وہ جس سے محبت کرتی تھی اُس سے شادی کی اجازت نہیں ملی۔ چھوٹی بہن حیفہ کے گالوں پر زار زار بہتے آنسوؤں کو اُس نے اپنی پوروں سے صاف کیا اور بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں حیفہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔''

اولڈ دمشق کی گلیوں میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اپنے دوستوں

سے کہا تھا۔

''میں اِن رسوم کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔ میں شاعر بنوں گا۔عرب دنیا میں محبت کرنا جرم ہے۔عرب روح ایک بڑے سے قید خانے میں بند ہے میں اسے آزاد کروں گا۔''

اور اُس نے واقعی جو کہا تھا سچ کر دکھایا تھا۔

جب وہ ابھی کالج سٹوڈنٹ تھا اُس نے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور پہلا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔قالت لي السمر اءThe Brunette told me (براؤن بالوں والی گوری عورت نے مجھ سے کہا) یہ رومان اور جنس سے بھری شاعری تھی۔ایسی شاعری جس نے عورت کو اس تنگ نظر معاشرے کی گھٹن زدہ حالت کا احساس دلانے اور اسے اپنے لیے آواز اٹھانے کے حق سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ شام جیسے پرانے قدامت پسند ملک میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یہ شاعری سوچ میں بنیادی تبدیلیوں کی عکاس تھی۔یہاں عورت مرکزی تھیم کے طور پر نمایاں ہوئی تھی۔اس مجموعے نے بہت سارے مسائل پر قلم اٹھایا تھا۔مرد عورت کے تعلقات پر ہر زاویہ اور ہر رخ سے روشنی پڑی۔انسانی اور سماجی رویے، مذہب کی اندھی تقلید اور انسانی سوچ کی آزادی، بے باکی، معاشرے میں مرد اور عورت کا صحت مند تعلق اس کے بڑے موضوع تھے۔ اس مجموعے کی ملک میں شدید مخالفت ہوئی۔ یہ نظم پڑھیئے اور تب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگایئے۔

تمہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں
نہ ہی تمہارے طور طریقوں کے لئے وضاحت کی
کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے
جو ایسا کہتے ہیں وہ دغا باز ہیں

جو سوچتے ہیں
کہ انہوں نے عورت تخلیق کی
اپنی پسلیوں میں ایک سے
عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی
کبھی نہیں
یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے
اُس مچھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے
یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں
خود کو وہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے

ایک اور جگہ دیکھیئے۔ اس کی سوچ کی گہرائی اور تجربے کا کیسا دلآویز اظہار، عورت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کاوش اور عام فہم زبان اور قاری کو اپنے ساتھ لپٹا لینے کا فن۔

بہت گہری محبت مت کر
جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے
کہ دوسرا بھی تمہیں اسی گہرائی سے
پیار کرتا ہے
آج تمہاری محبت کی گہرائی
کل تمہارے زخم کا باعث بنے گی

اُس کی محبت کے جذبات سے لبریز نظموں نے اب سماں باندھ دیا تھا۔

میرا محبوب مجھ سے پوچھتا ہے
کہ میرے اور آسمان کے درمیان کیا فرق ہے

میرے محبوب فرق تو صرف یہی ہے
جب تم ہنستے ہو میں آسمان کو بھول جاتا ہوں

ذرا اِسے سنیے۔

چاند کو دیکھنا مجھے بہت پسند ہے
خاص طور پر تب
جب یہ ہلال کی صورت ہو
کیونکہ میں ہر اُس چیز سے پیار کرتا ہوں
جس کا کوئی مستقبل ہو

قبانی نے عورت کے متعلق جس انداز میں سوچا اور لکھا۔ ایسا پہلے بہت کم لکھا گیا۔ اس کی باغی سوچ نے عورت کو نئے راستوں اور نئی سوچوں سے آگاہ کیا۔ ریت روایت اور رواج میں لپٹی عورت کو اس نے اہمیت دی اور اُسے اس کے ہونے کا بھرپور احساس دلایا۔

اسے میری محبت، اے میرے پیار
اگر تم میرے پاگل پن کے لیول پر آجاتیں
تم اپنے زیورات پھینک دیتیں
اپنے بریسلٹ بیچ دیتیں
اور میری آنکھوں میں سو جاتیں

ایک اور جگہ دیکھیئے۔

کبھی ایک ایسی عورت سے ناطہ نہ توڑو
جو تمہاری بہت سی خامیوں کو جانتی ہے
اور پھر بھی تم سے پیار کرتی ہے

یہاں دیکھیئے اس کا ایک اور منفرد انداز

وہ سب کتابیں لے لو
جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھیں
میری نوٹ بکس بھی لے لو
لے لو میرے سارے چاک
اور سارے قلم بھی لے لو
اور تختۂ سیاہ بھی
بس مجھے ایک نیا لفظ سکھا دو
جو کان کی بالی کی مانند جھولے
میری محبوبہ کے کانوں میں

اُس وقت ملک چونکہ فرانس کے زیرِ تسلط تھا۔ تاہم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں نے اسے بہت سراہا۔ ان سراہنے والوں میں ایک بڑا نام اُس وقت کے وزیرِ تعلیم کا تھا جو ماہرِ تعلیم ہونے کے ساتھ ملک کا ایک بڑا قومی لیڈر بھی تھا۔

چونکہ تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ دمشق کا سوداگر گھرانہ۔ اس لئے نہ مخالفت کی پرواہ تھی اور نہ موافقت نے کوئی اثر ڈالا۔ قانون کی تعلیم مکمل ہونے پر وہ وزارت خارجہ سے منسلک ہو گیا۔

1946ء میں شام فرانس کی غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔ کلچرل اتاشی کے طور پر وہ بیروت، قاہرہ، لندن، استنبول اور میڈرڈ وغیرہ کے ممالک میں سفارت کاری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ڈپلومیٹک کیریئر نے اُس کے ذہنی افق کو بہت وسعت دی۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے شاعر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاعر جس نے

1956ء میں اپنی نظموں میں عام فوجیوں کو سراہا تھا۔ باوجودیکہ مصر جنگ ہارا تھا مگر اس نے جنگ ہارنے کے باوجود جیت لی تھی۔ لوگ خوش تھے۔ ناصر کیلئے محبت کا طوفان تھا۔ مگر 1967ء کی چھ روزہ جنگ شاعر کے اعصاب پر بجلی بن کر گری تھی۔

''ھوامش علی دفتر النکبۃ'' کے عنوان سے اُسنے اپنا کلیجہ نکال کر گلیوں بازاروں میں پھینک دیا تھا۔

اے میرے غم زدہ وطن
بس ایک لمحے میں
تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں
خنجر تھما دیا ہے

ذرا اِن اشعار کے اندر جھانکئیے۔

ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا تھا
مگر
ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے

بیس بندوں پر مشتمل اس طویل نظم جسنے عرب قیادت کے لتّے لیے۔ جمال عبدالناصر کو رگیدا۔ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے لعن طعن کیا۔ خفیہ پولیس، حکومتوں کے کار پردازوں کو صیغہ جمع متکلم ہم یعنی ذات کے دائرے میں گھسیٹتے ہوئے تنقید کی سان پر چڑھایا۔ ذرا دیکھئیے تو

اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی

تو اُسے مت کوسومت

حالات کوبھی لعن طعن مت کرو

خداانہیں فتح دیتاہےجنہیں وہ چاہتاہے

خداکوئی ہتھیارگھڑنے والالوہارتونہیں

یادرکھو

جنگیں کبھی جیتی نہیں جاتی

طاؤس ورباب کے ساتھ

ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کرنہیں آئے

وہ تو چیونٹیوں کی طرح

ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں

ذرااوردیکھئے شاعرنے کیسے کلیجہ چیردیاہے۔

اگراتفاق واتحادکوہم دفن نہ کرچکے ہوتے

اس کےنوخیز بدن میں سنگین نہ اُتارچکے ہوتے

اوراگراتحادباقی ہوتا

تودشمن یوں ہمارےخون سے ہولی نہ کھیلتا

ایک طوفانی نظم عرب دنیامیں ہواؤں کےگھوڑوں پرسوار ہوکر ہرجگہ پہنچی اور ہرزبان پر تھرکی۔حتٰی کہ لوگ حالات حاضرہ پرگفتگوکرتے کرتے اچانک ایک دوسرے سے کہتے۔

''ارےتم نے نظارقبانی کی نظم پڑھی۔''

طوفان اٹھ کھڑاہواتھا۔مصری حکومت نے ان کی تمام کتابوں کو بین کردیاتھا۔وہ تمام نظمیں جنہیں امِ کلثوم نے گائی تھی جلادی گئیں۔جمال عبدالناصرسخت مشتعل تھا۔شاعر کے

مصر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔اردن کا اصرار تھا کہ قبانی پر مقدمہ چلایا جائے۔

کہیں دایاں بازو نکتہ چینی کر رہا تھا کہیں بایاں بازو۔مگر شاعر کو کچھ پرواہ نہیں تھی۔ وہ اگر نشتر چلا رہا تھا تو ساتھ ہی مایوس لوگوں کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔وہ ان کی دلی کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں آس اور امید کی روشنی کا پیغام دے رہا تھا۔وہ جانتا تھا مایوسی بے عملی پیدا کرتی ہے یا بے ادراک تشدد۔اُس کی نظمیں نئی نسل سے مخاطب تھیں۔

ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے
جو جوش و جذبے سے معمور ہو
جو آسمان میں تہلکہ مچانے پر قادر ہو
جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
ہمیں ایک نئی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیوں کو برداشت نہ کرے
جو گھٹنوں کے بل نہ جُھکے
ہمیں جنوں جیسی نسل چاہیے
جو ہماری شکست پر غالب آ سکے

....

عرب بچو
ساون کے قطرو
ہمارے بارے مت پڑھو
ہمارے نقش قدم پر مت چلو
ہم دغاباز اور تماشاگروں کی قوم ہیں

عرب بچو
آنے والے کل کو بتادو
تم ہماری زنجیریں توڑ ڈالو گے

لکھنے پڑھنے کی نصف صدی پر پھیلا اُسکا کام شاعری کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بڑے اہم اور ٹھوس موضاعات پر ہوا، اخباروں میں مضامین کے ساتھ "الحیات" اخبار میں کالم نگاری بھی کی۔ پہلے بیروت میں ذاتی پبلیشنگ ہاؤس قائم کیا۔ پھر اُس کی شاخ لندن میں بھی قائم ہوئی۔ اُس کی زیادہ تر کتابیں یہیں سے چھپیں۔

شاعر نے دوشادیاں کیں۔ پہلی بیوی اس کی کزن تھی زہرہ اک بیک۔ ایک بیٹی حدبہ اور ایک بیٹا توفیق جو صرف بائیس سال کی عمر میں لندن میں ہارٹ اٹیک میں چل بسا بیٹے کی موت پر اُس کی نظم ''دمشق کا چاند'' بھی ایک شاہکار تھی۔

دوسری شادی اُسنے ایک عراقی ٹیچر بلقیس الروی سے کی جو اُسے بغداد کے ایک مشاعرے میں ملی تھی۔ بلقیس سے اُسے بہت محبت تھی۔ نظار قبانی بیروت میں تھا۔ یہ 1881ء کا زمانہ تھا جب لبنان سول وار کی لپیٹ میں تھا۔ وہ تو اخبار لینے کیلئے گھر سے نکلا جب عراقی سفارت خانے پر بم بلاسٹ ہوا۔ سفارت خانے سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اُسکا گھر متاثر ہوا اور بلقیس تو عین موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ یہ اُس کیلئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ بکھر گیا تھا۔ بلقیس سے اُسے بہت پیار تھا۔ اُس کی موت پر اُسنے جو شاعری کی وہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

کہیں اس نے بلقیس کو بابل کی ملکہ سے مخاطب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کہیں نینوا کی لچکیلی شاخ کہا۔ کہیں عراقی بلند ترین پام کے بوٹے سے تشبیہ دی۔ کہیں وہ کوئین اف شیبا تھی، کہیں میری بلونڈ جیسی، کہیں دجلہ کی کوئی نشیلی لہر۔

کہیں اس نے اس کی باوقار چال کو مورنی کہا۔ کہیں افریقی بارہ سنگھے سے ملایا۔

بلقیس تم میرا درد ہو
وہ درد جو نظم لکھتے ہوئے
مجھے اپنے دل اور انگوٹھے میں محسوس ہوتا ہے۔

عرب کی ساری جغرافیائی اور ثقافتی تاریخ سے تشبیہوں اور استعاروں کے اُسنے ڈھیر لگا دیے۔

اپنی محبت اور غم و درد کے سمندر میں اُتر کر اُسنے اپنے قاری کو کِس کِس انداز میں اپنے احساسات میں شریک کیا۔

صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

شکریہ۔ شکریہ
میری بلقیس کو مارنے کا شکریہ
اب جاؤ اور جام نوش کرو

شہید کی قبر کے کنارے پر
میری نظم بھی قتل ہوگئی

مزید دیکھیئے۔

بلقیس
تم کیسے میرے شب و روز
اور میرے خوابوں کو اپنے ساتھ لے گئیں
تم نے سب خوبصورتیوں

اور سب موسموں سے کنارہ کشی کرلی
اوہ میری زندگی، میری جان، میرا پیار
میری نظمیں اور میری آنکھوں کی بصارت
تم نے کیسے مجھے چھوڑ دیا
ایک لفظ کہے بغیر

اس کے جذبات کے بہاؤ کو مثالوں کے احاطے میں لانا کتنا دشوار ہے۔

طوفان اٹھانے والی اُس کی ایک نظم ''کیا آپ مجھے اجازت دیں گے'' ہے۔جس میں شاعر نے سُلجھے ہوئے خوبصورت انداز میں مذہب، ملاّ، خدا، معاشرے پر تنقید کی۔نیم خواندہ مذہبی لوگوں نے کیسے ایک خوبصورت مذہب کو بے روح پریکٹس اور تنگ نظری کا مرقع بنا دیا ہے۔ذرا دیکھیئے شاعر کا انداز۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مطلق العنانی ہے
جہاں دانشوروں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے
جہاں لکھاری بے دین، منکر اور مرتد سمجھے جاتے ہیں
جہاں کتابیں جلائی جاتی ہیں
جہاں سوال کرنا گناہ ہے
جہاں معاشروں میں رواداری اور برداشت نہیں
جہاں طاقت زبان اور سوچ پر پہرے لگاتی ہے
مجھے اجازت دیں
کہ میں اپنے بچوں کو یہ سکھاؤں
خدا نے انسانی روح اور جسم کو قتل سے منع کیا ہے

کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے دھمکائے اور قتل کرے
کیا آپ مجھے اجازت دیں گے
کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں
خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں
ان سے
جو مذہب کے تاجر ہیں
اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے
اور وہ بہت رحیم اور کریم ہے

When they will announce the death of Arabs

اُس کی ایک اور ہنگامہ خیز نظم ہے۔ شاعر کیسے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

پچاس سالوں سے میں عرب ریاستوں کو دیکھ رہا ہوں
وہ بادلوں کی طرح گرجتے ہیں مگر برستے نہیں
وہ جنگیں لڑتے ہیں اور ہارتے ہیں
وہ فہم فراست کی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں
مگر انہیں ہضم نہیں کرتے
میں تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرتا ہوں
کوئی اسامہ ابن المنطق، کوئی عمرؓ اور حمزہؓ
کوئی خالد جو شام کو فتح کرنے جاتا ہو
کوئی معتصم باللہ جو عورتوں کو زیادتی اور آگ سے بچاتا ہو

1990 کی خلیجی جنگ پر اُس نے اپنی مشہور نظم میں کہا

شکست ہوئی

اس کے بعد ایک اور شکست

ہم کوئی جنگ کیسے جیت سکتے ہیں

اگر وہ سب

جنہوں نے فوٹوگرافر کے طور پر کام کیا

اور

پروپیگنڈا منسٹری میں جنگ لڑنی سیکھی

بلقیس کی موت کے بعد اُس نے بیروت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ جنیوا اور پیرس کے درمیان متحرک رہا۔ پھر لندن میں سیٹ ہوگیا۔

گو اُس نے خاصا وقت لندن میں گزارا۔ مگر اس کے باوجود اُسکی طاقتور شاعری اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ عرب دنیا میں سفر کرتی رہی۔ دمشق ہمیشہ اس کی کمزوری رہا۔ ایک طاقتور عنصر کے طور پر اُس کی شاعری میں جھانکتا رہا۔ اپنی محبت اور پیار کا اظہار اُس نے بہت بار کیا۔

"دمشق کی چنبیلی"

اس کی واضح مثال ہے۔

ذرا دیکھیے:

میں دمشق واپس آتا ہوں

بادلوں کی پشت پر سوار ہوکر

دو خوبصورت گھوڑے بھی میرے نیچے ہیں

ایک میرے جذبوں کا

ایک میری شاعری کا

میں ساٹھ سال بعد واپس آیا ہوں

اپنی وفات سے صرف ایک سال قبل اُسنے ''میں دہشت گردی کے ساتھ ہوں''، جیسی شہرہ آفاق طویل سیاسی نظم لکھ کرخود کوامر کرلیا۔نظم میں وہ دہشت گرد انہیں کہتا ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں کوخون میں نہلاتے ہیں۔قبانی جسے دہشت گردی مانتاہے وہ گیارہ ستمبر والی نہیں نہ اس سے مراد فضول قسم کے دھماکےاور قتل ہیں۔

اس لازوال نظم کا ہر مصرع امر ہے۔

ہمیں دہشت گرد کہا جاتا ہے

اگر ہم اسرائیلی بلڈوزوروں تلے آکر

مرنے سے انکار کردیں

اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم وزیادتی کے خلاف آوازاٹھائیں

وہ ہماری دھرتی ملیامیٹ کررہے ہیں

ہماری تاریخ مٹارہے ہیں

ہمارے قرآن، ہماری انجیل کی تذلیل کررہے ہیں

اگر ہمارا گناہ یہ ہے تو

واللہ کتنی خوبصورت ہے دہشت گردی

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

اگر یہ مجھے

روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے

مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آ بسے ہیں
وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہیں
انہوں نے القدس کے مینار
اقصٰی کے دروازے
اور محرابیں چرالی ہیں
میں دہشت گردی کی حمایت جاری رکھوں گا
جب تک نیو ورلڈ آرڈر
امریکہ اور اسرائیل کے درمیان
منقسم رہتا ہے
یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
میں اپنی شاعری سمیت
اپنے لفظوں سمیت
اپنی ساری طاقت کے ساتھ آواز بلند کرتا رہوں گا
جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے
میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

اس نظم نے پوری عرب دنیا کے طول و عرض میں طوفان بر پا کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے بھی شدید غصے کا اظہار کیا۔ مگر شاعر نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

اسکی موت پر جہاں دنیا بھر کے اخبارات نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ وہیں دمشق

کے گلی کوچوں میں اشک بہاتی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ملنے پر کہا تھا۔

''جانتے ہو آج دنیا سے کون رخصت ہوا ہے؟''

وہ شخص جس سے بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے والے چھوٹے اور بزدل لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے تھے۔اُس کی آخری خواہش جسکا اظہار اُسنے اسپتال میں کیا دمشق میں دفن ہونے کی تھی۔

''دمشق میرے لئے رحم مادر کی طرح ہے جس نے مجھے شاعری سکھائی جس نے مجھے تخلیق کار بنایا۔''

میں ملول تھی۔شکرگزار تھی۔عرب مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئی تھی۔شام کی ایک صاحب علم ہستی سے ملی تھی اور اب باب صغیر جانے کی متمنی تھی جہاں وہ عظیم شاعر دفن تھا۔

☆☆☆